قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

فروری 2013، قیمت -/15

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ہندوستانی سینما کے 100 سال

اور اردو

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:15،شمارہ:02،فروری 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحیٔ
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر
ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی
قیمت -/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 4953909)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194- 040

اداریہ
ہماری بات 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو
فلمی زبان 90 فیصد اردو ہے: گلزار — نصرت ظہیر 5

ہندوستانی سنیما کے سو برس
ہندوستانی سنیما کا ارتقا — جواری مل پارکھ، مترجم: ہادی رہبر 8
ہندوستانی سنیما کا عہد زریں — ضیاء السلام، مترجم: وسیم احمد 14
ہندوستانی سنیما اور مسلمان — شمع زیدی، مترجم: منتظر قائمی 17
ہندوستانی سنیما اور اردو ادب — انیس امروہوی 19

ہندوستانی سنیما اور اردو فکشن — رضوان الحق 22
فلمی نغموں میں اردو کلچر — سہیل اختر خان 26
فلمی نغمات کو اردو شاعری کی سوغات — کرشن بھاوک 28
ہندوستانی سنیما اور قومی سیاست — زین شمسی 32
ہندوستانی سنیما: سیکولرزم کا علم بردار — شہباز حسینی 36

مشترکہ تہذیب اور اردو معاشرہ — مظہر حسنین 39
ہندوستانی سنیما اور بچوں کی فلمیں — مہیشور، مترجم: ارشد گوڑ 41

فلمی نغموں کا جادوگر: ساحر لدھیانوی — ثمینہ پروین 43
فلمی موسیقی کا گاڈ فادر: نوشاد علی — محمد نثار 48
گلوکاری میں اداکاری کا حرفِ اوّل — شبنم پروین 54
لتا منگیشکر اور اردو — قاسم انصاری 57

ہندوستانی سنیما کا شہنشاہ — زبیر رضوی 60
ہندوستانی سنیما کی زہرہ جبیں — معصوم زہرا 65
فلم سازی کا اسم اعظم: مغلِ اعظم — نصرت ظہیر 69

ستیہ جیت رے کی معنویت — قاسم خورشید 72
اشتہار ڈی اے وی پی (DAVP) 76

اردو کیمپس
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ 77

عالمی اردو نامہ — ادارہ 81

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 84

ہماری بات

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ ہندوستانی سینما تقسیم وطن کے بعد اردو کی سب سے بڑی نہ سہی لیکن ایک بڑی طاقت ضرور بن گیا ہے اور بات صرف سینما تک ہی نہیں محدود رہی، بلکہ پورے میڈیا میں پھیل چکی ہے۔ اردو زبان فلموں سے آگے بڑھ کر ٹی وی چینلوں، ایف ایم ریڈیو اور ٹویٹر و فیس بک جیسی سوشل میڈیا کی شاخوں پر بھی پھل پھول رہی ہے۔ ہندوستانی سینما نے ایک ایسے وقت میں جنم لیا تھا جب اردو برصغیر کی سب سے بڑی زبان تھی۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی سینما کی مادری زبان اردو ہے اور 1931 میں عالم آرا کی ریلیز کے ساتھ اردو نے ہی ہندوستانی سینما کو بولنا سکھایا تھا۔ تب اردو ہندوستانی سینما کی ترویج کا سہارا بنی تھی۔ لیکن اس عمل کو بیس برس بھی نہ گزرے تھے کہ اردو اپنی زندگی کے سب سے بڑے سانحے سے دوچار ہوئی۔

وطن کی تقسیم نے، مشترکہ تہذیب کے خمیر و ضمیر سے تعمیر ہونے والے، ہندوستانی زبانوں کے اس تاج محل کو شدید نقصان پہنچایا۔ ایک ایسے وقت میں جب ہندوستانیت کی شناخت بن جانے والی اس زبان پر برا وقت آن پڑا تھا، تب ہندوستانی سینما اس کا سب سے بڑا سہارا بن کر سامنے آیا۔ مذہبی بنیاد پر ملک تقسیم ہو گیا مگر ہندوستانی سینما پر اس فرقہ وارانہ تقسیم کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ممبئی کے نگار خانوں میں مذہبی رواداری کی شمعیں پہلے کی ہی طرح روشن رہیں۔ سیکولرزم کے چراغ جلتے رہے۔ ہندوستانی سینما اردو بولتا اور اردو ہی گاتا گنگناتا رہا۔ مرحوم کیفی اعظمی کہا کرتے تھے، ہندوستان میں سیکولرزم کی سب سے بڑی عبادت گاہ ممبئی کی فلم انڈسٹری ہے کیونکہ وہاں مجھ سے کبھی یہ نہیں پوچھا گیا کہ تمھارا مذہب کیا ہے، مسلک کیا ہے، کس فرقے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہاں صرف یہ سوال تھا کہ تم کیا کر سکتے ہو؟

یہ تاریخ کا وہ مرحلہ تھا جب سینما اور اردو کے تعلق کی اس طور پر تجدید ہوئی کہ پہلے اردو نے سینما کو سہارا دیا تھا اور اب سینما اردو کا مددگار بن گیا تھا۔ تھوڑا اور وقت گزرا تو اردو کو مشاعروں اور غزل سرائی کی کمک بھی مل گئی، جن کی بدولت اس زبان کے عوامی رشتے کو از سر نو استحکام نصیب ہوا۔ تب سے اردو کا یہ کارواں آگے ہی بڑھتا رہا ہے۔ فلموں، مشاعروں اور غزل گائیکی کی بدولت آج اردو کے ساتھ تعصب کا وہ ماحول قطعی نہیں ہے جو تقسیم وطن کے وقت محسوس ہوتا تھا۔ مرکزی حکومت ہی نہیں ریاستی حکومتیں بھی اردو کے ادارے قائم کرنے میں آگے آ رہی ہیں۔ آج اردو کروڑوں اربوں روپے کی انٹرٹینمنٹ انڈسٹری کی سب سے طاقتور زبان بن چکی ہے جس میں ہندوستانی سینما اور اس سے وابستہ دیگر سمعی و بصری شعبوں کا ایک بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ آج اگر قوم ہندوستانی سینما کی پہلی صدی مکمل ہونے کا جشن منا رہی ہے تو یہ اردو کی بھی ایک اور صدی کا جشن ہے۔ سینما اور اردو کا یہ گہرا تعلق یک طرفہ نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں کہ اردو، سینما کے آگے دست طلب دراز کیے کھڑی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کے صوتی و جمالیاتی اوصاف، اور ترسیل کی طاقت نے اسے سینما کی زبان بنایا ہے۔ بلکہ زبان کے درجے سے بھی آگے بڑھ کر دیکھیں تو آج اردو ہندوستانی سینما کی ضرورت بنی ہوئی ہے۔

ہندوستانی سینما اور اردو دونوں کے تہذیبی، ثقافتی اور تجارتی تعلق کی اس وسعت و گہرائی نے ہی ہمیں اس موضوع کو 'اردو دنیا' کے زیر نظر شمارے کی کور اسٹوری سے آگے بڑھ کر پورے شمارے کا خاص موضوع بنانے کی تحریک و ترغیب دی ہے۔ شمارے کے لیے لکھوائے گئے مضامین میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ ہندوستانی سینما اور اردو کے تعلق کا ہر پہلو سے جائزہ لیا جائے۔ اس ایک صدی کے ان اہم لوگوں کا ذکر کیا جائے جنھوں نے فلم اور اردو کے رشتے کو مضبوطی عطا کی۔ امید ہے ہماری اس کوشش کو شرف قبولیت حاصل ہوگا۔

آپ کی بات

الحاج شفیق احمد

استاد مدرسہ انوار العلوم رام نگر، ضلع بارہ بنکی، یو پی

سال نو 2013 کی آمد پر اردو دنیا کے مدیر صاحب تمام اراکین کمیٹی نیز قلم کاروں اور قارئین حضرات کو دلی مبارکباد۔ جنوری 2013 کے شمارے میں کور اسٹوری (بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار 1) کے تحت حق اطلاعات قانون بدعنوانی کے خلاف ہتھیار کو پڑھنے کے بعد بہت سی مفید معلومات فراہم ہوئیں۔ (بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار 2) پر عام آدمی کا (آدھار) کرپشن کے خلاف نیا ہتھیار، بہت ہی اچھا لگا۔ اردو دنیا کے تمام مضامین اچھے ہیں۔ خاص طور سے علامہ راشد الخیری کی نظم نگاری اور شاد کی غزل کے دو رنگ پڑھا بہت اچھا لگا۔ اسلامی فنون کی مختلف شکلیں (فن موسیقی) بہت اچھا لکھا گیا ہے۔ منظر کاظمی کی سیرت پاک پر لکھی ہوئی علامتی تحریر سیاہ غلاف اور کالے جرنیل کافی دلچسپ ہے۔ ماہنامہ اردو دنیا کے تمام مضامین دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

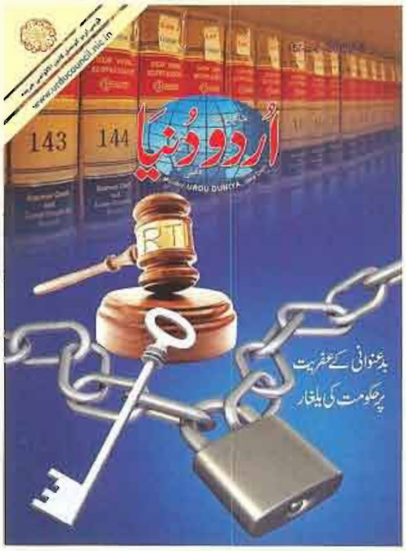

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

دسمبر 2012 'اردو دنیا' کا شمارہ اپنی امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن طباعت و کتابت سے مرصع اور اس سے بڑھ کر فاضلانہ مشمولات کے ساتھ موصول ہوا۔ وارث کرمانی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور شمیم کرہانی پر مضامین بہت زیادہ پسند آئے۔ نظم کی تنقید اور تدریس، اردو نعت گوئی ایک جائزہ، کامیابی میں تعلیم و تربیت کی اہمیت، اردو میں صحافتی ترجمہ نگاری، مولانا ظفر علی خاں بڑے ہی فاضلانہ اور محققانہ مضامین ہیں۔ ان کی اشاعت پر آنجناب اور ان کے لکھنے والے حضرات قابل صد تہنیت ہیں۔ اسی اشاعت میں مکتوبات ماجدی جلد ہفتم کا مبصر نے بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔

'اردو دنیا' جنوری 2013 کا شمارہ سال نو کا انمول اور بہترین تحفہ تھا۔ حسن طباعت اور کتابت کے ساتھ متعدد معلوماتی اور محققانہ مضامین کا گراں قدر مجموعہ تھا۔ ان مضامین کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ان کی اشاعت پر آنجناب اور ان کے فاضل لکھنے والے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ اردو کی ترویج اور ترقی کے ہم سفر: اندر کمار گجرال، ہلال سیوہاروی اور دیویندر اسر کی خدمت میں خراجِ عقیدت، لاشعور میں مادری زبان کی عمل داری، کشمیر کی پہلی اردو نثری تصنیف 'گلدستہ کشمیر' پریم چند کے افسانوں میں احتجاجی رویہ، سیاہ غلاف اور کالے جرنیل، سندیلہ اردو کا اہم ثقافتی مرکز، اور تبصرے۔ مضمون سندیلہ اردو کا اہم ثقافتی مرکز دو نامور استادوں کے ذکر سے خالی ہے۔ یعنی چودھری محمد سلطان جو لکھنؤ یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی میں استاد رہے۔ مسلم یونیورسٹی میں وہ سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ راقم السطور کو لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کی شاگردی اور مسلم یونیورسٹی میں ان کے رفیق کار ہونے کا شرف حاصل رہا۔ دوسرے نامور استاد ڈاکٹر سلام سندیلوی تھے ...

ڈاکٹر حیات افتخار

ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو، قائد ملت کالج، چینئی

'اردو دنیا' کے دسمبر کے شمارے میں آپ نے وارث کرمانی کی وفات پر تاثراتی اور تعزیتی مضمون شائع کر کے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ میں مرحوم کے نثری اسلوب کا مداح رہا ہوں۔ آپ فارسی کے استاد تھے لیکن اردو میں جو گرانقدر تصانیف پیش کی وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ خاص طور پر آپ کی خودنوشت 'گھومتی ندی' آپ کا نثری شاہکار ہے جس پر ناول کا گمان ہوتا ہے۔ اس شمارے کے دیگر مضامین بھی دلچسپ اور مفید ہیں۔

مولانا ضیاء الدین پرواز

انچارج اسٹڈی سینٹر، مدرسہ رحمانیہ گھیواں، ضلع پورنیہ

'اردو دنیا' کا شمارہ دسمبر 2012 کا موصول ہوا، اس شمارے میں ہماری بات کے موضوع پر جناب ڈائرکٹر صاحب نے قارئین کے دل کی بات کہہ ڈالی ہے جو اس شمارے میں 14 واں سالانہ کل ہند اردو کتاب میلہ کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں لائق ستائش وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جناب جتن پرساد نے کہا ہے کہ مدرسے کے بچے بھی تکنیکی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر کے روزگار سے جڑ سکیں گے اس موضوع میں کونسل کے وائس چیئرمین جناب وسیم بریلوی نے بھی قارئین کی خواہش کی تکمیل کی ہے کہ اردو کسی ایک خاص فرقے کی زبان نہیں بلکہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک

201-A گورونانک نگر، گلی نمبر 18-k، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' کا دسمبر کا شمارہ تقریباً نصف پڑھنے کے بعد چند ضروری مدعوں پر رائے زنی کرنے کو مجبور ہوگیا ہوں۔ آپ نے 'حسرت موہانی کی بلند پایہ خودنوشت اُن ہی کی کتاب 'شاہداتِ زنداں' کے انحصار پر جو شائع کی ہے، اس سے مجھ جیسے عام قارئین کے علم و ادراک میں ازحد وبیش قیمت اضافہ کرنے کے موجب آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اگرچہ دیگر تمام مضامین آپ کے حسنِ انتخاب اور مصالحے کے ہی کاملاً حامل ہیں، تاہم زیر عنوان 'نظر ثانی اور فیصلہ (نتیجہ)' مقالے سے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی ہی طرح ٹیپو سلطان سے بھی مربوط و محیط لاانتہا غلط فہمیوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔ 'میسور ریاست کا شیر' کہلانے والے اس عظیم الشان، فرمانروا، سپاہی اور کامیاب منتظم سلطان کی شجاعت، دلیری وغیرہ کے اوصاف کی پختگی کرنے کی وجہ سے یہ مقالہ بھی ایک تاریخی دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اُمید ہے بذات خود آپ اور آپ کے محنتی کارکن آگے مستقبل میں بھی ایسے ہی قابلِ تحقیق و لائقِ تحسین مقالے شائع کر کے قارئین کے دلوں پر ٹیپو سلطان کی مانند حکومت کرتے رہیں گے۔''

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا 480001

'اردو دنیا' دسمبر 2012 کا شمارہ آپ نے بہت خوبصورت شائع کیا ہے، تمام مضامین کا انتخاب بہت خوب ہے، ہر گوشہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ معصوم شرقی سے سالک لکھنوی کی گفتگو دلچسپ رہی۔ سالک لکھنوی ممتاز شاعر، افسانہ نویس، سیاسی، سماجی اور صحافتی افق پر ایک روشن لکیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وارث کرمانی ایسے لہجے کی شگفتگی اور شیرینی کے باعث ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ شمیم کرہانی اپنی تخلیقی صلاحیت اور فنی ریاضت کے تناظر میں کسی سے کم نہیں تھے۔ اردو اور فارسی پر ان کی گہری نظر تھی۔ خواتین محض ایک جنسی وجود نہیں بلکہ وہ ایک مکمل شخصیت کی مالک ہے۔ وہ نسلوں کو پالنے پوسنے اور

تربیت کرنے کا اہم فریضہ انجام دیتی ہیں۔ اپنی شخصیت اور خدمات کے اعتبار سے عورت عظمت واحترام کی حقدار ہے۔ محبان اردو کو اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنا چاہیے۔حکومت کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے اسکیمیں تو بنا سکتی ہے۔لیکن ان پر عملدرآمد لوگوں کو کرنا ہوگا۔

فضل الرحمن

ذاکر حسین سنٹر فار ایجوکیشنل اسٹڈیز، جے این یو

'اردو دنیا کے تازہ شمارہ میں 'بین الاقوامی خواتین کے حقوق کا تجزیاتی مطالعہ' پر جاں نثار معین نے خواتین کے حقوق کو جامع انداز میں پیش کرتے ہوئے سماج میں خواتین کے تئیں ہو رہے غیر منصفانہ وامتیازی سلوک اور حق تلفیوں کی طرف قارئین کی توجہ کے لیے اپنے قلم کو جنبش دی ہے جو قابل ستائش ہے۔ میں ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اس آرٹیکل کی اشاعت کے لیے 'اردو دنیا' کی مکمل ٹیم کو مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ایسے مزید آرٹیکلس پیش رو شماروں میں اپنی جگہ پائیں گے تاکہ معاشرہ مرد وخواتین میں امتیاز کرنے کے بجائے ان کے جائز حقوق دینے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرے گا۔

سید محمد عباس حسین نقوی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، 736، قدیم ملک پیٹ حیدرآباد

شمارہ 'اردو دنیا' دسمبر 2012 ملا جو ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ آپ کا لکھا ہوا اداریہ نہ صرف تحریک دلانے بلکہ روشنی بخش ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات سے مملو ہے۔ تحقیقی مضامین میں جاں نثار معین کا مضمون 'خواتین کا تجزیاتی مطالعہ' کے لیے مضمون نگار جاں نثار معین تعریف کے بجا طور پر مستحق ہیں کیونکہ موصوف نے جامع انداز میں حقوق کی اصطلاحاً صراحت کرتے ہوئے اس کی ابتدا اور انسانی حقوق کے عالمی منشور کے نکات پیش کرتے ہوئے حقوق خواتین کی قبولیت اور ارتقا کے مراحل کو آسمانی صحیفوں کے حوالے سے تقابل کیا ہے جو قابل قدر کام ہے۔

الحاج ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ ضلع نظام آباد

دسمبر 2012 کا 'اردو دنیا' ملنے سے خوشی ہوئی۔ سرورق پر قومی اردو کونسل کا 14 ویں کل ہند اردو کتاب میلے کے تحت تہذیبی سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قومی اردو کونسل نہ صرف زبان وادب کی اشاعت وترویج میں منہمک ہے بلکہ کتاب میلے کے ذریعے اردو کتب وکلچر کی توسیع کا کام کر رہی ہے۔ معصوم شرقی کا سالک لکھنوی سے انٹرویو فکر انگیز ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے مطالعہ ٹیگور کا ایک زاویہ میں ٹیگور کے ادبی تعلیمی نظریات سے اچھی بحث کی ہے۔ شمس بدایونی نے مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی وفیات نگاری پر نئی دریافت کی ہے۔ 'اردو نعت گوئی' میں نعت گوئی کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اردو میں نعت گوئی کب اور کس نے شروع کی تحقیق طلب امر ہے۔ حسرت پر مواد معلوماتی ہیں اور جدت وندرت لیے ہوئے ہیں۔ اردو دنیا اپنے دامن میں عصری اردو ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے اردو کی عصری وبدلتی دنیا کے ساتھ سماجی تعلیمی اور ادبی قدروں کا احساس ہے۔ اردو دنیا ہر اردو خاندان کی ضرورت ہے۔

نومبر 2012 کا 'اردو دنیا' وقت پر ملا۔ سرورق پر جواہر لعل نہرو کی تصویر دیکھی ذہن ماضی کے ہند کی طرف لوٹ گیا۔ نہرو کی خارجہ پالیسی دور رس ودیرپا ہیں اور ہند کو جدید ٹکنالوجی سے ہمکنار کرنا صنعتی انقلاب کی کاوش نہرو کی دین ہے۔ ساتھ ہی اردو زبان کے وہ ہمدرد تھے۔ مجاز کی ادبی کاوش اور غزل کے حوالے سے ان کے فکر وفن پر عمدہ مضمون ہے۔ اسی طرح دیگر ترقی پسند شعرا وادیبوں پر مضامین ہونے چاہیے۔ اردو تہذیب اور پنڈت نہرو مضمون فکر انگیز ہے۔ اس میں ایسے ادیب کو شامل کیا گیا ہے جو گوشہ گمنامی میں تھے نئی نسل ان کی شاعری وفن سے آگہی حاصل کرے گی۔ دیگر ذیلی عنوانات کے تحت جو علم وادب شائع ہوا ہے وہ قابل قدر اور ایک اثاثہ سے کم نہیں لیکن کیا کریں یہ اردو کی بدبختی نہیں تو پھر کیا ہے۔ کونسل کی جانب سے اتنا اچھا ماہ نامہ وہ بھی ادب کے ساتھ مختلف علوم وفنون کو اپنے دامن میں سمٹا ہوا ہے اور عصری دنیا کا مواد گھر بیٹھے مل جاتا ہے ایسے رسالے کو ہندوستان میں ہر اردو خاندان کے گھر میں ہونا چاہیے۔

محمد عبدالعزیز سہیل

402075 لطیف بازار، نظام آباد

اردو دنیا دسمبر 2012 کا شمارہ موصول ہوا سرورق پر اردو کونسل کے 14 ویں کل ہند اردو کتاب میلے کی تصاویر سے اندازہ ہوا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں اردو کتاب میلے میں اردو شائقین کی کثیر تعداد میں شرکت نے یہ ثابت کر دیا کہ آج بھی کتابوں کو انٹرنیٹ پر فوقیت حاصل ہے۔ اس شمارے کے تقریباً سبھی مضامین اچھے لگے۔ سالک لکھنوی کا انٹرویو کافی معلوماتی رہا کتاب میلے کے متعلق قاسم انصاری کے مضمون سے ایک طرف تو اس میلے کی تفصیلات کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کارکردگی سے واقفیت ملی۔ گوشہ مشاہیر ادب کے عنوان سے رئیس الغزل مولانا حسرت موہانی پر موجود تحریروں سے ان کی زندگی کے حالات اور مشقت سے متعلق نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ محمد عامر بدر کا مضمون اردو میں صحافتی ترجمہ نگاری سے صحافتی میدان میں ترجمہ نگاری کی اہمیت اور موجودہ دور میں ہو رہی تبدیلیوں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ کیریئر گائیڈنس کے تحت کامیابی میں تعلیم وتربیت کی اہمیت مضمون اچھا ہے ساتھ ہی روزگار کے حصول کے لیے پیشہ ورانہ کورس کا بھی تعارف کسی شمارے میں شائع کیا جائے تو ہماری رہنمائی ہوگی۔

معین الدین شمسی

اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ (جھارکھنڈ)

دسمبر 2012 کے شمارے میں سارے مضامین اچھے، معلوماتی اور پڑھنے کے لائق ہیں۔ سالک لکھنوی سے معصوم شرقی کی بات چیت اچھی لگی۔ اردو دنیا کی خبریں کے تحت 'وارث کرمانی' صدر شعبۂ فارسی MUA کا انتقال قابل صد تشویش ہے۔ واقعی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کا قائم کردہ ایسا فعال ادارہ ہے جو اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ملکی سطح پر اپنی خدمت پیش کر رہا ہے۔ اردو سے سچی محبت رکھنے والے یہ عام قارئین کی مشکلات کو مدنظر رکھ کر NCPUL نے ترقی اردو بیورو کے زمانے سے ہی اردو کی معیاری کتابیں از حد کم قیمت پر چھاپنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

عشرت ظہیر

'ملاز' نئی کالونی، نیا کریم گنج، گیا (بہار)

'اردو دنیا' نومبر 2012 موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی زبان وادب، تہذیب وثقافت، صحت، سائنس اور فلم جیسے مختلف النوع موضوعات پر بھرپور مضامین سے مزین ہے۔ خاص طور پر پنڈت جواہر لال نہرو، وحشت کلکتوی اور سجاد ظہیر سے متعلق حصہ مجھے پر کشش معلوم ہوا۔

نصرت ظہیر

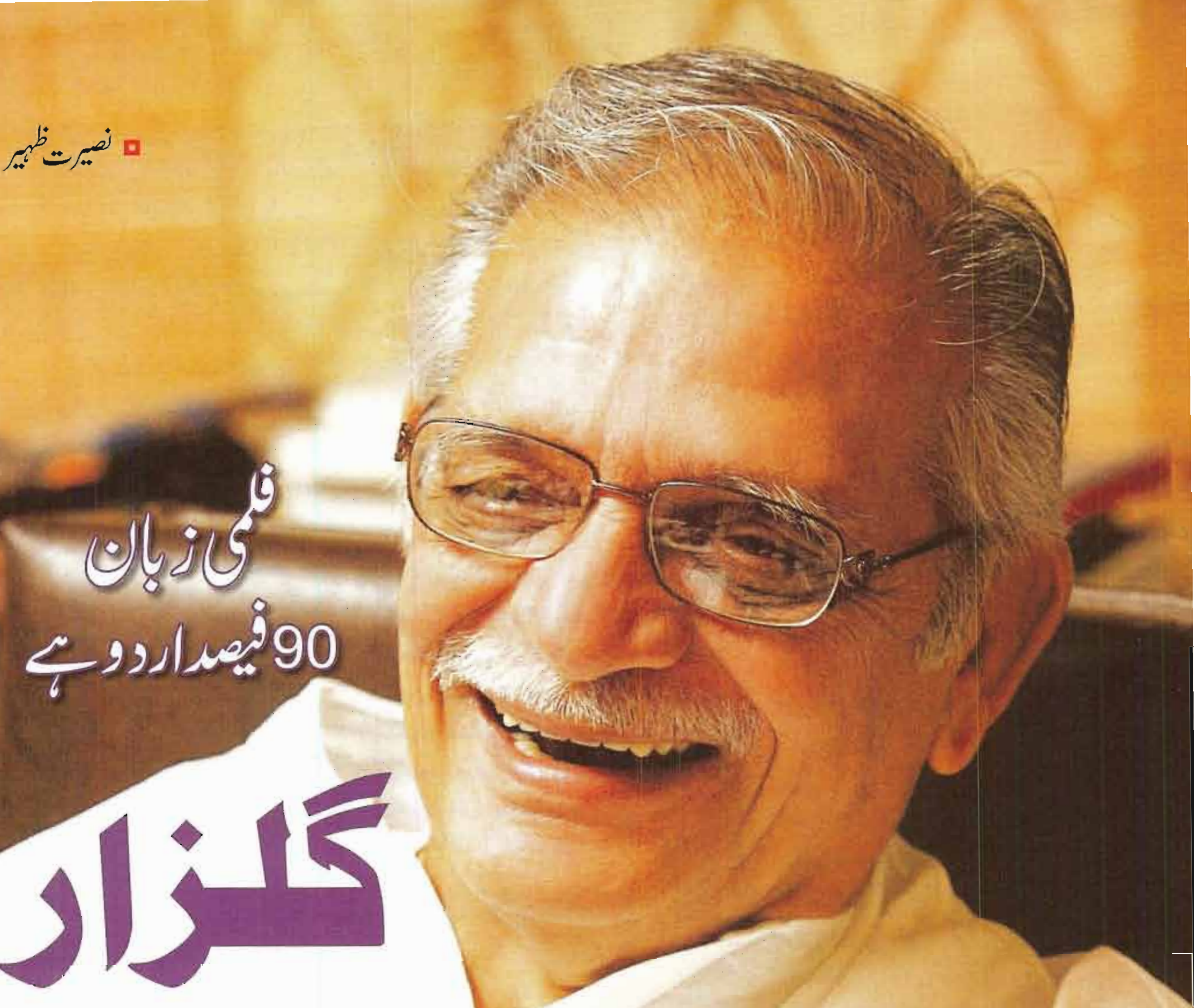

فلمی زبان 90 فیصد اردو ہے

گلزار

اردو زبان اور گلزار کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ اردو زبان و ادب نے ہندوستانی سنیما کی اس ہستی کو معیار و مقدار کی بلندیوں پر پہنچایا اور خود گلزار کی بدولت اردو وہاں وہاں پہنچی ہے جہاں تک اس کی رسائی تو تھی لیکن لوگوں نے راستے نہیں بننے دیے، اور ان مقامات میں کرۂ ارض کا سب سے بڑا فلمی اعزاز تسلیم کیا جانے والا آسکر ایوارڈ بھی شامل ہے، جو ان کے تخلیق کردہ نغمے 'جئے ہو' کے لیے دیا گیا۔ گلزار شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، فلمی ہدایت کار ہیں، اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ مکالمے لکھتے ہیں، بچوں کا ادب تخلیق کرتے ہیں۔ اعلیٰ پائے کے مترجم ہیں کئی ہندوستانی زبانوں کی شاعری کا اردو میں ترجمہ کیا ہے... اس کے علاوہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور فلم فیئر ایوارڈ سے لے کر آسکر تک کا سفر طے کر چکے ہیں... یہ اور بات ہے کہ اس ایوارڈ کو لینے کے لیے صرف اس بنا پر امریکہ نہیں گئے کہ وہاں تقریب میں سیاہ کوٹ پہننے کی شرط تھی اور گلزار صاحب کو آج تک سفید کرتے پاجامے کے علاوہ لوگوں نے کسی اور لباس میں نہیں دیکھا۔ 'ہندوستانی سنیما اور اردو' کے تعلق سے بات کرنے کے لیے گلزار صاحب نے خصوصی درخواست پر اپنی مصروفیات سے جو وقت نکال کر 'اردو دنیا' کو دیا، اس میں نصرت ظہیر سے ہونے والی ان کی گفتگو کے اقتباسات پیش خدمت ہیں: ادارہ

نصرت ظہیر: گلزار صاحب، جہاں تک سنیما کی دنیا کا سوال ہے آپ نے کئی زبانوں مثلاً ہندی، پنجابی، اور بنگلہ میں بھی کام کیا ہے لیکن ادب میں اردو ہی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ ان تمام زبانوں کا جان کار ہونے کے باوجود آپ نے اردو ہی کو کیوں اپنایا؟

گلزار: اس لیے کہ میری تعلیم اردو میں ہوئی ہے۔ بچپن سے اردو سیکھی ہے اور تقسیم سے قبل یہی روایت تھی۔ اردو سب کو پڑھائی جاتی تھی۔ نارتھ میں خاص طور سے پنجاب میں، خاص طور سے مردوں کی پڑھائی اردو میں ہی ہوتی تھی، مذہبی لٹریچر کو پڑھنے کے لیے پنجابی یا ہندی سیکھ لی جاتی تھی۔ وہ عورتیں بھی جو اسکولوں میں پڑھی ہیں ان کا بھی ذریعہ تعلیم اردو ہی تھی، ورنہ عورتوں کی تعلیم تو اتنی پاپولر نہیں تھی۔ آج بھی وہی جنریشن اردو پڑھ رہی ہے جو کہ ہمارے بزرگ ہیں، پنجابی ہیں وہ اب بھی سارے کے سارے اردو میں ہی پڑھتے لکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ روایت تھی پنجاب کی۔ تقسیم کے بعد جب دو حصے ہو گئے تو تھوڑی سی تبدیلی آنا شروع ہوئی، ورنہ پنجابی بھی اردو رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، اردو رسم الخط کہیے یا فارسی رسم الخط

جو بھی کہہ لیجیے۔ اس کو شہ مکھی کہا جاتا تھا، اور یہ جو گرمکھی ہے پنجابی لکھنے کے لیے وہ صرف ہندوستان میں ہے۔ پاکستان میں پنجابی اب بھی شہ مکھی میں لکھی جاتی ہے۔

ن ظ: شہ مکھی، یعنی شاہ یا بادشاہ کا رسم الخط۔ آپ خود بھی اسی شہ مکھی یا فارسی رسم الخط میں لکھتے ہیں اور بے حد خوب صورت لکھتے ہیں...

گلزار: بھئی ہم نے تختی پر لکھا ہے۔ اردو اس زمانے کی جو روایت تھی اسی طرح سیکھی۔ سرکنڈے کا قلم ہوا کرتا تھا، تلک بھی کبھی کہتے تھے اسے۔ قلم گڑھنا سیکھ لیا تھا تو اس کے بعد لکھ کر مولوی یا ماسٹر کو دکھایا کرتے تھے تو وہ الفاظ کے صحیح اینگل بتا دیا کرتے تھے۔ تختیاں پوتتے تھے۔ اسے ہم گاچنی مٹی کہتے ہیں اور ملتانی مٹی بھی کہتے تھے۔

ن ظ: یہ اردو کی تعلیم فلموں میں بھی کام آئی؟

گلزار: جی ہاں چونکہ زبان اردو ہے لیکن لکھنے کی سطح پر ہم اسے دیوناگری میں بھی لکھتے تھے اور رومن میں بھی۔ کیونکہ ہماری فلموں میں بڑی بڑی ہیروئنیں ساؤتھ سے آئی تھیں۔ وجینتی مالا جی، وحیدہ رحمان جی اور دوسری بہت ساری ہیروئنیں تھیں ہماری، تو کسی کی زبان تیلگو ہے کسی کی ملیالم ہے۔ جیسے وجینتی مالا تمل میں لکھتی تھیں۔ اپنی اردو کو وہ تمل یا رومن میں لکھ لیتی تھیں لیکن زبان جو وہ بولتی تھیں وہ تو اردو ہے۔ دراصل فلموں کی اردو میں اور زبان کے پڑھنے میں دھیرے دھیرے فرق آیا، حالانکہ آل انڈیا ریڈیو پر اور دوسرے سرکاری کاموں میں ہندی بڑی شدھ کردی گئی اور اردو کی طرف بڑی فارسیت آ گئی۔ اس میں دوسری طرف دیکھیں یعنی پاکستان کی طرف تو وہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ لیکن یہ ضد چلی نہیں سرکاروں کی۔ جو حکومت ضد کرتی رہی کہ اب ہم ہندی اس طرح سے بولیں گے اب ہم اس طرح سے اردو بولیں گے وہ چلی کسی طرح سے نہیں۔ Fainally جو اردو ہم بولتے تھے اسی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آئی۔ پاکستان میں تھوڑی فارسیت بھی نہیں کہوں گا بلکہ تھوڑا سا پنجابی تھوڑا سا پشتو کا اثر ہوگیا۔ اور اس طرف ہندی اور بھوجپوری اور دوسری زبانوں کا اثر رہ گیا۔ کیونکہ اردو ہی میں تبدیلی آئی۔ آج بھی فلموں میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ 80 فیصد اردو ہوتی ہے بلکہ میں 80 سے زیادہ سمجھتا ہوں اسے 90 فیصد کہیے۔ ہندی کے کچھ لفظ اب شامل ہوگئے ہیں ورنہ اسم، مصدر، فعل وغیرہ سب اردو کے ہیں۔ ہاں ایک نقصان اردو کا یہ ہوا ہے کہ تلفظ خراب ہوگیا ہے۔ تلفظ خراب ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندی والوں کو اردو بولنے، سیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ اگر دیوناگری میں اردو سکھا دی جائے تو لہجہ اور تلفظ خراب نہیں ہوگا اور تین چار نقطے والے الفاظ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب کہ امیر مینائی سے لے کر ناسخ تک سب کے سب ہندی میں موجود ہیں سب دیوناگری میں لکھے ہوئے مل جاتے ہیں۔ لیکن دیوناگری میں تلفظ کی کمی رہ گئی جس سے اردو کا نقصان ہوا ہے۔ ہندی والوں کو اردو بولنے کا شوق بہت ہے لیکن دیوناگری میں اردو لکھنے کا جو فارمولہ نقطوں کے ساتھ سردار جعفری صاحب نے بنایا تھا اس پر وہ عمل نہیں کرتے۔ گ کو زبردستی غین بول دیتے ہیں، جہاز کو زہاز۔ یہ ہماری اردو والوں کی بھی کوتاہی ہے کہ ہم نے ان کے تلفظ کو درست رکھنے کے لیے اصلاحی کام نہیں کیا۔

آج بھی فلموں میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ 80 فیصد اردو ہوتی ہے بلکہ میں 80 سے زیادہ سمجھتا ہوں اسے 90 فیصد کہیے۔ ہندی کے کچھ لفظ اب شامل ہوگئے ہیں ورنہ اسم، مصدر، فعل وغیرہ سب اردو کے ہیں۔ ہاں ایک نقصان اردو کا یہ ہوا ہے کہ تلفظ خراب ہوگیا ہے۔

ن ظ: اردو اور ہندوستانی سنیما کا تعلق اسی وقت سے ہے جب فلموں نے بولنا شروع کیا۔ اردو زبان وادب اور ہندوستانی سنیما کے اس رشتے کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

گلزار: آپ بہت صحیح لفظ استعمال کررہے ہیں۔ یہ جو آپ ہندی سنیما نہ کہہ کر ہندوستانی سنیما کہہ رہے ہیں یہ بات گاندھی جی نے بھی 47 کے زمانے میں کہی تھی۔ اس زبان کا نام ہندوستانی کردو کیونکہ ہم یہی زبان بولتے ہیں۔ نہرو نے بھی کہا تھا کہ اردو میری مادری زبان ہے میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔ وہ لکھتے دیوناگری میں تھے۔ آج بھی شبانہ اعظمی، نصیرالدین شاہ دیوناگری میں پڑھتے لکھتے ہیں لیکن ان کی مادری زبان اردو ہی ہے۔ اردو بہت آرٹسٹک زبان ہے اور اردو کی اسکرپٹ بہت خوبصورت ہے۔ زبان بچالو گے تو اسکرپٹ بھی بچ جائے گا۔ بنگلہ زبان کا شوق تھا تو میں نے بنگلہ سیکھ لی اور مجھے ان کی اسکرپٹ سیکھنی پڑی۔ اسی طرح اردو زبان کا شوق ہے تو آپ اردو کے ساتھ ساتھ اُس کا اسکرپٹ بھی سیکھ لیں گے۔ پنجابی اسکرپٹ کو لے لیں، جیسے شہ مکھی اور گرمکھی ہیں۔ میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اردو کا رسم الخط چھوڑ دیا جائے، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دیوناگری میں سیکھیں یا اردو میں سیکھیں وہ اردو ہی رہے گی۔ انگریزی میں Z ہے۔ ہندی میں ج کے نیچے نقطہ لگا دو زیڈ بن جائے گا۔ اردو رسم الخط سیکھنے والوں کے لیے ایک جیسی آواز دینے والے حروف مثلاً ذ، ز، ض، ظ اور س، ث، ص وغیرہ خاصی مشکل ڈالتے ہیں۔ اسکالرس کو چاہیے کہ اس مشکل کو تھوڑا اسہل کردیں۔ تھوڑا سا ارادہ اور محنت کی جائے تو کام کو آسان کیا جاسکتا ہے۔ اب میں تو چونکہ اسکالر نہیں ہوں اس لیے یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کام کیسے ہو۔

ن ظ: ہندوستان کی تقسیم کے بعد اردو کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ ان حالات میں ہندوستانی سنیما نے اردو کو زندہ رکھنے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟

گلزار: بہت بڑا کردار رہا ہے۔ اردو ہی تھی جس نے

گلزار کے کوائف

فلمی نام: گلزار

پورا نام: سمپورن سنگھ کالرا

پیدائش: 18 اگست 1929، دینا، جہلم ضلع، پنجاب برٹش انڈیا (اس وقت یہ حصہ پاکستان میں ہے۔)

والد: مکھان سنگھ کالرا

والدہ: سوجان کور

اہلیہ: راکھی گلزار (مشہور فلم اداکارہ)

اولاد: میگھنا گلزار

ذریعہ معاش: ابتدائی زندگی میں بحیثیت موٹر میکینک تھے۔ بعد کے دنوں میں شاعری اور فلمی دنیا کی طرف ان کا رجحان بڑھا۔

بطور ہدایت کار: گلزار نے بطور ہدایت اجازت، اَنکر، دل سے، معصوم، آندھی، موسم اور مجلس جیسی فلمیں بنائیں۔ ان کا ٹیلی ڈرامہ غالب ایک کلاسیک کی حیثیت رکھتا ہے۔

تصانیف: چاند پکھراج کا، رات پشیمانی کی، پندرہ پانچ پچھتر، دھواں اور راوی پار وغیرہ۔

نغمہ نگار: بطور نغمہ نگار انھوں نے درجنوں فلموں کے لیے نغمے لکھے۔

انعام و اعزاز: • پدم بھوشن ایوارڈ (2004)، • اندرا گاندھی ایوارڈ برائے قومی یکجہتی (2012) • ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (2002) • بہترین کہانی کار کے لیے 'نیشنل فلم ایوارڈ' (1972)، فلم 'کوشش' • بہترین مکالمہ نگار کے لیے 'فلم فیئر ایوارڈ' (1972) فلم 'آنند' • بہترین ہدایت کار کے لیے 'فلم فیئر ایوارڈ' (1974) فلم 'کوشش'، • بہترین نغمہ نگار کے لیے 'فلم فیئر ایوارڈ' 1980، فلم 'آنے والا پل'

ہندوستانی سنیما کو تقویت دی ہے۔ یہ وہی زبان تھی جو تقسیم سے پہلے رائج تھی لیکن ہم نے اسے ہندو بنا دیا اور سرکاری طور پر وہ ہندی ہوگئی۔ سنسر بورڈ کے سرٹیفکیٹ میں اسے ہندی ہی لکھا جاتا ہے۔

ن ظ: بہت سی اردو فلموں مثلاً مغل اعظم اور امراؤ جان کو ہندی سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ مگر کئی فلموں کو اردو کا سرٹیفکیٹ بھی ملا مثلاً شطرنج کے کھلاڑی، بہو بیگم اور ناصر حسین صاحب کی اکثر فلمیں۔ یہ زبان کا سرٹیفکیٹ کس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

گلزار: یہ پروڈیوسر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ آپ اپلائی کریں گے تو ضرور اردو کا سرٹیفکیٹ ملے گا۔ یہ پروڈیوسر کے ہاتھ میں ہے۔ سلیم عارفی اگر ایک پلے کرتے ہیں اور اگر وہ اُس کا نام اردو کر دیں تو ناظرین کم ہوجائیں گے کیونکہ عام لوگ اردو کو مشکل زبان سمجھتے ہیں۔ اس لیے اسے ہندی کر دیتے ہیں تاکہ زیادہ لوگ آسکیں۔

ن ظ: آپ پہلے گیت کار ہیں جس نے ایک فلمی گیت لکھتے ہوئے محبوب کے لیے بڑا پیارا مصرع لکھا تھا، ہے جس کی زبان اردو کی طرح، اس سے پہلے کسی نے اردو کے لفظ کو اس طرح استعمال کیا اور نہ ہی بعد میں کیا۔

گلزار: مجھے محبت ہے اردو زبان سے۔ میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں۔ ابھی کل سنیچر کے دن اسکرین ایوارڈ کی تقریب تھی۔ تو یش چوپڑا جی کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ میرے ذمے تھا اور مجھے ان کی اہلیہ کو پیش کرنا تھا۔ میں نے یش چوپڑا کے بارے میں یہی بات کی کہ ان کے بہت سارے پہلو ہیں۔ لیکن میری نظر میں جو ہے وہ یہ کہ وہ اردو دوست تھے۔ انھوں نے اپنی فلموں میں اردو زبان بہت اچھی طرح استعمال کی ہے۔ ان کی فلموں میں اردو کی خوشبو رہا کرتی تھی انھوں نے جن کے ساتھ کام کیا ہے وہ سارے اردو کے بڑے شاعر تھے۔ ساحر صاحب نے بہت سارے گانے لکھے پھر جاوید صاحب نے لکھے۔ یش چوپڑا کے جانے سے ایک اردو دوست چلا گیا۔ اب پتہ نہیں لوگوں نے اس بات کو کیسے لیا مگر میرے لیے یہ دل کی بات تھی۔

ن ظ: آپ ایک وسیلہ بنے اردو زبان کو آسکر تک پہنچایا لیکن آپ وہاں ایوارڈ لینے نہیں گئے۔

گلزار: میرے پاس کالا کوٹ نہیں تھا اس لیے نہیں جاسکا کیونکہ وہاں کا formal ڈریس یہی ہے۔

ن ظ: ہاں یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آپ کوٹ پتلون نہیں پہنتے، لیکن منتظمین نے مشہور یہی کیا تھا کہ ٹینس کھیلتے وقت آپ کے کندھے میں کچھ تکلیف ہے (اس پر گلزار صاحب بس ہنستے رہے)... گلزار صاحب اردو کا خاص تعلق اردو کے گیتوں سے یا مکالموں سے جڑا رہا ہے۔

گلزار اپنی بیٹی میگھنا کے ساتھ

گیتوں میں مکالموں میں ہدایت کاری میں آپ سپر اسٹار ہیں اس دور کے۔ لہٰذا لوگ آپ کی اپنی پسند بھی جاننا چاہیں گے۔ آپ ہندوستانی سنیما کی پہلی صدی کا سب سے بڑا نغمہ نگار کسے مانتے ہیں۔

اردو عوام کی زبان ہے اور وہی رہے گی۔ ایسے بھی دور آئے تھے جب ہندی کو تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود زبان وہی رہی اور وہ اردو ہے۔ اردو بولی جارہی ہے اور لکھی جارہی ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں اردو کے پبلی کیشن دیکھیں کتنے بڑھ گئے ہیں۔ اردو کے رسالے بڑھ گئے ہیں۔ اردو کے تمام اخبارات کمپیوٹرائزڈ ہوگئے ہیں۔ لیکن ہم اردو والوں کو نوحہ خوانی کا بڑا شوق ہے۔ جو چلا گیا اسے روتے رہتے ہیں۔ جو کچھ حاصل کرسکتے ہیں اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ سچ یہ ہے کہ اردو ترقی پر ہے۔ اردو بڑھ رہی ہے۔

گلزار: میری نظر میں ساحر سب سے بڑے گیت کار ہیں اور ان کے بعد شیلندر۔ شیلندر کا جواب نہیں وہ کہانی کے مطابق گیت لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ کردار کی زبان نبھاتے ہوئے انھوں نے بہترین نغمے تخلیق کیے ہیں۔

ن ظ: مکالموں میں آپ کسے پسند کرتے ہیں:

گلزار: تالیاں بجنے سے مکالمے اچھے نہیں ہوتے۔ مکالمہ نگاری وہ اچھی ہوتی ہے جہاں وہ کردار واقعات اور مقام کے مطابق مکالمے لکھے۔ پرکاش جھا کی فلموں کو دیکھیں جہاں بہار زندہ نظر آتا ہے، وشال بھاردواج کی فلموں کے مکالموں کو دیکھیں وہ کردار کے ساتھ جاتے ہیں۔ میرے استادوں میں راجندر سنگھ بیدی بہت بڑے مکالمہ نگار تھے۔ بیدی کے یہاں اسٹڈی کر کے دیکھیں ان کی زبان کردار کے ساتھ بدل جاتی تھی۔

ن ظ: آگے آپ کیا دیکھتے ہیں کیا اردو زبان اور ہندوستانی سنیما کا رشتہ یوں ہی بنا رہے گا۔ یہ زبان سنیما سے کچھ اور فائدہ اٹھا سکے گی؟

گلزار: فائدہ کیا اٹھانا ہم کوئی ایکسپرٹ تھوڑے ہیں۔ اردو عوام کی زبان ہے اور وہی رہے گی۔ ایسے بھی دور آئے تھے جب ہندی کو تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود زبان وہی رہی اور وہ اردو ہے۔ اردو بولی جارہی ہے اور لکھی جارہی ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں اردو کے پبلی کیشن دیکھیں کتنے بڑھ گئے ہیں۔ اردو کے رسالے بڑھ گئے ہیں۔ اردو کے تمام اخبارات کمپیوٹرائزڈ ہوگئے ہیں۔ لیکن ہم اردو والوں کو نوحہ خوانی کا بڑا شوق ہے۔ جو چلا گیا اسے روتے رہتے ہیں۔ جو کچھ حاصل کر سکتے ہیں اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ سچ یہ ہے کہ اردو ترقی پر ہے۔ اردو بڑھ رہی ہے۔

ن ظ: سو سال کی سب سے اچھی اور بڑی فلمیں کون سی ہیں؟

گلزار: بات اگر ہندوستانی فلموں کی کر رہے ہیں تو 26 چورنگی لین اور پاتھیر پنچالی۔ میرے خیال سے ابھی تک کی سب سے بہترین فلمیں ہیں۔ شطرنج کے کھلاڑی بھی بہت اچھی تھی۔ گرم ہوا بھی قابل ذکر ہے جو تقسیم پر سب سے اچھی فلم ہے۔ گرم ہوا کو میں بہت اونچے پائے کی فلم سمجھتا ہوں۔

ن ظ: بچوں کے لیے آپ نے فلم کتاب بنائی ہے۔ آپ نے بہت سارے کام کیے ہیں۔ بچوں کی کہانیاں لکھی ہیں بچوں کے ادب میں اس قدر دلچسپی کی وجہ؟

گلزار: وجہ کیا، بچوں میں دلچسپی ہے بس اور میں ان کے لیے لکھ رہا ہوں۔ بنگلہ، مراٹھی اور ملیالم کے علاوہ کسی دوسری زبان میں بچوں کے لیے ادب کم ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی بچوں کے ادب کا فقدان ہے۔ بنگلہ میں دیکھیں کس طرح کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ بچوں کا ادب لکھنا عام ادب لکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔

ن ظ: گلزار صاحب، باتیں آپ سے اور بھی کرنی تھیں لیکن اس گفتگو کو چونکہ ہم نے ہندوستانی سنیما اور اردو کے تعلق تک محدود رکھا ہے، لہٰذا اتنا وقت نکالنے اور اپنے خیالات شیئر کرنے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ◻

مصنف: جواری مل پارکھ، مترجم: محمد ہادی رہبر

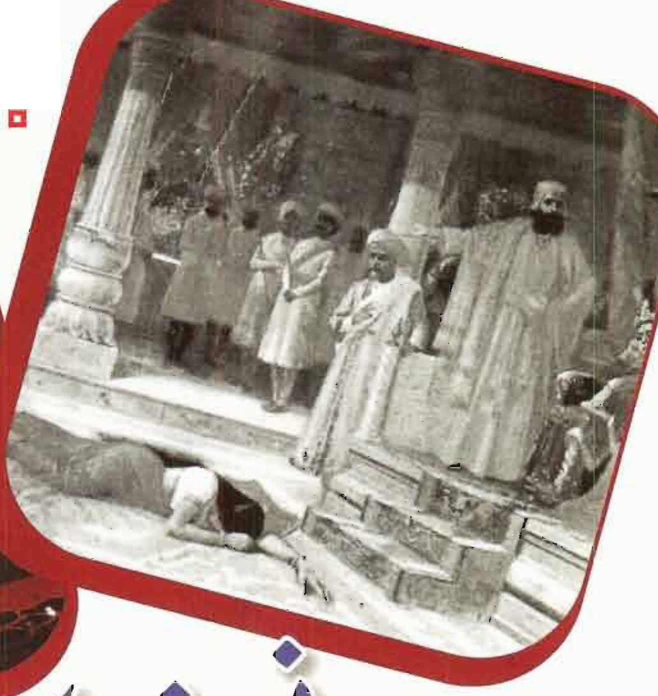

ہندوستانی سنیما کا ارتقا

بھارت کی پہلی فیچر فلم 'راجا ہریش چندر' دادا صاحب پھالکے کی ہدایت کاری میں بنی جو کہ 1913 میں عوامی نمائش کے لیے ریلیز کی گئی۔ یہ خاموش فلم تھی اور ایک مقبول ہندو دیومالائی کہانی پر مبنی تھی۔ 1912-13 سے لے کر 1930 تک بننے والی فلموں کی تعداد زیادہ تر خاموش ہی رہیں۔ 1930 میں اردشیر ایرانی کی ہدایت کاری میں بھارت کی پہلی کلامیہ فلم 'عالم آرا' کی نمائش ہوئی۔ اسی سال تمل کی پہلی کلامیہ فلم 'کالی داس' اور تیلگو کی کلامیہ فلم 'بھکت پرہلاد' کی بھی نمائش کی گئی، نیو تھیٹر نے 1923 میں بنگلہ میں فلم 'چنڈی داس' بنائی۔ اس کے بعد بھارت کی کئی زبانوں میں کلامیہ فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خاموش فلموں کے پورے دور میں زیادہ تر فلمیں دیومالائی تھیں یا پھر مذہبی قصے کہانیوں پر مبنی تھیں۔ کچھ فلمیں عرب، یورپ وغیرہ کی مقبول عام کہانیوں پر بھی بنائی گئیں، لیکن سماجی موضوعات پر بہت ہی کم فلمیں تیار کی گئیں۔ خاموش سنیما کے ہی دور میں بابو راو پینٹر جیسے ہدایت کار ابھر چکے تھے، جن کے لیے سنیما صرف تفریح مہیا کرنے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ معاشرتی پیغام کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ 1930 اور 1940 کی دہائی میں مراٹھی اور ہندوستانی فلموں کو بلندیوں کی طرف لے جانے والے ایس فتح لال، وشنو پنت داملے اور وی شانتارام انھیں بابو راو پینٹر کی دین تھے۔ ہندوستانی سنیما میں حقیقت پسندی کی روایت بابو راو پینٹر سے ہی شروع ہوتی ہے۔

اس کے باوجود یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ہندوستانی سنیما نے حقیقت پسندی کو اپنے تخلیقی اظہاریے کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس کے برخلاف سنیما نے اپنا تعلق 19 ویں صدی کے نصف آخر میں ابھرے مقبول عام اسٹیج ڈرامہ پارسی تھیٹر سے جوڑا تھا۔ مقبول عام کی یہ روایت مغرب کی پروسونی ین (prosonian) روایت اور ہندوستانی عوامی تھیٹر کا ملا جلا نمونہ تھا۔ اسٹیج تھیٹر کی بناوٹ کافی حد تک مغرب کی نقل پر منحصر ہوتی تھی لیکن جو ڈرامہ کھیلا گیا اور ڈراموں کو جس طرح اسٹیج پر پیش کیا گیا اس پر ہندوستانی عوامی روایت کا اثر زیادہ تھا۔ دیومالائی، تاریخ، سسپنس، رومان اور جادوئی کرشموں سے بھرپور خیالی کہانیوں کے ساتھ ساتھ ان میں رقص، نغمہ اور موسیقی کو بھی پیش کیا جانا ہندستانی عوامی روایت کے عین مطابق تھا۔

پارسی تھیٹر کا کردار

پارسی تھیٹر نے عام طور پر ایسے ہی ڈرامے کھیلے جو عوام کے مابین قبول عام کی سند حاصل کرسکیں اور معاشرے کے کسی بھی طبقے کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے بغیر ان کی تفریح بھی ہو۔ لیکن وہ یہ احتیاط ضرور برتتے تھے کہ انھیں اپنے ڈراموں میں موجودہ برطانوی حکمرانوں کی سیاسی ناراضگی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ اس نے ڈراموں کے موضوعات کو کافی حد تک محدود کردیا تھا۔ مذہبی، دیومالائی اور خیالی قصے کہانیوں کی بھرمار جو پارسی تھیٹر میں دکھائی دیتی ہے اس کے پس منظر میں یہی ذہن کارفرما تھا۔ ان سب کے باوجود یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ پارسی تھیٹر نے کسی طرح کا مثبت کردار ادا نہیں کیا۔ اس کے برخلاف پارسی تھیٹر نے مذہبی اور دیومالائی قصوں اور کہانیوں کو پیش کرتے ہوئے مذہبی کٹر پن اور مذہبی تعصباتی جذبات انگیزی سے حتی الامکان گریز کیا۔ ان کے ڈراموں سے ترقی یافتہ اور سیکولر نظریات کو ہی فروغ ملا۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کو شعوری اور غیر شعوری طور پر فروغ دیا۔ آغا حشر کشمیری (1879-1935) کا ڈرامہ 'یہودی' اس کی بہترین مثال ہے، جس پر کئی بار فلمیں بنیں یہاں تک کہ بمل رائے نے بھی اس ڈرامے پر فلم بنانا ضروری سمجھا۔ پارسی تھیٹر نے ہندی اردو اختلاف سے احتراز کرتے ہوئے عام بول چال کی ایک ایسی زبان کی روایت کو قائم کیا، جو ہندی اور اردو کی مشکل پسندی سے دور تھی جس کو بعد میں ہندستانی کے نام سے جانا گیا، اور جس کا ارتقا برصغیر ہند کے ایک بڑے حصے میں رابطے کی زبان کے طور پر ہوئی تھی۔ ہندی سنیما نے ابتدا سے ہی زبان کی اسی شکل کو اپنایا۔ اس زبان نے ہی ہندی سنیما کو غیر ہندی داں ناظرین کے درمیان مقبول بنایا۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ زبان کے اسی آئیڈیل کو اس دور میں نہ ہندی والوں نے اپنایا اور نہ اردو والوں نے۔ ادب کی دنیا میں اسے پریم چند نے ہی نہ صرف اپنایا بلکہ اس زبان کو تخلیقی اور فنی پختگی بھی عطا کیا۔ بعد میں ادب کی ترقی پسند تحریک نے زبان کے اس آئیڈیل کو اپنایا اور

نظری حمایت بھی دی اور اس کے ارتقا میں حصہ بھی لیا۔ لیکن یہ نشان زد کرنا ضروری ہے کہ ہندی اردو سینما کا لسانی آئیڈیل اسی پارسی تھیٹر کی روایت کی توسیع تھی۔

1912-13 سے بھارت کی مختلف زبانوں میں قصوں پر مبنی فلموں کی پیش کش شروع ہوئی، ان سو برسوں میں یہ ایک بہت بڑی صنعت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ہر سال بھارت میں پچیس سے زیادہ زبانوں میں تخمیناً 1100 سے زائد فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ تعداد ہالی ووڈ میں تیار ہونے والی فلموں سے لگ بھگ 40 فیصد زیادہ ہے۔ فلمی صنعت میں ہر سال تقریبا بیس ہزار کروڑ روپے کی تجارت ہوتی ہے۔ لگ بھگ 20 لاکھ لوگوں کا روزگار اسی صنعت پر منحصر ہے۔ ہندی فلمیں کل تیار ہونے والی فلموں کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ لیکن صنعت میں ان کی حصے داری لگ بھگ دو تہائی ہے۔ ویسے تو ہندوستانی (بالخصوص ہندی) فلمیں چوتھی پانچویں دہائی سے ہی برصغیر ہند کے باہر ممالک میں دیکھی جاتی تھیں، خاص طور سے افریقہ کے ان ملکوں میں جہاں ہندستانی بڑی تعداد میں روزگار کے سلسلے میں جا کر بس گئے تھے۔ لیکن گزشتہ دو دہائیوں میں ہندستانی فلم امریکہ، یوروپ اور ایشیا کے دوسرے علاقوں میں بھی فلمی بازار کو وسعت دینے میں کامیاب ہوئی ہے۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ بھارت میں اب بھی ہالی ووڈ کی فلموں کی حصے داری صرف چار فیصد ہے، جب کہ یوروپ، جاپان اور جنوبی امریکی ممالک میں یہ حصے داری کم از کم چالیس فیصد ہے۔ ہندستانی قصوں پر مبنی فلموں نے کہانی کہنے کا جو اسلوب اختیار کیا اور جسے عام طور پر بازارو، غیر تخلیقی اور غیر فنی کہہ کر انکار کیا جاتا رہا، اسی نے ہندستانی فلموں کو ہالی ووڈ کے دبدبے میں آنے سے بچائے رکھا۔

تبدیلی کی شروعات

فلمی ذرائع کی طاقت کو تو رویندر ناتھ اور پریم چند وغیرہ ابتدا میں ہی سمجھ گئے تھے، اس کے باوجود یہ ممکن نہیں ہو پا رہا تھا کہ ادب کی طرح سینما کے ذریعے بھی لوگوں کو سیاسی اور سماجی طور پر بیدار کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر خاموش فلموں کو دیکھنے سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ملک میں آزادی کی جدوجہد بھی ہو رہی ہے۔ لیکن کلامیہ فلموں کی شروعات کے ساتھ تبدیلی کے اشارے ملنے لگے تھے۔ فلموں میں جو نئی نسل آ رہی تھی، وہ سماجی اور سیاسی طور پر زیادہ بیدار تھی۔ 1930 کی دہائی میں وی شانتا رام، ایس فتح لال، وی داملے، بابو راؤ پینڈھیرکر، نتن بوس،

پارسی تھیٹر کا ایک منظر

دیوکی بوس، پی سی بروآ، جیوتی پرساد اگروالا، اَمیہ چکرورتی، دھیریندر ناتھ گنگولی، سہراب مودی، ہمانشو رائے، گیان مکھرجی، گجانن جاگیردار، پرتھوی راج کپور، محبوب خان، خواجہ احمد عباس، بی این ریڈی، کیدار شرما، ضیا سرحدی، کے سبرامنیم وغیرہ کئی فلمساز و ہدایت کار ابھر کر سامنے آئے۔ 1930 تک آتے آتے جدوجہد آزادی عوام کی زبردست حمایت حاصل کر چکی تھی۔ گاندھی نہرو کی رہنمائی میں کانگریس زبردست عوامی تحریک کی طرف بڑھ رہی تھی، تو دوسری طرف رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ خان، بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد جیسے سیکڑوں نوجوان ملک کو آزاد کرانے کے لیے انقلابی راستوں کا انتخاب کر رہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آ چکا تھا اور اس پر پابندیاں بھی عائد کر دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود اس کا حلقہ اثر بڑھ رہا تھا۔ اب آزادی کی جدوجہد صرف متوسط طبقے تک محدود نہیں رہی تھی۔ کسانوں، مزدوروں، عورتوں، دلتوں، طالب علموں اور نوجوانوں کی مشکلات بھی سیاسی غور و فکر کا حصہ بن رہی تھیں۔ ایسے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ فلموں پر اس کا اثر نہ ہو۔

> 1912-13 سے بھارت کی مختلف زبانوں میں قصوں پر مبنی فلموں کی پیش کش شروع ہوئی، ان سو برسوں میں یہ ایک بہت بڑی صنعت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ہر سال بھارت میں پچیس سے زیادہ زبانوں میں تخمیناً۔1100 سے زائد فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ تعداد ہالی ووڈ میں تیار ہونے والی فلموں سے لگ بھگ 40 فیصد زیادہ ہے۔ فلمی صنعت میں ہر سال تقریبا بیس ہزار کروڑ روپے کی تجارت ہوتی ہے۔ لگ بھگ 20 لاکھ لوگوں کا روزگار اسی صنعت پر منحصر ہے۔

استعماری حکومت کی غلامی اور سینسر بورڈ کے کنٹرول کی وجہ سے فلمساز کھل کر سیاسی بیداری والی فلمیں پیش نہیں کر پا رہے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے قومی اور عوامی جذبات کو علامتوں کے ذریعے اظہار کرنے کی کوشش کی۔ کلامیہ فلموں کے اس ابتدائی دور کی فلموں کی درجہ بندی تین طرح سے کی جا سکتی ہے۔ پہلا درجہ ان فلموں کا ہے جن میں کسی عہد وسطی کے صوفی سنت یا حکمراں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا درجہ ان فلموں کا ہے جو کسی نہ کسی سماجی مسائل سے متاثر تھیں۔ ان دونوں طرح کی فلموں کا مقصد صرف تفریح نہیں تھا۔ اس کے علاوہ زیادہ تر وہ فلمیں تھیں جو تفریح کے لیے بنائی گئیں تھیں اور پیسہ کمانا ہی ان کا مقصد تھا۔ اس کے برعکس پہلے درجے کی فلموں کا مقصد بھارت کے عہد وسطی کی زریں تصویر کو پیش کرنا تھا۔ انگریزی حکومت کے تحت استعماری تاریخ دانوں نے ہندستان کے عہد وسطی کی تاریخ کو جس شکل میں پیش کیا تھا، یہ فلمیں ان سے بالکل مختلف طرح کی تاریخ پیش کر رہی تھیں۔ قومیت کا اثر ان پر بھی تھا، لیکن وہ عہد وسطی کو دور سیاہ کے روپ میں پیش نہیں کر رہے تھے، جیسا کہ استعماری تاریخ داں کر رہے تھے۔ اس دور کے حکمرانوں پر مبنی فلموں کا مقصد ان کی بہادری اور فتح مندی کی تعریف کرنا نہیں بلکہ مساوات اور اخلاقی اقدار کے جذبوں پر منحصر ایک منصفانہ سماج پر زور دینا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمایوں، اکبر، شاہجہاں جیسے مغل حکمرانوں کو غیر ملکی حکمرانوں کی شکل میں نہیں بلکہ ہندستانی حکمرانوں کے طور پر ہی پیش کر رہے تھے۔ چنڈی داس، وِدّیاپتی، سنت تکارام، سنت گیانیشور، میرا، سنت پوتنا وغیرہ پر بنی فلموں کا مقصد مذہب کی تبلیغ کرنا نہیں بلکہ مذہبی شدت پسندی اور بنیاد پرستی کے خلاف، مذہبی رواداری، ذات اور مذہب کی دقیانوسیت سے اوپر اٹھ کر انسانی یگانگت اور بھائی چارے کے جذبوں کو فروغ دینا تھا۔ خاص طور پر 1930 سے قبل کی دیومالائی کہانیوں سے قدرے مختلف یہ ایک اہم تبدیلی تھی اور اس نقطۂ نظر سے یہ ایک ترقی پسند قدم تھا۔

سماجی مسائل کا اظہار

اس دور میں سماجی مسئلوں پر بھی کئی فلمیں تشکیل ہوئیں، یہ کمی خاموش سینما کے دور میں تقریباً نہیں کے برابر تھی۔ اچھوت مسئلہ، ودھوا شادی، بے میل شادی، نابالغ شادی، بردہ فروشی جیسے مسائل پر حوصلہ مند فلمیں

تشکیل ہوئیں۔ کسانوں مزدوروں، بے روزگاروں وغیرہ کی زندگی کے مسائل کو بھی فلموں کا موضوع بنایا گیا۔ پہلی بار ادبی تخلیقات پردۂ سیمیں پر آئیں۔ رویندر ناتھ ٹھاکر، بنکم چٹوپادھیائے، شرت چند چٹوپادھیائے، پریم چند جیسے ادیبوں کی تخلیقات پر فلمیں بنائی گئیں۔ پریم چند کے ناول پر 1938 میں تمل میں 'سیوا سدن' کے نام سے فلم بنی۔ اس دوران ہندی اور اردو کے کئی ادیب فلموں سے منسلک ہوئے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مراٹھی اور بنگلہ میں تشکیل پانے والی فلمیں ساتھ ہی ساتھ تمل میں بھی بنائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ 1945 میں تمل میں بنائی گئی فلم 'میرا' ہندی میں بھی ایک ہی ساتھ ریلیز ہوئی۔ اسی دور میں کئی ایسے فلمساز بھی سامنے آئے جنھوں نے سماجی مسئلوں پر فلم بنانے کو اپنا نصب العین سمجھا۔ 1930 کی دہائی میں ہونے والی ان تبدیلیوں نے ہی کئی سنجیدہ ادیبوں کو فلم اسکرپٹ لکھنے کے لیے متحرک کیا۔

اردو-ہندی کے عظیم ادیب اور افسانہ نگار پریم چند 1934 میں اس امید سے ممبئی آئے تھے کہ وہ فلموں میں اپنی تحریروں کے ذریعے معاشی دشواریوں سے کچھ حد تک نجات پاسکیں۔ انھوں نے ممبئی میں رہ کر موہن بھوانی کی فلم 'مزدور' کی اسکرپٹ لکھی۔ لیکن فلم کا یہ تجربہ پریم چند کو زیادہ راس نہیں آیا، پریم چند فلمی دنیا کی بنیادی کمزوریوں کو بہت جلد پہچان گئے۔ بلراج ساہنی اور دیگر ادیبوں کا تجربہ بھی فلمی دنیا کے بارے میں ان سے کچھ الگ نہیں تھا۔ پریم چند کے ان تلخ تجربوں کے باوجود بھی فلموں سے ادیبوں کا رشتہ مسلسل بنا رہا جس کی وجہ سے پریم چند فلموں سے منسلک ہوئے تھے وہی وجہ ان ادیبوں کو فلموں کی طرف متوجہ کرتی رہی، حالانکہ ادیبوں کو متوجہ کرنے کی یہی ایک وجہ نہیں تھی، اس وسیلے میں موجود تخلیقی امکانات اور جمہور عام تک پہنچنے کی جو صلاحیت موجود تھی اس نے بھی ادیبوں کو اس جانب متوجہ کیا۔ تصویری ذرائع ہونے کی وجہ سے سنیما ان لوگوں تک بھی پہنچ سکتا تھا جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن ان ذرائع کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ اس کی تشکیل اور نمائش ادبی تحریروں اور اس کی طباعت کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہنگی تھی۔ یہاں تک کہ ڈراموں کے مقابلے میں بھی یہ زیادہ مہنگا تھا۔ فلم کو تشکیل دینے کے لیے جتنے سرمایے کی ضرورت تھی اس کا انتظام کرنا آسان نہیں تھا۔ ایسے حالات میں یہ بہت ضروری تھا کہ فلمساز تفریحی فلموں کے ذریعے ہی ان پیغامات کے اظہار کا راستہ تلاش کریں، جنھیں ادب اپنے طور پر اظہار کر رہا تھا۔

اشتراکیت اور اپٹا کا تعاون

1930 کے بعد کے دور میں سیاست میں ہی نہیں ادب میں بھی تبدیلی رونما ہو رہی تھی سماجی اصلاح اور وطن پرستی کے جن جذبوں کا ادب میں اظہار ہو رہا تھا، اسے اشتراکیت نے ایک مضبوط نظریاتی بنیاد فراہم کیا۔ اب تک آزادی کی خواہش کا اظہار بہت حد تک مبہم ہی تھا۔ سیاسی آزادی کے بعد کا بھارت کیسا ہوگا، یہ ابھی نہ سیاست اور نہ ادبی موضوعات کا موضوع بنا تھا، لیکن عوام کی بڑھ رہی حصے داری کے ساتھ یہ سوال بھی مشکل ہو رہے تھے اور ادب میں بھی انھیں موضوع بنایا جانے لگا تھا۔ 1917 کی بالشیوک انقلاب اور اس کے بعد کے عالمگیر حادثوں کا اثر بھارت پر بھی پڑنا یقینی تھا۔ انقلاب کے بعد سویت یونین میں جس طرح کی تبدیلی ہو رہی تھی، اس کی طرف بھی بھارت جیسے ممالک تحسین کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ ہندستانی ادیبوں کی اشتراکیت میں دلچسپی ہی نے 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے لیے زمین ہموار کی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، ادیبوں کی ایک ایسی ہمہ گیر انجمن تھی جس میں ان سب ادیبوں کے لیے گنجائش تھی جو آزادی، مساوات، جمہوریت اور سیکولر اقدار میں یقین رکھتے تھے اور جو کسی بھی طرح کا استحصال اور زیادتی کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ انجمن کسی خاص زبان یا خاص علاقے تک محدود نہیں تھی۔ ہندستان کے لگ بھگ سبھی اہم زبانوں کے ادیب اس سے منسلک تھے۔ اگلے کچھ برسوں میں ملک کے ہر حصے میں اس انجمن کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مقبولیت صرف ادیبوں تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ ثقافت کے دوسرے مظاہر میں بھی اس کا اثر دیکھا جا سکتا تھا۔ انجمن کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسٹیج ڈراموں کے لیے ایک معاون انجمن بنانے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ 1943 میں ممبئی میں انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (اپٹا) کی تشکیل ہوئی۔ اپٹا کی کارکردگی میں بھی اضافہ ہوا، نتیجے کے طور پر کئی ادیب اور اداکار اپٹا سے منسلک ہوتے چلے گئے، ان کارکردگیوں میں اضافے کے ساتھ ہی اپٹا کے ثقافتی عملے نے محسوس کیا کہ اپٹا کو فلمسازی کی طرف بھی قدم بڑھانا چاہیے۔

اپٹا کے ساتھ بہت سنجیدگی سے جڑے اردو کے معروف افسانہ نگار خواجہ احمد عباس 41-1940 سے ہی فلموں سے بھی منسلک تھے۔ وہ پہلے سے ہی بطور صحافی فلموں پر تبصرہ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے 1941 میں بامبے ٹاکیز کی فلم 'نیا سنسار' کے لیے گیان مکھرجی کے ساتھ مل کر اسکرپٹ لکھی تھی۔ اسی طرح اردو کے مشہور اور معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے 1937 میں 'کسان کنیا' فلم کی اسکرپٹ اور مکالمے تحریر کیے۔ پرتھوی راج کپور جو 1929 سے فلموں میں اداکاری کر رہے تھے اور جنھوں نے پہلی کلامیہ فلم 'عالم آرا' میں اداکاری کی تھی اپنی مقبولیت کی اونچائی پر رہتے ہوئے بھی 1944 میں پرتھوی تھیٹر کے نام سے ڈراموں کے اسٹیج کے لیے ایک ادارہ قائم کیا۔ پرتھوی تھیٹر کے ساتھ اپٹا کے بھی فن کار جڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے 'پٹھان'، کسان، غدار، دیوار' وغیرہ کئی ڈرامے اسٹیج کیے جو کافی مقبول ہوئے۔ اسی طرح کے کئی ادارے ملک کے بعض خطوں میں کام کر رہے تھے۔

اپٹا کی اپنی کوششوں سے 1946 میں 'دھرتی کے لال' فلم بنی۔ اسی سال اپٹا سے جڑے چیتن آنند نے اپٹا کے تعاون سے 'نیچا نگر' فلم بنائی۔ یہ فلم اسی برس کینس فلم فیسٹول میں بھی دکھائی گئی، اور اس کو دو اور فلموں کے ساتھ بہترین فلم کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔ دنیا کے کسی بھی فیسٹول میں ایوارڈ حاصل کرنے والی یہ پہلی ہندستانی فلم تھی۔ اس کے علاوہ اسی برس نمائش کی جانے والی وی شانتارام کی فلم 'ڈاکٹر کوٹنیس کی امر کہانی' میں بھی اپٹا سے جڑے فن کاروں کا تعاون شامل رہا۔ ہندی سنیما کی ترقی پسند اور حقیقت پسند نظریہ سے ان فلموں کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ ان فلموں سے بھی پہلے کئی فلمیں کسانوں اور مزدوروں کے مسائل اور معاشرے میں پھیلی مساواتی تقسیم پر بن چکی تھیں۔ لیکن واضح سیاسی پس منظر میں بننے والی پہلی فلم 'دھرتی کے لال' اور 'نیچا نگر' ہی تھیں۔ اس نقطہ نظر سے ان دونوں فلموں کی تاریخی اہمیت ہے۔ دونوں فلموں پر مغرب کی حقیقت پسندی کا اثر صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ فلمیں ان کی نقل نہیں ہیں۔ اس کے برخلاف

بھارت کی عوامی ڈرامائی روایت کے مطابقت میں رقص اور نغموں کا سہارا لیا گیا ہے۔ کچھ حد تک فلم کی میلوڈرامائی تکنیک کو ان فلمسازوں نے قبول بھی کیا ہے۔

بدلتے ہوئے دور میں ترقی پسندی

آزادی کے بعد بدلے ہوئے حالات نے فلمی میدان میں اپٹا کے تنظیمی کردار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ لیکن اسی دوران جو ادیب اور فنکار ترقی پسند مصنفین اور اپٹا سے جڑے تھے، ان میں سے کئی ایک نے سنیما کو زندگی کا ایک شعبہ تسلیم کر کے اپنانا شروع کر دیا، جہاں سے کچھ حد تک ان کی تخلیقی ضرورتیں بھی پوری ہونے کی امید تھی۔ اپٹا سے جڑے ایسے ادیبوں اور فن کاروں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے فلموں سے خود کو جوڑ لیا۔ ترقی پسند فکر کے ادیبوں اور فن کاروں کے فلم میں جانے سے فلموں پر کیا اثر پڑا اس کا جائزہ لیا جانا ابھی باقی ہے۔ کیا یہ لوگ فلم کے تجارتی رنگ میں پوری طرح ڈوب گئے اور ترقی پسندی کی اس روایت سے پوری طرح ناتا توڑ لیا جس نے ان کے اندر کے تخلیق کار اور فن کار کی تشکیل کی تھی اور اسے سنوارا تھا، یا انھوں نے اپنی نظریاتی تخلیقی روایتوں سے فلموں کو بھی متاثر کیا تھا۔ 60-1950 کا دور جسے ہندوستانی سنیما کا زریں عہد کہا جاتا ہے، کیا ان ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں کی حصے داری کے بغیر ممکن ہو پاتا؟ اس دور کی ہندی، بنگالی، مراٹھی، آسامی، تمل، ملیالم وغیرہ زبانوں کی قابل ذکر فلموں سے ہی یہ جانا جا سکتا ہے کہ اپٹا کے فن کاروں نے سنیما کو کس حد تک متاثر کیا ہوگا۔ اس پورے دور میں وی شانتا رام، محبوب خان، خواجہ احمد عباس، بمل رائے، راج کپور، گرودت، کے بالا چندر، رشی کیش مکھرجی، ضیا سرحدی، موہن سہگل، چیتن آنند اور کمال امروہی جیسے کئی فلمسازوں نے سماجی نقطہ نظر سے بامقصد اور فنی نقطہ نظر سے بہترین فلمیں بنائیں۔ ان فلمسازوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ فلموں کے ذریعے جو پیغام وہ ناظرین تک پہنچانا چاہتے ہیں انھیں دلچسپ بنا کر پیش کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے حقیقت پسندی اور پہلے سے چلی آ رہی میلوڈرامائی تکنیک کا سہارا لیا۔ ان فلمسازوں نے فلم کی زبان، نغمے، موسیقی اور مکالمے پر خصوصی توجہ دی۔ اس کے لیے انھوں نے کلاسیکل اور عوامی روایت دونوں کو یکجا کر کے ایک نئے آہنگ میں پیش کیا، اس بات کا بھی خیال رکھا کہ بھارت ایک تکثیری تہذیب اور مختلف اللسان ملک ہے اس لیے انھوں نے بھارت کی مختلف ذاتوں اور ثقافتی روایتوں کو اپنی فلموں میں برتنے کی کوششیں کیں۔ لیکن ساٹھ کی دہائی کے بعد سنیما کی یہ روایت کمزور ہونے لگی کیونکہ اس عہد میں منفعت بخشی اور سطحی مقبولیت کا سایہ فلموں پر

> **آزادی کے بعد بدلے ہوئے حالات نے فلمی میدان میں اپٹا کے تنظیمی کردار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ لیکن اسی دوران جو ادیب اور فنکار ترقی پسند مصنّفین اور اپٹا سے جڑے تھے، ان میں سے کئی ایک نے سنیما کو زندگی کا ایک شعبہ تسلیم کر کے اپنانا شروع کر دیا، جہاں سے کچھ حد تک ان کی تخلیقی ضرورتیں بھی پوری ہونے کی امید تھی۔ اپٹا سے جڑے ایسے ادیبوں اور فن کاروں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے فلموں سے خود کو جوڑ لیا۔ ترقی پسند فکر کے ادیبوں اور فن کاروں کے فلم میں جانے سے فلموں پر کیا اثر پڑا اس کا جائزہ لیا جانا ابھی باقی ہے۔**

پڑنے لگا۔ اسی نے ممکن ہے نئے فلمسازوں کو حوصلہ دیا ہو کہ وہ پوری طرح سے سنیما کی عام مقبول روایت سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور ایک نئے راستے کو اپنائیں۔ یہ اور بات ہے کہ 90 کی دہائی تک آتے آتے نیو ویو سنیما کی یہ روایت بھی گم ہوگئی۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقبولیت اور فن کی بحثوں میں پڑے بغیر سماجی مقصد سے مکمل عوامی تفریحی فلم بنانے کی روایت آج بھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔

ظاہر ہے سنیما ایک مقبول عام ذریعہ ہے اور اس میں ہر طرح کے فلمساز فعال ہیں، اس میں ایک طرف سنیما کو ادب کی طرح فن تسلیم کرنے والے فلمساز بھی ہیں، تو دوسری طرف ایسے فلمساز بھی ہیں جن کے لیے یہ پیسہ کمانے اور امیر بننے کا ذریعہ ہے، ایسے لوگوں کے لیے فلم نہ تو آرٹ کا ذریعہ ہے اور نہ ہی وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تفریح کے علاوہ بھی سنیما کا کوئی سماجی مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ سنیما اگر فن ہے اور اس کا کوئی سماجی مقصد ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ فلمساز اس کے تخلیقی اور فنی پہلوؤں پر غور نہ کریں۔ ادب کی طرح سنیما بھی اپنی طاقت سماج سے ہی حاصل کرتا ہے۔ مقبول عام سنیما ابتدا میں مکمل طور پر اخلاقی قدروں کا حامل نہیں رہا، لیکن اس نے مقبولیت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے ہی ان ضروری کارگزاریوں کو انجام دینے کی کوشش کی، جس سے سیکولر اور عوامی جمہوری شکل میں ملک کو بنائے رکھنے میں مدد ملے۔ جمہوریہ ہند کے قیام کے وقت جو فلمساز فعال تھے انھوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے نہ صرف اس وقت کی حقیقت کو اپنی فلموں کا موضوع بنایا بلکہ اس کے مستقبل کی بھی فکر کی۔ اس لیے وہ اپنی فلموں کو ایسے بھارت کی تعمیر میں حصے دار بنانا چاہتے تھے جو کافی حد تک انھیں مثالی اقدار پر ٹکا تھا جن کا ذکر ہندستانی آئین میں کیا گیا تھا اور جس کی شبیہ جدو جہد آزادی کے دوران تشکیل ہوئی تھی۔ انھوں نے کوئی انقلابی ایجنڈا ہاتھ میں نہیں لیا تھا، لیکن ان فلمسازوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سوشلسٹ بھارت کی تعمیر میں کئی مشکلیں ہیں جن کو دور کرنا ضروری ہے۔ ان میں غریبی، بھکمری، آزادیٔ نسواں، دلتوں پر زیادتی، منافع خوری اور لالچ کے لیے غیر قانونی کاموں میں مصروف رہنا، مذہبی اور فرقہ وارانہ عصبیت وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ہندستانی سنیما نے آزادی کے بعد دو دہائی تک ان سبھی موضوعات کو اپنے مخصوص انداز میں اپنایا۔ وہ کسی ایک مسئلے کو مرکز میں رکھتے ہوئے دوسرے مسئلوں کو بھی بنیادی کہانی سے اس طرح جوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان سے الگ اور پیوند کی طرح نظر نہ آئیں، یہی وجہ ہے کہ یہ فلمیں بنیادی اہمیت کی حامل ہوگئیں ہیں، مثال کے طور پر ہندو یا مسلمان یا اور دوسری مذہبی اقلیت سے جذباتی تعلق وغیرہ۔ فلم کی کہانی کچھ بھی ہو اس میں مذہبی اخلاقیات رواداری اور میل جول کا روپ اختیار کیا جاتا تھا۔ حقیقت پسندی اور میلوڈرامائی تکنیک کی فنی یکجائی کی یہ روایت 1960 کے بعد کمزور ہوئی۔

نئی لہر

1960 کی دہائی تک سنیما میں صنعتی اور غیر صنعتی یا فن اور غیر فن جیسا بھید بھاؤ نہیں تھا۔ اس کی شروعات خاص طور پر اس نیو ویو سنیما سے ہوئی جس نے خاص طور پر فلموں کو مقبول عام روایت سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ ستیہ جیت رے، رتوک گھٹک اور مرنال سین نے چھٹی دہائی میں اور بعد میں ادور گوپال کرشنن، جی اروندن، ایم ایس ستھیو، شیام بینگل، کمار ساہنی، منی کول، سعید اختر مرزا، گریش کاسرولی وغیرہ فلمسازوں نے شعوری طور پر فلموں میں حقیقت پسندی اور نئی حقیقت پسندی کی ان روایتوں کو اپنایا جو یورپ میں پانچویں اور چھٹی دہائی میں رائج ہوئی تھیں۔ البتہ ہالی ووڈ کی تشدد آمیز تکنیک کو ان فلمسازوں نے نہیں اپنایا۔ اس تکنیک کا اثر تفریح کے لیے فلمیں بنانے والے ان فلمسازوں پر زیادہ پڑا جنھوں نے میلو ڈرامائی تکنیک کو ہالی ووڈ کے ساتھ ملا کر جرائم پر مبنی فلموں کی تشکیل کی، ان میں زیادہ تر فلمیں تاریخ کے کوڑے دان میں پہنچ چکی ہیں۔

سنیما نے اپنی مضبوط گرفت کی وجہ سے بھارت جیسے مختلف اللسانی اور تکثیری تہذیبی روایت والے ملک میں عوامی تفریح کا ذریعہ بن گئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ بھارت میں پچیس سے زیادہ زبانوں میں فلمیں تشکیل پاتی ہیں جن میں ایک چوتھائی فلمیں ہندی کی ہوتی ہیں جن کے ناظر صرف ہندی۔ اردو علاقوں تک محدود نہیں ہیں۔ یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ کیا بنگلہ، تمل، تیلگو، مراٹھی وغیرہ کی طرح ہندی سنیما بھی علاقائی سنیما ہے؟ جب بھی ہندی سنیما کی بات کی جاتی ہے تو ہمارے سامنے وہ سنیما آتا ہے جس میں کرداروں کی گفتگو ہندی میں ہوتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ گفتگو کرنے والے کردار ہندی بولنے والے ہی ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ کہانی کا تعلق ہندی بولنے والے علاقوں سے ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس فلم کا بنانے والا اور ہدایت کار، اسکرپٹ نگار، اداکار، اداکارہ، موسیقار وغیرہ بھی ہندی بولنے والے ہوں۔ اگر ہم کسی بھی عہد کی اہم فلموں کے بارے میں غور کریں، چاہے وہ مقبول عام سنیما کے تحت آتی ہوں یا آرٹ سنیما کے تحت، ان میں سے زیادہ تر فلموں کے بنانے والے ہندی بولنے والے نہیں ہیں۔ یہ بھی چونکانے والی حقیقت ہے کہ زیادہ تر ہندی بولنے والے علاقوں کے فلمساز اردو کی زمین سے آئے ہوئے ہیں۔ اگر کسی ایک صنف میں ہندی۔ اردو بولنے والوں کی کثرت ہے تو وہ ہے مکالمہ نویسی اور نغمہ نگاری میں۔ یہاں بھی زیادہ تر ادیب اردو کی تہذیبی روایت سے آئے ہوئے ہیں، ہندی کی تہذیبی روایت سے بہت کم۔ یہ بھی غور طلب امر ہے کہ ہندی کے وہی ادیب فلموں میں کامیاب ہوئے جنھوں نے فلموں کی لسانی روایت کو اپنا کر ہی اپنی شناخت بنائی۔ نریندر شرما، شیلندر، سرسوتی کمار دیپک، نیرج، راہی معصوم رضا، کملیشور وغیرہ فلموں میں کامیاب رہے تو اسی وجہ سے۔

گزشتہ دو دہائیوں میں ہندستانی سنیما نے اپنی عوامی روایت کو کافی حد تک نظر انداز کر دیا ہے۔ پہلے کی طرح اب ہندستانی فلموں کا رشتہ دیہی حقائق سے تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ سچائی بھی ہے کہ آج بننے والی زیادہ تر فلموں میں اس متوسط طبقے کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے جو شہروں یا غیر ملکوں میں آباد ہیں۔ اس شہری متوسط طبقے کا تعلق اس بھارت سے ختم ہوتا جا رہا ہے جو آج بھی ملک کی کل آبادی کا 85-80 فیصد ہے۔

سنیما کی زبان

فلموں کی زبان اس بول چال کی زبان سے قریب ہے جسے آسانی سے ہندی یا اردو کہا جاسکتا ہے اور جسے ہندستانی زبان کا نام دیا گیا۔ اس نے نہ صرف ہندی علاقوں کی مختلف بولی کے لفظوں کو ضرورت کے مطابق اپنایا بلکہ دوسرے لسانی علاقوں کے لفظوں کو اپنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ کہانی اور کرداروں کی ضرورت کے مطابق سنیمائی زبان اپنے کو ڈھالتی رہی ہے۔ شیام بینگل کی فلمیں عام طور پر بھارت کے الگ الگ خطوں کی زندگی کے حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کی فلموں کی زبان اور ہندی بولنے کا لہجہ بھی اسی کے مطابق بدل جاتا ہے۔

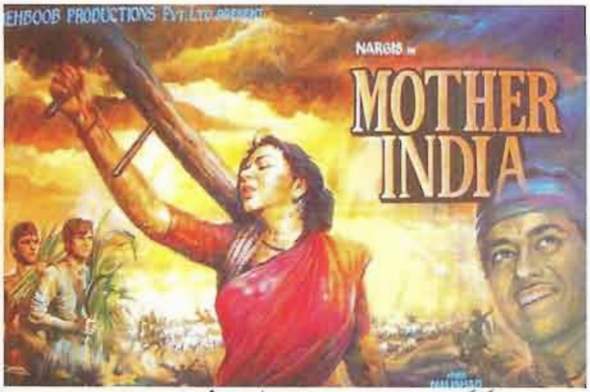

ہندی فلموں نے اپنے کو علاقائی اور لسانی عصبیت سے دور رکھا ہے۔ انھوں نے فلموں کی کہانی کو ایسی شکل میں پیش کیا کہ وہ کسی ایک خطے تک محدود نہ دکھائی دیں اور اگر وہ کسی ایک خطے سے متعلق نظر بھی آئیں تو وہ متاثر کن ضرور ہوں۔ اس ضمن میں مشہور فلمساز محبوب کی زبردست مقبول فلم 'مدر انڈیا' کی مثال دی جاسکتی ہے جو گجراتی زمینی حقائق پر مبنی تھی جس کے کرداروں کو لباس کی وجہ سے آسانی سے شناخت کیا جاسکتا ہے، لیکن فلم کے کسی بھی حصے میں کوئی کردار یا واقعہ اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ ان کا تعلق کسی خاص خطے سے ہے۔ اس فلم کا نغمہ شکیل بدایونی نے لکھا تھا اور موسیقی نوشاد نے ترتیب دی تھی اس کا ودائی گیت کھڑی بولی میں لکھا گیا ہے، لیکن برج اور اودھی کے لفظوں کی شمولیت نے اسے لوک گیت کا ایسا گہرا رمز دے دیا کہ آج بھی شادی کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ 'پی کے گھر آج پیاری دلہنیا چلی، روئے ماتا پتا ان کی دنیا چلی'۔ اس نغمہ کو مقبول عام بنانے میں اس کی موسیقی کا زبردست رول رہا ہے۔ یہ موسیقی ہی ہے جو عوامی شعور کے زیادہ نزدیک ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ جو نغمہ مقبولیت کی حد تک اپنی روح اور جسم کے لحاظ سے مکمل ہے اور پوری طرح سے ہندستانی بھی ہے، اس نغمے کو محبوب کی فلم 'مدر انڈیا' کے لیے لکھا شکیل بدایونی نے، موسیقی ترتیب دی نوشاد نے، گایا شمشاد بیگم نے اور فلمایا گیا نرگس پر، یہ وہ مشترکہ وراثت ہے جسے ہندو اور مسلمان کے خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔

فلم میں موسیقی

فلمی موسیقی کا وجود بذات خود فن موسیقی کے روپ میں نہیں ہوتا۔ اس کا ظہور فلم کے ایک حصے کی صورت میں ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے مرکزی حیثیت کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا، ٹھیک اسی طرح جیسے فلم کی اسکرپٹ کو بنیادی تخلیق تسلیم نہیں کیا گیا، فلم کی ضرورت کے مطابق ہی نغمے اور موسیقی کی تخلیق کی جاتی ہے اور سچویشن کے مطابق ہی انھیں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ان سرحدوں کے باوجود ہندستانی فلمی موسیقاروں نے دل کو موہ لینے والی جو موسیقی ترتیب دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہندستانی فلمی موسیقی نے تین راستوں سے اپنے لیے راہ ہموار کی ہے۔ ہندستانی کلاسیکی موسیقی، مختلف خطوں کی عوامی موسیقی اور مغرب کی کلاسیکی اور پاپولر موسیقی۔ ان موسیقاروں نے اتفاق سے ایک ایسی موسیقی کی روایت کو جنم دیا جو عام

اسکرپٹ اور ڈائیلاگ رائٹر

وجاہت مرزا

فلم ڈائریکٹر، مکالمہ نویس، اسکرپٹ نگار، کہانی نگار، وجاہت مرزا نے کل 31 فلموں میں مکالمہ نگاری کی۔ پورا نام مرزا وجاہت حسین چنگیزی تھا، 20 اپریل 1908 کو ضلع سیتاپور یوپی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 6 فلموں کی اسکرپٹ لکھی اور دو فلموں کی کہانی۔ پانچ فلموں کی ہدایت بھی دی۔ 1933 میں بنی فلم 'یہودی کی لڑکی' میں پہلی مرتبہ مکالمے لکھے۔ 1934 میں فلم 'انوکھی محبت' کے لے مکالمے اور اسکرپٹ دونوں تحریر کیے۔ 1942 میں فلم 'جوانی' ان کی ہدایت میں بننے والی پہلی فلم تھی۔ فلم 'مدر انڈیا' کے مکالمے بھی انھوں نے لکھے تھے جسے آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ مغل اعظم، گنگا جمنا، محبت اور خدا، پالکی اور ہیرا کے مکالمے بھی انھوں نے لکھے تھے۔ انھیں کئی بار فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ 4 اگست 1990 کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا جب وہ پاکستان کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔

راہی معصوم رضا

اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادب میں محترم سمجھے جانے والے شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار اور نقاد راہی معصوم رضا ہندوستانی سینما میں بھی دونوں زبانوں کے درمیان ایک پل بن کر رہے۔ فلموں میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو صرف منظر ناموں اور مکالموں تک محدود رکھا۔ مشہور ٹی وی سیریل 'مہابھارت' کے مکالموں اور اسکرپٹ ان کے ہی لکھے ہوئے تھے، جنھوں نے تاریخی شہرت حاصل کی۔

راہی معصوم رضا 1925 میں اتر پردیش کے غازی پور ضلع میں پیدا ہوئے، ان کا اصل نام سید معصوم رضا تھا، ابتدائی تعلیم غازی پور میں حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے۔ ان کی اہم فلموں میں میں تلسی تیرے آنگن کی 1978، قرض 1980، ڈسکو ڈانسر 1982، کسی سے نہ کہنا 1983 شامل ہیں۔ انھیں تلسی تیرے آنگن کے لیے بہترین مکالمہ نگار کے اعزاز سے نوازا گیا۔

ابرار علوی

ابرار علوی ہندوستانی سینما کے وہ قلم کار ہیں جنھوں نے فلم کو ادب بنا دیا تھا۔ وہ فلم ساز ہدایت کار اور اداکار گرودت کے رفیق کار تھے۔ اس جوڑی نے فلم کی دنیا کو پیاسا، کاغذ کے پھول اور صاحب بیوی اور غلام جیسی عظیم فلمیں دیں جو ابرار علوی کی ہی لکھی ہوئی تھیں۔ بلکہ صاحب بیوی اور غلام کے تو ہدایت کار بھی وہی تھے۔ ابرار علوی یکم جولائی 1927 میں پیدا ہوئے۔ ان کی اہم فلمیں مسٹر اینڈ مسز 55، پیاسا، کاغذ کے پھول، صاحب بیوی اور غلام، آر پار، چودھویں کا چاند، دو پھول، پرنس، ساتھی اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ ہیں۔ انھیں صاحب بیوی اور غلام کے لیے دسویں نیشنل فلم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی فلم کے لیے انھیں بہترین ہدایت کار کے طور پر فلم فیئر ایوارڈ بھی دیا گیا۔ 18 نومبر 2009 کو وہ انتقال کر گئے۔

آدمی کے دل کو چھونے میں کامیاب رہی۔ پانچویں چھٹی دہائی میں فلمی نغمے اور موسیقی کا زور اس لیے دکھائی دیتا ہے کیونکہ ان دونوں علاقوں سے ایسے باصلاحیت اور ترقی پسند تخلیق کار جڑے جنھوں نے فلم کی سرحدوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس میں کچھ نیا کر گزرنے کا حوصلہ دکھایا۔ اس دور کے موسیقاروں نے عام طور سے ہندستانی راگوں میں نغموں کو پیش کیا۔ لیکن راگوں کی ان کے صحیح اور کلاسیکی مخرج میں ادائیگی کم ہوئی، بلکہ ضرورت کے پیش نظر ان میں تبدیلی بھی کی گئی، جس سے یہ راگ عوامی شعور کو باآسانی متاثر کرسکیں۔ فلمی نغموں اور راگوں کی اس بات کے لیے تنقید بھی کی جاتی رہی ہے کہ اس نے ہماری کلاسیکی راگوں کی خصوصیت کو برباد کیا ہے۔ لیکن ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ موسیقی اور راگ بھی کبھی عوامی موسیقی کا حصہ رہے ہونگے (یہ ہندستانی راگوں کے نام سے صاف واضح ہوتا ہے) جنھیں ماضی میں سنجیدہ کلاسیکی شکل دی گئی اور اس طرح وہ کلاسیکی شکل اختیار کرسکی۔ یہ عوامی موسیقی جو کلاسیکی ہوکر عوام سے دور ہوگئی تھی وہی فلموں کے ذریعے واپس اسی عوام تک پہنچ رہی ہے، لیکن اپنی پرانی شکل میں نہیں بلکہ ایک نئے روپ میں۔ ایک طرح سے فلموں نے گم ہوتی عوامی روایت کو کچھ حد تک بچائے رکھنے اور ایک نئی زندگی دینے کا کام کیا ہے۔ دوسرے معنی میں فلمی گیتوں نے عوامی گیتوں کا درجہ حاصل کرلیا ہے وہ اس طرح کہ عوامی گیتوں کی طرح فلمی گیت بھی انسانی زندگی کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں سے جڑی اجتماعی جذبوں اور ذاتی محسوسات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ یہ برصغیر ہند کی فلموں کی خصوصیت رہی ہے کہ فلم میں ایک خاص پس منظر میں لکھے گئے یہ نغمے عام حالات میں بھی برسوں عوامی شعور کا حصہ بنتے رہے ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں میں ہندستانی سینما نے اپنی عوامی روایت کو کافی حد تک نظر انداز کردیا ہے۔ پہلے کی طرح اب ہندستانی فلموں کا رشتہ دیہی حقائق سے تقریباً ختم ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ سچائی بھی ہے کہ آج بننے والی زیادہ تر فلموں میں اس متوسط طبقے کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے جو شہروں یا غیر ملکوں میں آباد ہیں۔ اس شہری متوسط طبقے کا تعلق اس بھارت سے ختم ہوتا جا رہا ہے جو آج بھی ملک کی کل آبادی کا 85-80 فیصد ہے۔ لیکن فلموں میں یہ ناپید ہوتی جارہی ہے۔ اس کی جگہ جس متوسط طبقے نے لیا ہے، اس کے لیے بھارت کی مختلف تہذیبی روایتوں کی اہمیت اتنی ہی ہے، جتنا کہ فیشن کی دنیا میں ایتھنک پوشاکوں کا ہوتا ہے۔ اس طبقے کی نظر میں مشترکہ تہذیبی روایت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، نہ ہندوستانی زبان کی اور نہ عوامی روایت کی۔ عالم کاری اور اقتصادی آزادی کی عوام مخالف پالیسیوں کے دباؤ اور مشترکہ تکثیری تہذیب اور عوامی روایت کے خلاف برسرپیکار طاقتوں کے غلبے نے ہندوستانی سینما کی تکثیری تہذیبی روایت کے سامنے ایک بڑا چیلنج کھڑا کردیا ہے۔ ادب اور فن کے دوسرے ذرائع کے سامنے بھی یہ چیلنج موجود ہے۔ ادب اور فن کے دوسرے ذرائع کی طرح سینما میں بھی ان سے جدو جہد کرنے والی طاقتیں آج بھی مصروف ہیں۔

بشکریہ ہندی ماہنامہ 'سمیانتر' جولائی 2012

■

Dr. Mohd Hadi Rahbar, 265, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi - 110025

ہندوستانی سنیما کا عہد زریں

ضیاء السلام
ترجمہ: وسیم احمد

مسلسل گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اگرچہ بمل رائے، محبوب خان، کے آصف، وی شانتارام، گرودت، راج کپور اوران جیسے ہی دوسرے فلم ہدایت کاروں سے ہٹ کر توجہ اب دوسرے ہدایت کاروں کی طرف مبذول ہوچکی ہے لیکن اس بات سے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ 1950 اور 60 کی دہائی کے جسے ہندوستانی سنیما کا سنہرا دور کہا جاتا ہے، ان فلم سازوں نے اپنے پیچھے ایسی روایات چھوڑی ہیں جن کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ وقت کے ابھرتے ہوئے سماجی اقتصادی اور سیاسی حقائق کو پیش کرتے ہوئے ہندوستانی سنیما نے اکثر وہ کام کیا ہے جو بنیادی طور پر میڈیا کا کام ہے: رائے عامہ کا رخ متعین کیا، ابھرتے ہوئے ملک کو درپیش چیلنجوں کو اجاگر کیا اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ کسی کے معصوم خوابوں کو کوئی ہلکی سی ٹھیس بھی لگنے دے، بلکہ اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ ترقی کے اس سفر میں کوئی بھی پیچھے نہ رہے۔ حقیقت پسندی بور کرنے والی یا اکتا دینے والی نہیں تھی۔ راج کپور کی فلموں میں شہروں کی بے چینی، یا گرودت کی فلموں میں اخلاقی گراوٹ یا بمل رائے کی فلموں میں سماجی اختلاف نے ہمیشہ بے زبانوں کو زبان، محروموں کو اپنے جذبات کے اظہار اور باصلاحیت افراد کو پلیٹ فارم عطا کیا ہے۔ یہ ایک ایسا سنیما تھا جسے ماضی سے اخذ کیا گیا تھا لیکن یہ ماضی پرستی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک نو آزاد قوم کو نہایت دلکش انداز میں ہی یاد دلانا تھا کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے یا سفید فام لوگوں کی طرف سے ہندوستان کو مہذب بنانے کی مہم سے بھی پہلے، ہم ایک پرجوش قوم تھے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ہمارے سماجی، مذہبی مصلحوں کی طرح سنیما نے بھی ہمارے سامنے ماضی کی ان جھلکیوں کو پیش کیا جن کو کبھی کبھی یاد کرنا نہ صرف مفید تھا بلکہ یہ ہمارے مستقبل کے لیے ایک مشعلِ راہ بھی بن سکتا تھا۔ وی شانتارام کی فلم 'جھنک جھنک پائل باجے' اور 'نورنگ' نہ صرف کلاسیکی کو مقبول بنانے کی ایک کوشش تھی بلکہ یہ ہندوستانی فنون لطیفہ کی عکاس اور اس کا اظہار ہیں۔ یہی چیز 50 کے اوائل میں 'بیجو باورا'، 'مرزا غالب' اور 'انارکلی' نے پیش کی ہے۔ یہ فلمیں جو شاندار ماضی سے اخذ کی گئی تھیں، پوری طرح مسترد کیے جانے کے خطرے سے دوچار تھیں کیونکہ انگریزوں نے پوری نسل کے ذہنوں میں مغل دور کی برائیوں اور انگریزوں کی اعلیٰ اخلاقی اقدار ثبت کردی تھیں۔ لیکن ہندوستان کے ماضی کو مسخ کرنے کی کوششوں کے باوجود نوجوان قوم نے خوشی کے ساتھ ماضی کی مشترکہ اقدار کو قبول کیا اور پھر لوگوں نے جیسا کہ آج کی حقیقت ہے، فلمیں بنائی یا دیکھیں۔ کس نے کیا رول ادا کیا، کس نے گانے لکھے یا کس نے گائے، اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسی کثرتی سماج کا اعادہ کرنے والی فلم 'بیجو باورا' تھی، جس کے مشہور بھجن شکیل بدایونی نے لکھے، نوشاد نے موسیقی تیار کی اور محمد رفیع نے گایا۔ یہ صرف فن ہی تھا جس نے ہم سب کو یکجا کیا۔ ایک زخم خوردہ قوم کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کی کوشش کا بہترین اظہار کے آصف کی فلم 'مغل اعظم' سے ہوتا ہے۔ مغل تخت کے ولی عہد اور ایک درباری کنیز کے درمیان لازوال محبت پر مبنی اس فلم کو مکمل کرنے میں 16 سال لگے اور اس عرصے کے دوران ہیرو اور کلیدی رول کرنے والی اداکارہ معاون اداکار سمیت ہر چیز میں تبدیلی آئی لیکن جس چیز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ تھا قوم کے سامنے اس کی گوناگوں اقدار کو پیش کرنے کا جذبہ۔ ہندوستان کے آئین نے ہمیں آزادی تقریر اور اظہار رائے کے ساتھ ساتھ کسی بھی مذہب کی تقلید اور تبلیغ کرنے کا حق بھی عطا کیا ہے۔ جدید ہندوستان کے معماروں نے صرف اسی چیز کا اعادہ کیا جو قدیم اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں پہلے سے ہی رائج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کے آصف کے مسلمان درباری مغل بادشاہ کے دربار میں کرشنا کا بھجن گاتے نظر آتے ہیں اور اسی فلم میں رسول اکرمؐ کی شان میں نعت بھی پیش کی گئی ہے اور یہ دونوں ہی، یعنی بھجن اور نعت شریف ایک ہی گلوکارہ، یعنی لتا منگیشکر نے گائے ہیں۔ کے آصف کی اس شاندار فلم میں جہاں دربار میں فارسی آمیز اردو کا استعمال ہوا ہے وہیں سنسکرت آمیز ہندی بھی سنائی دیتی ہے۔ ایک مسلمان بادشاہ کی شادی ایک راجپوت شہزادی سے کسی کو بھی معیوب نظر نہیں آتی۔

ایک دوسری سطح پر کچھ فلموں میں ایسے سماج کی تصویر کشی کی گئی ہے جو خود اپنی ہی برائیوں سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ بمل رائے کی 'دو بیگھہ زمین' اور 'سجاتا' کسی ردوقدح کے بغیر کمزوروں کے حق میں بولتی نظر آتی ہیں۔ جہاں ایک فلم میں طبقاتی سیاست کو اجاگر کیا گیا ہے تو دوسری فلم میں ذات پات کی تفریق پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ ایک طرف 'دو بیگھہ زمین' میں بے سوچی سمجھی صنعت کاری کے دور میں 'غریب' کی حالت زار پر بات کی گئی ہے تو 'سجاتا' میں ذات پات کی تفریق کو مٹانے پر زور دیا گیا ہے۔ بعد میں بی آر چوپڑا نے اپنی فلم 'نیا دور' میں صنعت کاری کی ہوسناکیوں کو اجاگر کیا اور 1970-80 کی دہائیوں میں کے وشواناتھ نے ذات پات کی تفریق کو اٹھایا۔ ایک اور سطح پر 'دھول کا پھول' جیسی فلموں میں جو سماج سے مطابقت رکھنے والی لیش چوپڑہ کی شروعاتی فلموں میں سے ہے، ہمارے سماج میں اخلاقی اقدار کے فقدان کو نشانہ بنایا گیا جب کہ شکتی سامنت کی 'آرادھنا' نے جو ہیروئن کے کردار پر مبنی فلم تھی، کسی تلخ انداز کے بغیر عورتوں کی مجبوریوں

> 1960 کی دہائی کے اواخر میں ہندی سنیما نے کئی پیچیدہ موضوعات کو بالغ نظری سے پیش کیا ایک طرف چوپڑہ اور سامنت نے سماجی بدعتوں کو اجاگر کیا تو کچھ دوسروں نے ڈاکوؤں کو پھر سے سماج میں شامل کرنے کی ونوبا بھاوے کی خواهش کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا۔ انسانیت کے اس عظیم علمبرار کی دلیل تھی کہ غلط کاروں کو ایک موقع ضرور دیا جانا چاہیے۔ "جس دیش میں گنگا بهتی هے'، 'گنگا جمنا' اور 'مجھے جینے دو' جیسی فلموں میں راج کپور، دلیپ کمار اور سنیل دت نے ایک ایسے شخص کا بهترین کردار ادا کیا هے جو درست راہ سے بھٹك گئے تھے۔ حقیقت یه هے که اس وقت کا سنیما سیاست اور سماج سے جڑا هوا تھا۔ اگرچه کبھی کبھی فلموں میں پیش کیے گئے حل پر سوالیه نشان لگایا گیا، لیکن اس کے مقصد پر کبھی کوئی سوال نهیں اٹھایا گیا۔

کو پیش کیا۔ یقیناً شکتی سامنت نے نہایت خاموشی سے شادی سے پہلے جسمانی رشتے کو اس فلم میں پیش کیا جس میں شرمیلا ٹیگور نے ایک بن بیاہی ماں کا زبردست کردار ادا کیا جب کہ ان کے ساتھ، اس وقت کے سپر اسٹار، راجیش کھنہ نے ڈبل رول ادا کیا۔ 'آرادھنا' اس پہلو سے بھی قابل تعریف ہے جس میں شکتی سامنت نے شادی سے پہلے کے جسمانی تعلق کا کس خوبصورتی سے اظہار کیا۔ اس سین میں بہت ہی معمولی اظہار کے ساتھ سب کچھ کہہ دیا گیا۔

1960 کی دہائی کے اواخر میں ہندی سینما نے کئی پیچیدہ موضوعات کو بالغ نظری سے پیش کیا ایک طرف چوپڑہ اور سامنت نے سماجی بدعتوں کو اجاگر کیا تو کچھ دوسروں نے ڈاکوؤں کو پھر سے سماج میں شامل کرنے کی ونوبا بھاوے کی خواہش کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا۔ انسانیت کے اس عظیم علمبردار کی دلیل تھی کہ غلط کاروں کو ایک موقع ضرور دیا جانا چاہیے۔ ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'، 'گنگا جمنا' اور 'مجھے جینے دو' جیسی فلموں میں راج کپور، دلیپ کمار اور سنیل دت نے ایک ایسے شخص کا بہترین کردار ادا کیا ہے جو درست راہ سے بھٹک گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کا سینما سیاست اور سماج سے جڑا ہوا تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی فلموں میں پیش کیے گئے حل پر سوالیہ نشان لگایا گیا، لیکن اس کے مقصد پر کبھی کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا۔

'آوارہ' ہندوستان کے آزاد ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد ریلیز ہوئی جس میں شہر کو ایک ڈراؤنے خواب اور ایک خوبصورت خواب، دونوں ہی طرح پیش کیا گیا، آوارہ ریلیز ہونے کے تقریباً آدھی دہائی بعد گرودت کی فلم 'پیاسا' ریلیز ہوئی جس میں شہری زندگی کی حقیقت پر طنز کرتے ہوئے انسانوں کی بھیڑ میں بھی انسان کے اکیلے پن کو اجاگر کیا گیا۔ اس دوران وی شانتارام کی 'دو آنکھیں بارہ ہاتھ' آئی جو سزا دینے والے انصاف کی بجائے اصلاحی عدل کی وکالت کرتے ہوئے ہمارے جرائم کی اصلاح پر ایک کاری ضرب تھی۔ البتہ محبوب خان کی فلم 'مدر انڈیا' میں سینما اور نظام حکومت کے درمیان دردانگیز تعلق اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی فلم تھی جس میں ہیروئن کا رول ہندی سینما کی تاریخ میں ایک خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی ہیروئن کو بہترین مشرقی اقدار سے مزین عورت کے روپ میں پیش کیا جو ذاتی مفاد پرستی کی مخالف، خاندانی اور سماجی اقدار و روایات کی پاسدار اور مغرب کے اصولوں کے بالکل برعکس ہے جہاں ذاتی مفاد پرستی کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ البتہ محبوب خان کی فلم نہرو کے سوشلزم کا ایک نفیس اشتہار اور نجی صنعت کاروں کے لیے ایک فرد جرم تھی۔ فلم کا آغاز ایک گاؤں میں ایک نہر کے افتتاح سے ہوتا ہے جس میں سرکاری اقدام کی مخالفت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جیسے جیسے فلم آگے بڑھتی ہے۔ شیطان صفت ساہوکار کے ناپاک عزائم کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ اس میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ نجی صنعت کاری کا اصل مقصد صرف اور صرف منافع کمانا ہے جب کہ سرکار ہر ایک کو ساتھ لے کر چلنے کے جذبے سے معمور اقدامات کرنے کی سعی کرتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ملک کی بات کرتے ہوئے بھی ہمارے ہندی فلم سازوں نے آزادی کو بہت بڑھ چڑھ کر پیش نہیں کیا۔ یہاں تک کہ شروع کے برسوں میں بھی، جب کہ ایسا کرنے کی وجہ بھی تھی، ہمارے فلم سازوں نے اپنی فلموں میں سخت گیر حب الوطنی کو جگہ نہیں دی۔ چونکہ ان کے ذہنوں میں وقت کے سماجی، اقتصادی حقائق حاوی تھے اس لیے اپنے دشمن کے خلاف چاہے وہ انگریز ہوں، یا بعد میں چینی ہوں، سخت تعصب کے اظہار کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس وقت صرف 'حقیقت' اور 'اپکار' ہی ایسی فلمیں ہیں جنھیں روایتی 'حب الوطنی' کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ سماجی ذمے داری اور وقت سے مطابقت رکھنے والی ان فلموں کے علاوہ اس دور میں صرف سادہ اور حقیقی تفریحی فلموں کی بھی گنجائش تھی۔ شمی کپور کا 'یاہو' کا نعرہ ان کی اپنی ہی ادا تھی۔ 'کشمیر کی کلی' اور بعد میں یہاں تک کہ 'پڑوسن' جیسی فلموں کا مطلب تھا کہ شائقین عشق و محبت کی داستانیں یا ہلکی پھلکی مزاحیہ فلموں کو بھی قبول کرنے کو تیار تھے۔ سینما ایک تفریح کا ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔ اگرچہ اس نے اکثر و بیشتر ایک اخلاقیات کے ٹیچر کا رول ادا کیا لیکن کبھی کبھی اس نے ایک جوکر یا ایک مزاحیہ قصہ گو کا کردار ادا کرکے ہم سب کو مسحور کردیا ہے۔

ابھرتے ہوئے ہندوستان کی شاندار تصویر پیش کرتے ہوئے ان فلموں نے، جن میں زیادہ تر باکس آفس پر ہٹ ہوئیں، ماضی کی امارت کو یاد دلاتے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں مزید خواب سجائے۔ ان میں سے چند فلموں نے بین الاقوامی مارکیٹ پر بھی تھوڑا بہت اثر کیا۔ محبوب خان کی فلم 'آن' اس وقت موضوع گفتگو بنی جب کہ دنیا میں ہندوستانی سینما کے جام نے گردش بھی نہیں کی تھی اور راج کپور کی فلم 'آوارہ' نے اس سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ان کے سینماٹوگرافر رادھو کرماکر (سینما کے فوٹوگرافر) نے بہت کم تکنیکی ساز و سامان کے ساتھ سیسل ڈی ملی کی تصویر کشی کے خوابوں کو تعبیر دی۔ بعد میں وی کے مورتی نے 'کاغذ کے پھول' میں یہ کارنامہ انجام دیا لیکن حقیقت پسند سینما میں بہت کم ستائش کی گئی۔ افسوس! انھیں تقریباً نصف صدی کے بعد اس وقت تسلیم کیا گیا جب انھیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بعد میں جب بالی ووڈ کی فلموں میں اسٹائل، حقیقت کی جگہ لے رہا تھا وجے آنند نے بھی یہ ثابت کردیا کہ وہ بھی ایسے اسٹائل پیش کرکے 'تیسری منزل' اور 'جیول تھیف' جیسی فلموں کو سنسنی خیز بنا سکتے ہیں۔ ان فلموں نے بھی بین الاقوامی حلقوں میں ہلچل پیدا کی تھی اور ہاں 'مدر انڈیا' نے ایک زمانے پہلے جب کہ ہم نے ڈینی بوئل کی 'سلم ڈاگ ملینیئر' کے اوپر اتنا شور شرابا کیا، کان (Cannes) میں جگہ حاصل کی تھی اور ہمیں 'شری 420' کو بھی نہیں بھولنا چاہیے جس کے گانے دلی سے ماسکو تک ہر جگہ سنے جاتے تھے۔

گیتوں کی بات کریں تو آزادی کے بعد کی پہلی دو دہائیوں میں ہندی سینما میں عظیم موسیقی پیش کی گئی۔ انتہا یہ تھی کہ انل بسواس، خیام اور جے دیو جیسے فن کاروں کو بھی سخت مقابلہ آرائی کے اس دور میں ان کا حق نہیں مل سکا۔ اکثر میوزک ڈائریکٹر، گیت کار اور گلوکار سحر انگیز گیتوں کی تکمیل کے لیے ایک ٹیم کی طرح کام کرتے تھے۔ اگرچہ ذاتی طور پر وہ بہت مشہور نہیں تھے لیکن پھر بھی وہ عام آدمی کو

خوشیاں بانٹنے میں کامیاب رہے۔ وہ چاہے 'آوارہ' ہو یا 'آرادھنا' یا 'ناگن'، 'پیاسا'، 'مغل اعظم'، اور 'چودھویں کا چاند' جیسی نایاب فلمیں ہوں یا 'جیول تھیف'، 'گائڈ'، 'ستیہ کام' اور 'خاموشی' جیسی فلمیں ہوں، تقریباً ہر ایک فلم میں دو چار گانے ضرور ایسے ہیں جن کی مقبولیت گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ کبھی کم نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ 'دیدی' جیسی فلموں میں بھی جنھیں لوگ بھلا چکے ہوں سدھا ملہوترا کا گانا 'تم مجھے بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو' اور 'شکن' میں جگجیت کور کا گانا 'تم اپنا رنج و غم، اپنی پریشانی مجھے دے دو' آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ نوشاد، شنکر جے کشن، سلیل چودھری، ایس ڈی برمن، روی، او پی نیر، تمام لوگوں نے ان برسوں میں شاندار فن پیش کیا۔ ایسے گانے جو نہ صرف سنیما کے شائقین کی زبان پر تھے بلکہ ایسے گانے جنھوں نے ہندی سنیما میں اپنا ایک مقام بنایا اور شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، اور گلزار جیسے شاعروں کے لکھے گیت، جنھوں نے ہمیشہ غریبوں اور محروموں کی بات کی، جنھوں نے حقیقت کی تلخیوں سے شاعری کو اخذ کیا۔ اردو شاعری سے شمع، پروانہ کو الگ کرتے ہوئے انھوں نے عورت کی خوبصورتی پر نہیں بلکہ غریبی، بھوک، بے روزگاری اور تنہائی کی بات کی۔ البتہ یہ بھی درست ہے کہ سب کچھ یہی نہیں تھا۔ اسی زمانے میں وحیدہ رحمان کے لیے فلم 'چودھویں کا چاند' میں عورت کی خوبصورتی پر بہترین شاعری کی گئی اور اسی طرح آرادھنا میں شرمیلا ٹیگور کے لیے خوبصورت شاعری کی گئی اور ایک عورت کی طرف سے ایک مرد کو چھیڑنے کا فیشن شروع ہونے سے بھی پہلے 'نیا دور' میں ساحر کے 'اڑیں جب جب زلفیں تیری' جیسے گیت اور اس پر منچلی وجینتی مالا کی دلیپ کمار سے چھیڑ چھاڑ ایک قیامت سے کم نہیں۔ یہ ایک ایسا دور تھا جب عورت کو صرف شرمیلی ہی تصور کیا جاتا تھا اور ایک ایسے میڈیم میں جہاں عام طور پر کلاسیکی کی گنجائشیں نہیں ہوتی، ہندی سنیما نے، استاد بڑے غلام علی خاں، استاد عامر خاں، استاد بسم اللہ خاں اور پنڈت روی شنکر جیسے استادوں کو بھی ان ہی کی شرائط پر اپنی وسعت میں سمو لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مشہور میوزک ڈائریکٹروں کا ایسا تانا بانا تھا کہ روی نے جنھوں نے اپنا کیریئر میوزک ڈائریکٹر روی شنکر کے طور پر شروع کیا تھا، اپنے نام سے شنکر کا جز و خوشی خوشی، صرف اس لیے ہٹا دیا کہ ان کے نام سے کلاسیکی کے استاد کا ابہام پیدا نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود انھیں 'چودھویں کا چاند' یا 'وقت' اور 'ہمراز' جیسی فلموں کے لیے بہترین موسیقی دینے سے کوئی نہ روک سکا جو بی آر چوپڑہ نے تیار کی تھیں۔ وہی بی آر چوپڑہ، جنھوں نے محمد رفیع سے اختلاف رائے کے سبب مہندر کپور کو اپنی بہترین فلموں میں موقع دیا۔ رفیع کی بات کریں تو مکیش اور رفیع کے پلے بیک سنگر کے طور پر شہرت پانے کے ساتھ ہی گلوکار اداکار کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسری طرف لتا منگیشکر کی عظیم کامیابی کا مطلب یہ ہوا کہ تمام گلوکارہ اداکارہ کے لیے بھی گنجائشیں ختم ہو گئیں۔ ایسے دور میں جب کہ شمشاد بیگم اور گیتا دت کسی نہ کسی طرح ٹکی رہیں، ثریا پس پردہ چلی گئیں اور آشا بھونسلے وقت کے ساتھ ساتھ عروج کی منزلیں طے کرنے لگیں۔ گلوکار اداکار کے دور کے خاتمے کے بعد ہندی سنیما بھی رفتہ رفتہ اپنے اولین دور کے تھیٹر کی شکل سے علیحدہ ہونے لگا جب کہ وہ پوری طرح اسٹیج کے اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈرامائی انداز کم ہوتا گیا اور زیادہ ہلکے پھلکے انداز سے اظہار کو مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اب سہراب مودی اور پرتھوی راج کپور کے انداز کے لیے گنجائشیں کم ہوتی گئیں۔ ایک دور گزر گیا اور دوسرے دور نے اپنی آمد کی اس وقت دستک دی جب پرتھوی راج کپور نے 'آوارہ' میں ہیرو کا رول راج کپور کے لیے چھوڑتے ہوئے خود کیرکٹر رول ادا کیا۔ اسی فلم نے کپور خاندان کو کئی نسلوں تک کے لیے متحد کر دیا۔

مگر تمام فلم سازوں نے اپنے اپنے منفرد انداز میں ہمارے سماج اور نظام حکومت کو آئینہ دکھایا لیکن یہ فلم ساز کامریڈ کے طور پر اور بھائی چارے کے طور پر پوری طرح متحد تھے۔ انکے کام کرنے کا تعلق اکثر پیشہ ورانہ حلقے میں باہمی آسانی پر منحصر ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو ان کی ذاتی شہرت نے پائیدار پیشہ ورانہ تعلقات قائم کرنے میں بہت مدد کی ہے۔

مثال کے طور پر پال مہندرا، رشی کیش مکھرجی، شیلندر، کمل بوس، گلزار، ایس ڈی برمن اور ان سے پہلے سلیل چودھری، بمل رائے کے پراعتماد لوگ تھے۔ یہ لوگ ساتھ کام کرتے تھے اور ایک خاندان جیسے تھے۔ بمل رائے کے ان ہی دوستوں اور ساتھیوں نے، ایسے وقت میں جب اس ماہر فلمساز کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا یا بعد میں ان کی طویل علالت کے دوران، خود ہی خوشی خوشی اپنی تنخواہوں میں کمی کر دی۔ یہی کہانی راج کپور اور خواجہ احمد عباس، وی پی ساٹھے، حسرت جے پوری، اور شنکر جے کشن سمیت ان کے دوستوں کی تھی۔ دیو، وجے اور چیتن آنند کے ساتھ وی راترا اور فالی مستری تھے، بالکل اسی طرح جس طرح گرو دت کے ساتھی ابرار علوی، وی کے مورتھی، ایس ڈی برمن، اور جانی واکر ان کے ساتھ تھے۔ وی شانتا رام نے اپنی اس ٹیم کے ساتھ کام کیا جس میں ان کی اہلیہ 'سندھیا'، وسنت دیسائی اور بھارت ویاس کے لیے گنجائشیں تھی۔ اسی طرح شکتی سامنت کے ساتھی، جنھوں نے کشور کمار کو آرادھنا میں سب سے بڑی کامیابی دلائی، رمیش پنت، سچن بھولک اور ان سے پہلے او پی نیر تھے۔ ہاں شرمیلا ٹیگور نے بھی 'کشمیر کی کلی' کے بعد ہمیشہ ان کی فلموں میں ساتھ دیا۔

اگر چہ انھوں نے مختلف موضوعات پر کام کیا اور اپنی اپنی ٹیم بلکہ اپنے اپنے گروپ بنائے، لیکن یہ تمام فلم ساز فن سے اپنی محبت میں متحد تھے۔ اسی لیے 'ناگن' کی دھن بنانے میں روی کی طرف سے مدد کرنا یا کسی سیٹ پر نوشاد کا سلیل چودھری سے مشورہ کرنا، کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ یش چوپڑہ نے اپنا کام وی شانتا رام کے راج کمل اسٹوڈیو سے شروع کیا۔ یہاں تک کہ جب یہ معلوم ہوا کہ شیلیندر نے پھر سے گانے لکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو گلزار نے بہت خلوص کے ساتھ 'بندنی' کے لیے گانے لکھنے سے خود کو الگ کر لیا۔ اس طرح کی آپسی مفاہمت کے ساتھ یہ فلمیں بنائی گئیں۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یہ فلمیں وقت کے معیار پر کھری اتریں۔

بشکریہ: ہاؤس فل، گولڈن ایج آف ہندی سنیما، اوم بک انٹرنیشنل،
مرتب: ضیاء السلام

Waseem Ahmed, N 24, Near Khalilullah Masjid Batla House, Okhla, New Delhi-25

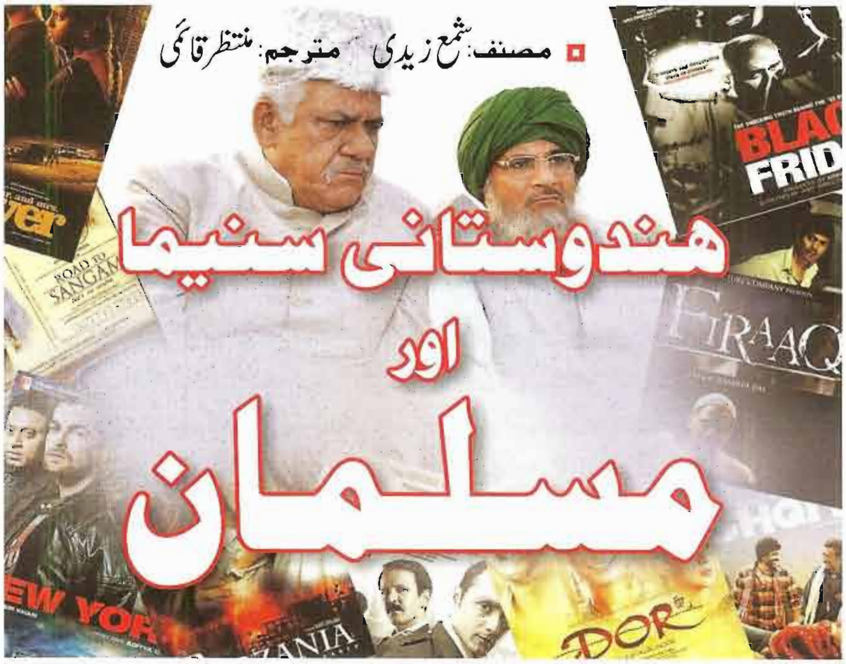

ہندوستانی سنیما اور مسلمان

مصنف: شمع زیدی   مترجم: منتظر قائمی

مسلم لیگ کے لاہور ریزولوشن کے جواب میں مولانا ابوالکلام آزاد نے 15 اپریل 1946 کے اپنے بیان میں کہا تھا کہ:

''ذرا ہم پاکستان سازی کے منصوبے کے اثرات پر غیر جذباتی طور سے غور کریں کہ اس کے نتائج کیا کیا ہوں گے۔ ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہو جائے گا ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی تو دوسرے میں ہندوؤں کی۔ ہندوستانی ملک میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان ایک معمولی اقلیت کے طور پر جابجا بکھرے ہوں گے۔ وہ ہندو اکثریتی صوبوں میں آج کی بہ نسبت اور بھی زیادہ کمزور ہو جائیں گے۔ وہ ان خطوں میں گزشتہ ایک ہزار سال سے آباد ہیں اور انھوں نے یہاں ایک مقبول عام مسلم معاشرے اور تمدن کی آبیاری کی ہے۔ ان کو جلد ہی یہ احساس ہو جائے گا کہ وہ خارجی اور بے گانے ہو چکے ہیں۔ اقتصادی، علمی اور صنعتی طور سے پسماندہ مسلمان اب خالص ہندو راج کے رحم وکرم پر رہیں گے۔''

حالانکہ ہندوستان خالص ہندو راجی نہ ہو سکا مگر اب ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستانی سنیما اب بڑی تیزی سے اس جانب گامزن ہے۔ فلم ناقدین اور دانشوروں نے ہندی سنیما کے یک رخے معاشرے اور یک طرفہ پہلوؤں پر بڑی جانفشانی سے لکھا ہے۔ مثال کے طور پر چدانند داس گپتا نے 1991 میں کہا کہ 'کثیر ثقافتی رویہ اور صبر وتحمل کو فروغ دینے سے بعید ہندی سنیما اب اقلیتی طبقے کو یا تو خارج کر رہا ہے یا انھیں حاشیے پر ڈال رہا ہے جس سے ہندوستان کا کثیر رخی معاشرہ یک رخی ہندی بولنے والے شمالی ہندوستان میں تبدیل ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں ہمیں وجیہ اعلیٰ طبقہ ہی اسٹار کے طور پر نظر آ رہا ہے۔' اگرچہ اور بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو سنیما کو جیسا کہ وہ نظر آتا ہے اس سے بھی کہیں زیادہ فرقہ پرست تسلیم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے حال ہی کے ایک مضمون "Bollywood and Indian Muslims" میں سید علی مجتبیٰ نے لکھا ہے کہ

''بالی ووڈ میں مسلم کرداروں میں وقت کے ساتھ بڑی ہیبت ناک تبدیلی آئی ہے۔ سنیما میں کبھی بادشاہ، نواب اور اشراف دکھائی دینے والے مسلم کردار اب آوارہ گرد اور بندوق بردار جہادی نظر آنے لگے ہیں۔ ہندوستانی فلموں میں مسلم کرداروں کی رفتہ رفتہ البتہ منظم رخصتی اس بات کی غماز ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں مسلمان کہاں پہنچ گیا ہے۔ پچاس اور ساٹھ کے عشرے میں مسلم کردار زیادہ تر بادشاہ، نواب اور جاگیردار ہوا کرتے تھے جن کی زبان شائستہ ہوتی تھی اور فلم میں موسیقی روح میں اتر جانے والی ہوا کرتی تھی۔ اس قسم کی فلموں سے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی ہوا کرتی تھی۔ ایسی ہی فلمیں مقبول ہوتی تھیں جن میں مرکزی کردار مسلم ہوتے تھے اور پورا ملک مسلمانوں کو ہندوستانی معاشرے کا جزو لاینفک سمجھتا تھا۔ تاہم جیسے ہی ہم ستر کے عشرے میں داخل ہوتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ بالی ووڈ فلموں کے مسلم کرداروں میں تبدیلی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسلم کردار جو یہ ہونے لگے اور تین گھنٹوں میں اُن کو حاشیے پر دھکیلا جانے لگا اور اب وہ فلمی پردے پر محض پچاس منٹ ہی نظر آنے لگے۔ جیسے ہی یہ جو یہ کردار پردے پر نظر آئے تو ناظرین یہ سمجھ جاتے تھے کہ اب مجرا، غزل یا قوالی ہونے کو ہے۔ مسلم معاشرہ قوالی اور مجرے کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ ستر اور اسّی کے عشرے کے آخر میں ایک کام یہ بھی ہوا کہ فلموں میں ممبئی کے انڈرورلڈ کردار سنیما کے پردے پر نظر آنے لگے جو اکثریت کے ساتھ مسلم ہوا کرتے تھے۔ عربی لباس میں ملبوس، سگار پیتے ہوئے اور بریف کیس لیے اسمگلر فلموں میں عمومی طور سے نظر آنے لگے۔

اگر بالی ووڈ پر یقین کریں تو عام مسلمان تو فلموں سے غائب ہی ہو گئے۔ اس طرح بالی ووڈ نے اسّی کے عشرے ہی سے مسلمان اور ان کے مذاہب کے تئیں مختلف انداز سے غور کرنا شروع کر دیا تھا کہ اسلام کا مطلب جہاد اور مسلمان کا مطلب دہشت گرد۔ دائیں بازو کے سیاسی ایجنڈے کے تحت بالی ووڈ کا رنگ روغن کیا جانے لگا اور نوے کے عشرے میں مسلم کرداروں کی منظرکشی میں نمایاں تبدیلی آنے لگی جہاں کشمیر۔ پاکستان اور مسلمان کے مابین علامتی تعلق ہونے لگا۔ ان فلموں میں ویلن ہندوستان مخالف کلمات ادا کرتا اور کشمیر کے لیے لڑنے کا عہد کرتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ یہ سبھی کردار بندوق بردار، داڑھی سے مزین، شلوار قمیض پہنے ہوئے اور کندھے پر ایک خاص قسم کا اسکارف رکھے ہوئے نظر آئے۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا نظر آتا تھا اور چہرے سے غصہ اور انتقام ٹپکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے برعکس ان کا آقا یعنی 'باس' ایک مولوی کی شکل میں نظر آتا ہے، سر پر ٹوپی ہاتھ میں رومال ہوگا۔ پہلے وہ کچھ عربی کے الفاظ ادا کرے گا پھر وہ ہندوستان کو تباہ کرنے والی بات کہے گا۔ زیادہ سے زیادہ روپیہ اور پیسہ کمانے کی لت میں بالی ووڈ نے خیالی مسلم کرداروں کو دہشت کی حد تک تشکیل دینا شروع کر دیا۔ اس طرح ناظرین نا چاہ کر بھی فلم ساز کا بیہودہ نظریہ قبول کرتے چلے گئے۔ اگر بالی ووڈ فلموں کی مانیں تو سبھی مسلمان ملک دشمن ہیں اور ان کے عقائد انتہا پسندانہ ہیں۔''

اس قسم کے خیالات فقط مجتبیٰ ہی کے نہیں ہیں بلکہ دیگر افراد کے بھی ہیں۔ یہ ایک نمایاں حقیقت ہے کہ ہندوستانی سنیما کے 40 سے 50 فیصد ناظرین مسلم ہوتے ہیں اگر اس کے آدھے بھی اس قسم کی فلمیں نہ دیکھیں تو فلم صنعت پر منفی اثر پڑے گا۔

اگر اس قسم کے سنگ وخشت کچھ کم لگ رہے ہوں تو کچھ اور بھی احمقانہ خیال برداشت کریں۔ ایک خیال

یہ بھی سامنے آیا ہے کہ مسلم معاشرے سے تعلق رکھنے والی فلموں کو 'Islamicate' جیسے فارم سے تعبیر کیا گیا جو کہ ہند۔امریکی دانشوار نہ خام خیالی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس خیال یا نظریے کے تحت کوئی بھی فلم خواہ وہ تاریخی، فنطاسی، سماجی یا مصالہ مسلم سوشل فلم ہو وہ اسلامیکیٹ فلم کے زمرے میں آتی ہے کیونکہ فلم کا اہم کردار اور معاشرہ مسلم ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ 'اُوئے لکی اُوئے' اور 'سنگھ از کنگ' دونوں ہی فلمیں سنیما کی ایک ایسی صنف سے تعلق رکھتے ہیں جس کو 'Khaliste' خالصتے کہا جائے کیونکہ اس فلم میں مرکزی کردار اور معاشرہ سکھ یا کھتری قسم کا ہے جن کو پنجابی کھتری بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ 'Khatriate' فلموں کی تعداد اسلامیکیٹ فلموں سے دوگنی سے بھی زیادہ ہے کیونکہ ہندی فلموں میں عام طور سے کھتری پنجابی کردار زیادہ نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم زیادہ تر فلموں میں 'بلے بلے' اور 'ماہی وی' جیسے الفاظ کثرت سے سنتے ہیں۔ اودھ کی گنگا، جمنی تہذیب کے مداحو! آپ کے لیے یہ رقت طلب مقام ہے کہ آپ اپنے ہی سنیما سے بے دخل کر دیے گئے۔

ایسے پرآشوب ماحول میں ابھی بھی بہت سی فلمیں ہیں جو ہر سال یا دوسرے سال امید کی کرن کے طور پر نظر آتی ہیں ان میں 'ڈور'، 'مسٹر اینڈ مسیز ایر'، 'عشقیہ'، 'شوریہ'، 'فراق'، 'روڈ ٹو سنگم' اور 'ویل ڈن ابا' اہم ہیں۔ تاریخ نویس منان احمد نے اپنے بلاگ اسپاٹ 'Chapati Mystery' 'چپاتی مسٹری' پر فلم 'عشقیہ' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''یہ فلم اس لیے بھی قابلِ دید ہے کہ اس میں نودولتیے وسطی درجے، ہندو رائٹس، ترقی پسند جنسی سیاست کا مزحکہ اڑایا گیا ہے۔ اس فلم کی جائے وقوع شمالی ہند ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ زیادہ تر مسلم کرداروں والی فلمیں اسلام کو ایک عجوبہ مذہب کی شکل میں پیش کر رہی ہیں جہاں اسلام دو قسم کے مسلمانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک اچھا مسلمان جو کہ ایک سیکولر ملک کی کامیابی کے لیے کام کر رہا ہے اور دوسرا جو کہ ملک کو اندھی تقلید کی جانب دھکیل رہا ہے۔ ایسے ماحول میں ایک ایسی مسلم کردار والی فلم آنا جس میں مذہب کی بنیاد پر تفریق پیدا کر کے سیاست نہ کی جائے ایک نیک شگون ہے۔ دھیان دینے کی بات یہ ہے کہ اس فلم نے باکس آفس پر بھی کامیابی دکھائی۔

میں اس قسم کے ریمارک سے اتفاق رکھتی ہوں اسی کے ساتھ کچھ اور بھی فلمیں ہیں جو کہ باکس آفس پر تو کچھ خاص نہیں کر سکیں البتہ موضوع اور مواد کے لحاظ سے اہم تھیں۔ 'شوریہ' ایک ہالی ووڈ فلم کی ریمیک ہے جس کا اثر زخم پر اندمال کی صورت ہے۔ البتہ یہ ان چند فلموں میں سے ایک ہے جو کشمیر میں عوام پر ہو رہے ظلم و جبر کا مسئلہ اٹھاتی ہے۔ اس فلم میں عوام کے خلاف سیکورٹی فورس میں پھیلی ہوئی حد درجہ بدگمانی کو بھی دکھایا گیا ہے اس کے علاوہ اس میں اداکاری بھی عمدہ ہے۔

نیز ایک اور فلم 'روڈ ٹو سنگم' ہے جس کو مسلم فرقے کے تئیں گاندھیانہ رویے کے لیے تعریف کی جاتی ہے۔

"ذرا ہم پاکستان سازی کے منصوبے کے اثرات پرغیر جذباتی طور سے غور کریں کہ اس کے نتائج کیا کیا ہوں گے۔ ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہو جائے گا ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی تو دوسرے میں ہندؤں کی۔ ہندوستانی ملک میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان ایک معمولی اقلیت کے طور پر جا بجا بکھرے ہوں گے۔ وہ ہندو اکثریتی صوبوں میں آج کی بہ نسبت اور بھی زیادہ کمزور ہوجائیں گے۔ وہ ان خطوں میں گزشتہ ایک ہزار سال سے آباد ہیں اور انہوں نے یہاں ایک مقبول عام مسلم معاشرے اور تمدن کی آبیاری کی ہے۔ ان کو جلد ہی یہ احساس ہو جائے گا کہ وہ خارجی اور بے گانے ہو چکے ہیں۔ اقتصادی، علمی اور صنعتی طور سے پسماندہ مسلمان اب خالص ہندو راج کے رحم و کرم پر رہیں گے۔"

مجھے ذاتی طور سے 'روڈ ٹو سنگم' ہدایت کاری کے نظریے سے تھوڑا انجماد پذیر لگی البتہ آج کل کی فلموں میں مسلم معاشرے کی عکاسی جس منفی ڈھنگ سے ہوتی ہے اس سے تو بہتر ہی ہے۔

'مسٹر اینڈ مسیز ایر' اور 'ڈور' جیسی فلمیں عام لوگوں کی داستاں غیر معمولی انداز میں بیان کرتی ہیں جو مسلمانوں کو 'غیر' سمجھنے کے رویے میں انحراف کا پتہ دیتی ہیں۔ ایسی فلموں میں 'فراق'، 'پرزانیہ' اور 'بلیک فرائیڈے' کے برعکس خامشی بہت ہی کامیابی کے ساتھ ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں کہ فلم ساز براہِ راست فرقہ وارانہ تشدد کے موضوع کو کھنگالتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن ہر اندھیرے کے آخر میں روشنی کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ سنجنا شرما اپنے مضمون 'The new Bollywood Muslim' میں تحریر فرماتی ہیں کہ

''آخر میں اب وہ زوال پذیر نواب، مافیا، غنڈہ یا جہادی نہیں رہا۔ اس ہفتے کی تین بڑی فلمیں 'نیویارک'، 'قربان'، 'مائی نیم از خان' کے ذریعے ہندی سنیما میں مسلمانوں کی کردار کشی اب نئے ڈھنگ سے کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان تینوں ہی فلم کے پلاٹ کا محور شہروں میں رہنے والا مسلمان ہے۔ وہ متاثرہ یا خاطی نہیں ہے بلکہ ایک رومانی ہیرو ہے جو کہ حالات سے برد آزما ہے۔ وہ کردار نگاری کے نقطے سے نہیں بلکہ پلاٹ کے لحاظ سے مسلم ہیں۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ تین بڑی فلموں کی جائے وقوع امریکہ یا نیو یارک ہے بلکہ 11 ستمبر 2001 کے حملے سے سنیما بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جس کے تناظر میں دنیا کے سامنے نسل پرستی کا بھی معاملہ ابھر کر سامنے آیا۔ ہندوستانی فلم سازوں نے اس واقعے کو سات سال کے بعد اپنے یہاں جگہ دی۔ اسی موضوع پر ایک پاکستانی فلم 'خدا کے لیے' 2007 بنی ہے جہاں مقامی اور عالمی معاملات باہم ہیں جس کا پس منظر 11 ستمبر 2001 کے بعد کی دنیا ہے۔ نیویارک کی ہی طرح یہ فلم بھی مسلمانوں کی غیر قانونی حراست کے موضوع سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ اس فلم میں پاکستانی معاشرے سے متعلق ریاکاری، بدگمانی اور پسماندگی کو بھی دکھایا گیا ہے۔ نصیرالدین شاہ جنھوں نے اس میں ایک خاص رول ادا کیا ہے، کا کہنا ہے کہ 'میں نے اس فلم میں کام کرنے کے لیے اس لیے حامی بھری کیونکہ مجھے جو رول دیا گیا تھا وہ ایک ایسے مسلم مولوی کا تھا جو بنیاد پرست اسلام کے خلاف تھا۔ اس سے ایک اہم بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اسلام تحمل اور انسانیت سے متعلق ہے۔''

مجتبیٰ کا خیال ہے کہ اگرچہ آج کل کے فلم ساز مسلم معاشرے سے متعلق لکیر کے فقیر والے رویے سے کافی غیر متفق ہیں اور وہ حتی الامکان درگزر کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہندوستانی سنیما کو ابھی بڑا لمبا سفر طے کرنا ہے۔ ہندوستان میں بہت سی فلموں نے فرقہ پرستی کو رد کیا ہے البتہ اہم دھارے کے سنیما میں وہ قوت ہے کہ وہ عوام کی فکر میں تبدیلی پیدا کر سکتی ہے کیونکہ اس کی رسائی دور دراز تک ہے۔

■

Muntazir Qaimi, Room No 123 E Maha Nadi Hostel JNU, New Delhi - 110067

انیس امروہوی

ہندوستانی سنیما اور اردو ادب

ہندوستان میں جدید سنیما کا ارتقا لگ بھگ اُسی دور میں تیزی سے ہو رہا تھا جب اردو ادب میں ترقی پسند رجحانات تیزی سے داخل ہو رہے تھے اور یہی وہ دور بھی تھا جب ہندوستانی سیاست میں تحریک آزادی کی لہر شدت اختیار کر رہی تھی۔ 1931 میں ہندوستانی سنیما نے خاموشی کے دور سے نکل کر آواز کی دنیا میں قدم رکھا اور فلموں کے کرداروں نے سیدھے طور پر مکالمہ شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی 1936 سے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہو گیا اور بڑی تعداد میں ادیب، شاعر اور دانشور اس تحریک سے متاثر ہوتے گئے۔ 1942 سے گاندھی جی نے ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے اپنی لڑائی تیز کر دی اور ''انگریزو! بھارت چھوڑو'' کا نعرہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اردو کے اس نعرہ ''انقلاب زندہ باد'' سے پورے ہندوستان کا ماحول گرم ہو چلا تھا۔ یہ بڑا ہی پُر آشوب زمانہ تھا، لہٰذا ہندوستانی سنیما تحریک آزادی اور ترقی پسند تحریک دونوں سے ایک ہی وقت میں متاثر ہو رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کہانی کار، نغمہ نگار اور فلمساز و ہدایت کار لگاتار فلم انڈسٹری سے جڑتے جا رہے تھے۔ منشی پریم چند، خواجہ احمد عباس، نجم نقوی، سعادت حسن منٹو، کمال امروہی، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، وشوامترا عادل، قمر جلال آبادی، نخشب جارچوی، راجہ مہدی علی خاں، راجندر سنگھ بیدی، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر، سردار جعفری، عصمت چغتائی، پرتھوی راج کپور، اختر الایمان، راجندر کرشن، صبا افغانی، کیفی اعظمی، حسرت جے پوری، ساگر سرحدی، ضیا سرحدی، اور رامانند ساگر وغیرہ کتنے ہی اہم نام ہیں جو یکے بعد دیگرے فلموں سے وابستہ ہوتے چلے گئے اور یہی وہ لوگ تھے جو اردو ادب میں بھی ترقی پسند رجحانات کے ساتھ اپنی بہترین تخلیقات پیش کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1936 سے لے کر 1975 تک ہندوستانی سنیما نے اپنا ایک عہد زریں تاریخ کے صفحات پر رقم کر دیا۔ اسی زمانے میں ایک سے ایک بہترین کہانی فلم انڈسٹری کو ملی، اور فلمی نغموں کا تو انبار لگ گیا جو ہر لحاظ سے اعلیٰ درجے کے تھے اور مقبول ترین تھے اور جو آج بھی دل کے تاروں کو جھنجھنا دیتے ہیں۔ یہی حال فلمی مکالموں کا بھی تھا کہ اردو ادیبوں کے لکھے مکالمے نہ صرف بہت پُر اثر ہوتے تھے بلکہ تا دیر یاد رہتے تھے اور بعض اوقات تو ضرب المثل بن جاتے تھے۔ جیسے فلم ''وقت'' کا راج کمار کے ذریعے ادا کیا گیا مکالمہ...... ''جن کے گھر شیشوں کے ہوں، وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے۔'' اسی طرح فلم مغل اعظم'' میں پرتھوی راج کپور کا مکالمہ...... ''بہ خدا ہم محبت کے دشمن نہیں، اپنے اصولوں کے غلام ہیں۔'' اسی طرح فلم 'میرے حضور' کا مکالمہ جو اداکار راج کمار نے ادا کیا تھا، آج بھی لوگوں کے ذہن میں گونجتا ہے...... ''لکھنؤ میں ایسی کون سی فردوس ہے، جسے ہم نہیں جانتے۔'' فلم 'پاکیزہ' میں راج کمار کا ادا کیا ہوا مکالمہ...... ''آپ کے پاؤں دیکھے، بہت حسین ہیں۔ انھیں زمین پر مت اُتاریے گا، میلے ہو جائیں گے۔'' یہ اور اس طرح کے بے شمار اردو کے مکالمے آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں اور یاد کیے جاتے ہیں۔

ہندوستانی سنیما میں اردو ادب کے حوالے سے اگر ہم فلمی نغمہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لیں تو اس کے لیے الگ سے ایک کتاب کی ضرورت ہوگی۔ اردو ادب سے وابستہ کئی بڑے بڑے شاعروں نے ہندوستانی فلموں کو بے حد معیاری اور مقبول ترین گیت دیے ہیں۔ ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر، راجندر کشن، مجروح سلطانپوری، کیف بھوپالی، اسد بھوپالی، ایس ایچ بہاری، حسرت جے پوری، راجہ مہدی علی خاں، قمر جلال آبادی وغیرہ ایسے چند نام یہاں درج کرنا کافی ہوگا جنھوں نے فلمی نغمہ نگاری میں بھی اردو ادب کا معیار برقرار رکھا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے تو اپنی تمام تر ادبی شاعری کو فلموں میں استعمال کیا ہے اور ان کی نغمہ نگاری سے فلموں کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ انھوں نے 'گمراہ' یا 'پیاسا' فلموں کے لیے جب اپنی نظموں کا استعمال کیا تو حسب ضرورت کہیں کہیں ایک دو الفاظ کا ردو بدل کر دیا ہو۔

ہندوستانی سنیما سے اردو کے تعلق کا جب بھی ذکر کیا جائے گا، نئے اردو افسانے کے باوا آدم منشی پریم چند کا نام سب سے پہلے لیا جائے گا۔ منشی پریم چند جون 1934 میں بنارس سے بمبئی چلے گئے اور وہاں کسی فلم کمپنی سے آٹھ ہزار روپے سالانہ کے معاہدے پر فلمی کہانیاں لکھنے کا کام شروع کیا۔ اسی برس ان کے ناول سیوا سدن پر سب سے پہلے 'بازار حسن' کے نام سے فلم بنی۔ فلم 'بازار حسن' میں اداکارہ زبیدہ، جدن بائی اور فاطمہ بائی اور اداکار

فلم پاکیزہ کا یاد گار ڈائلوگ "آپ کے پاؤں دیکھے" کا ایک منظر

ساہو مودک نے کردار ادا کیے تھے۔ اس کے بعد پریم چند کی لکھی کہانی پر فلم 'غریب مزدور' بنی جس میں خود منشی پریم چند نے بھی ایک کردار ادا کیا تھا۔ اس کے بعد پریم چند بمبئی ٹاکیز سے وابستہ ہو گئے۔ 1941 میں منشی پریم چند کی اردو کہانی 'عورت کی فطرت' (تریا چرتر) پر فلم بنی اور فلم کا نام 'سوامی' رکھا گیا۔ اس فلم کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے اور ستارہ دیوی اور جے راج نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ 1946 میں منشی پریم چند کے ناول 'چوگان ہستی' پر ہدایت کار موہن بھونانی نے 'رنگ بھومی' کے نام سے فلم بنائی۔ یہ اداکارہ نگار سلطانہ کی پہلی فلم تھی۔ 1959 میں ان کی کہانی 'دو بیلوں کی کتھا' پر ہدایت کار کرشن چوپڑہ نے فلم بنائی تھی، جس کا نام 'ہیرا موتی' رکھا گیا تھا۔ ایک زمانے میں بمبئی ٹاکیز کی روح رواں اداکارہ دیویکا رانی نے منشی پریم چند کے ناول 'گئودان' پر فلم بنانے کا ارادہ کیا تھا مگر ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بعد میں ہدایتکار ترلوک جیٹلی نے 1964 میں فلم 'گئودان' بنائی، جس میں اداکار راج کمار اور کامنی کوشل کے علاوہ ششی کلا، محمود، شوبھا کھوٹے وغیرہ نے کردار ادا کیے تھے۔

1966 میں منشی پریم چند کے مشہور زمانہ ناول 'غبن' پر ہدایت کار کرشن چوپڑہ نے کام شروع کیا مگر ان کے انتقال کی وجہ سے یہ کام رک گیا۔ بعد میں ایڈیٹر، ڈائریکٹر رشی کیش مکرجی کے تعاون سے یہ فلم مکمل ہوئی۔ سنیل دت، سادھنا، کنہیا لال اور لیلا مصرا، انور حسین اور آغا وغیرہ نے اس فلم میں کردار ادا کیے تھے۔ بدری پرساد اور پی کیلاش نے بھی اپنے کردار عمدگی سے ادا کیے تھے۔

بچوں کے لیے چلڈرن فلم سوسائٹی نے پریم چند کی کہانی 'عیدگاہ' پر ایک فلم 'عید مبارک' کے نام سے بنائی تھی۔ اس کے علاوہ ایک فلم 'کتے کی کہانی' بھی اسی سوسائٹی نے بنائی تھی۔ ایک اور فلم 'سیلانی بندر' بھی پریم چند کی کہانی پر بنی تھی۔

منشی جی کی کہانی 'شطرنج کے کھلاڑی' پر مشہور فلمساز وہدایت کار ستیہ جیت رے نے جو فلم بنائی ہے، منشی پریم چند کی کئی کہانیوں پر بنی فلموں میں سب سے عمدہ اور مقبول ترین فلم ہے۔ جس میں سنجیو کمار، سعید جعفری، شبانہ اعظمی اور فریدہ جلال نے مرکزی کردار ادا کیے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کے حوالے سے منشی پریم چند کا نام فلموں سے وابستہ رہا۔ یوں تو شروع سے ہی اردو زبان و ادب کا گہرا تعلق ہندوستانی سنیما سے رہا ہے لیکن اس میں ایک سب سے بڑا نام امتیاز علی تاج کا بھی رہا ہے۔ ان کے مشہور زمانہ ڈرامے 'انارکلی' پر اپنے زمانے کی مشہور اور کامیاب فلم 1953 میں بنی جس میں پردیپ کمار، بینا رائے، نور جہاں، سلوچنا وغیرہ نے مرکزی کردار ادا کیے۔ فلم کے لیے یہ موضوع اتنا مناسب تھا کہ 1951 میں کمال امروہی نے بھی مینا کماری کو ہیروئن کے طور پر انارکلی بنانے کا خواب دیکھا تھا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بعد ازاں اسی موضوع کو بڑے پیمانے پر دھانسو ہدایت کار کے آصف نے 'مغل اعظم' کے نام سے 1960 میں پیش کیا تھا۔ یہ ایک زبردست کامیاب اور بہترین فلم تھی جس نے اپنے زمانے میں کئی ریکارڈ قائم کیے۔ حالانکہ اس فلم کو اردو کے بجائے ہندوستانی زبان کی فلم کا سنسر سرٹیفکیٹ دیا گیا۔

> ہندوستانی سنیما سے اردو کے تعلق کا جب بھی ذکر کیا جائے گا، نئے اردو افسانے کے باوا آدم منشی پریم چند کا نام سب سے پہلے لیا جائے گا۔ منشی پریم چند جون 1934 میں بنارس سے بمبئی چلے گئے اور وہاں کسی فلم کمپنی سے آٹھ ہزار روپے سالانہ کے معاہدے پر فلمی کہانیاں لکھنے کا کام شروع کیا۔ اسی برس ان کے ناول سیوا سدن پر سب سے پہلے 'بازار حسن' کے نام سے فلم بنی۔ فلم 'بازار حسن' میں اداکارہ زبیدہ، جدن بائی اور فاطمہ بائی اور اداکار ساھو مودك نے كردار ادا كیے تھے۔

ہندوستانی سنیما پر اردو ادب کے اثرات اس بات سے بھی خوب نمایاں ہوتے ہیں کہ اردو کے کئی شاہکار ناول یا کہانیوں پر فلمیں بنائی گئی ہیں۔ 1966 میں فلمساز ہنس چودھری نے شوکت تھانوی کے ناول 'اُلٹی گنگا' پر مبنی فلم 'نیند ہمارے خواب تمھارے' بنائی تھی جس میں ششی کپور، نندہ، بلراج ساہنی اور اوم پرکاش نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم اپنے گانوں کی مقبولیت کی وجہ سے بھی کافی کامیاب رہی تھی۔

اردو کا سب سے پہلا مکمل سماجی ناول 'امراؤ جان ادا' کو مانا جاتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا لکھنوی کے اس ناول پر سب سے پہلے 1981 میں فلمساز ہدایت کار مظفر علی نے ایک عمدہ فلم بنائی اور اس زمانے کے لکھنؤ کے نوابی اور ادبی ماحول کو کامیابی سے پیش کیا۔ اس فلم میں ریکھا نے امراؤ جان کے کردار میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے جان ڈال دی ہے۔ فلم کے نغمے، موسیقی اور کاسٹیوم وغیرہ سب عمدہ ہیں۔ خاص طور پر شوکت کیفی، فاروق شیخ، نصیرالدین شاہ، گجانن جاگیردار اور لیلا مصرا کی عمدہ اداکاری نے فلم کے مناظر کو حقیقت کے بے حد قریب محسوس کرایا ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس فلم کو، جو اردو کے پہلے مکمل سماجی ناول پر مبنی ہے، ہندی فلم کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اسی ناول پر فلمساز وہدایت کار جے پی دتہ نے اداکارہ ایشوریہ رائے اور ابھیشیک بچن کو مرکزی کرداروں میں لے کر فلم 'امراؤ جان' بنائی مگر یہ فلم مظفر علی کی فلم کا مقابلہ نہ کر سکی۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ ناول 'امراؤ جان ادا' کے بارے میں، مشہور فلمساز وہدایت کار کمال امروہی بھی اس ناول سے متاثر رہے ہوں گے۔ ادبی، علمی گھرانے سے تعلق رکھنے والے کمال امروہی نے ضرور بہت پہلے ہی یہ ناول پڑھ لیا ہوگا اور ان کے ذہن پر اس ناول نے اپنا اثر چھوڑا ہوگا۔ کیونکہ فلم 'پاکیزہ' کا مرکزی خیال بھی وہی ہے جو امراؤ جان کا ہے۔ وہی اس کردار کا بار بار اپنے دم گھٹنے والے ماحول سے فرار اور حالات سے مجبور ہو کر اس کی واپسی۔ مگر کمال امروہی ذہین آدمی تھے، لہٰذا انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اس مرکزی خیال میں شہاب الدین ولد وہاب الدین اور ان کی شاندار حویلی اور اس خاندان کے ترقی پسند نوجوان فاریسٹ آفیسر سلیم خان (راج کمار) کو شامل کر دیا اور اپنی طرف سے چند اتفاقات پر مبنی ایک نئی کہانی بُن لی۔ حالانکہ وہ امراؤ جان کے کوٹھے پر آنے والے ٹھیکے دار کو فراموش نہ کر سکے جس کو فلم کا ہیرو گولی مار دیتا ہے۔ اس سین کو بھی انھوں نے بڑے خوبصورت انداز میں مجرے کے دوران نواب آف پانی پت کے ذریعے ٹھیکے دار کے بے ادبی کرنے کی پاداش میں گولی چلوا کر زخمی کرا دیا۔ بہرحال خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک نہایت حسین، خوشگوار اور

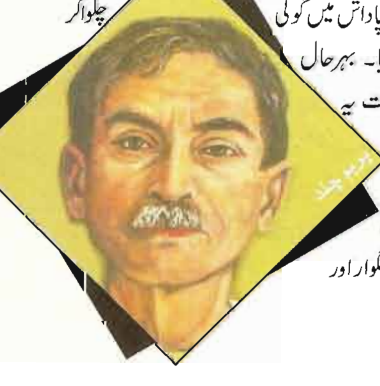

مقبول ترین فلم بنائی۔ اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ فلم 'پاکیزہ' کا سنسر سرٹیفکیٹ اردو فلم کا لیا گیا ہے۔

خواجہ احمد عباس کا تعلق بھی اردو ادب سے رہا ہے۔ وہ ایک زمانے میں ہمانشو رائے کی فلم کمپنی بمبئی ٹاکیز میں فلم پبلی سٹی کے انچارج ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی کئی یادگار فلمیں ہندوستانی سنیما کو دی ہیں۔ ان کی کہانی پر بمبئی ٹاکیز نے سب سے پہلے فلم 'نیا سنسار' بنائی تھی۔ انھوں نے خود اپنی ہدایت میں سب سے پہلی فلم 'دھرتی کے لال' بنائی، جو 1945 میں نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ عباس صاحب نے اس کے علاوہ بھی کئی فلمیں خود بنائیں جو کامیاب نہ ہو سکیں۔ مگر جو فلمیں انھوں نے راج کپور کے لیے لکھیں، وہ بے حد کامیاب ہوئیں۔ اسی طرح کرشن چندر اردو کے ادیب تھے اور پوری طرح فلموں سے وابستہ تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے فلم 'من کی جیت' کی کہانی لکھی تھی، جس کی ہدایت ڈبلیو زیڈ احمد نے دی تھی اور جوش ملیح آبادی نے گانے لکھے تھے۔ شیام اور نینا نے فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ شالیمار پکچرس کی یہ فلم 1945 میں نمائش کے لیے پیش ہوئی تھی۔ اس کے بعد کرشن چندر نے بہت سی فلموں کی کہانیاں، منظرنامے اور مکالمے لکھے۔ کرشن چندر یکساں طور پر اردو ادب اور ہندوستانی سنیما میں مقبول رہے۔

اردو ادب کے حوالے سے ایک بہت اہم نام راجندر سنگھ بیدی کا بھی ہے۔ انھوں نے کئی فلموں کی کہانیاں، منظرنامے اور مکالمے لکھے اور خود بھی کئی فلمیں بنائیں، جن میں 'دستک' کافی مقبول ہوئی۔ اس فلم میں سنجیو کمار اور اداکارہ ریحانہ سلطان نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کے ہیرو ہیروئن کو نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا تھا، اور موسیقار مدن موہن کو بہترین موسیقار کے اعزاز سے نوازا گیا۔ راجندر سنگھ بیدی کو اس فلم کی نمائش کے بعد ہی پدم شری سے حکومت ہند نے نوازا تھا۔ 'دستک' کے بعد 'پھاگن' اور 'آنکھن دیکھی، اپنی دھرتی اپنا دیش، نواب صاحب' وغیرہ فلمیں بنائیں۔ فلم 'مرزا غالب' کی کہانی سعادت حسن منٹو نے تحریر کی تھی مگر درمیان میں ہی منٹو نے پاکستان کی طرف ہجرت کی تو راجندر سنگھ بیدی نے نہ صرف کہانی اور منظرنامے مکمل کرائے بلکہ فلم 'مرزا غالب' کے مکالمے بھی لکھے۔ اس کے علاوہ دلیپ کمار کی 'دیوداس' اور 'مدھومتی'، دھرمیندر کی 'انوپما'، بلراج ساہنی کی 'انورادھا'، دھرمیندر کی ستیہ کام وغیرہ میں بھی راجندر سنگھ بیدی نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کا مختصر ناول 'ایک چادر میلی سی' بہت مقبول رہا ہے۔ یہ ناول فلمساز و ہدایت کار کمال امروہی کو بھی بہت پسند تھا۔ بیدی کے انتقال کے بعد ان کے اس ناول پر 1986 میں ہدایت کار سکھونت دادا نے ہیما مالنی، رشی کپور اور کل بھوشن کھربندہ کو لے کر ایک اچھی فلم بنائی تھی۔ پاکستان میں بھی اداکارہ سنگیتا نے بیدی کے اس ناول 'ایک چادر میلی سی' پر فلم بنائی تھی۔ بیدی کی کہانی 'گرم کوٹ' پر بھی ایک عمدہ فلم بنائی گئی۔

مرزا غالب اردو زبان وادب کے عالمی شہرت یافتہ شاعر رہے ہیں۔ غالب کی زندگی کے واقعات اور ان کے خطوط کی مدد سے مشہور زمانہ فلمساز و ہدایت کار سہراب مودی نے 1954 میں 'مرزا غالب' نام سے فلم بنائی جو بے حد کامیاب ہوئی۔ ثریا اور بھارت بھوشن نے مرکزی کردار ادا کیے تھے اور اس فلم کی غزلیں بے حد مقبول ہوئی تھیں۔ اس فلم کی کہانی سعادت حسن منٹو اور مکالمے راجندر سنگھ بیدی نے تحریر کیے تھے۔

امرتا پریتم حالانکہ پنجابی زبان کی شاعرہ تھیں مگر ان کی تقریباً تمام تخلیقات اردو زبان میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ امرتا پریتم کا ناول 'پنجر' بھی اردو میں شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔ اس ناول پر بھی بڑی خوبصورت فلم 'پنجر' ہماری ہندوستانی فلم انڈسٹری میں 2003 میں بنی ہے۔ اس فلم میں منوج باجپائی اور اُرمیلا ماتونڈکر نے مرکزی کردار ادا کیے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان وادب نے ہندوستانی سنیما کے ذریعے ہمارے پورے معاشرے پر کافی مثبت اثرات مرتب کیے ہیں۔ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ جہاں دلوں کی تقسیم ہوئی ہے، وہیں اردو زبان کو ایک سازش کے تحت ایک بڑے طبقے نے صرف مسلمانوں کی زبان کا عنوان دے دیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اردو کے خلاف سازشوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ایسی بہت سی فلموں کو اردو کا فلم سنسر سٹرفکیٹ نہیں دیا گیا جن کی زبان اردو تھی۔ حالانکہ ستر کی دہائی سے قبل کسی بھی فلم کا پوسٹر ایسا نہ ہوتا تھا جس میں فلم کا نام اردو میں لکھا ہوا نہ ہوتا ہو، اور فلم کے ٹائٹلز میں اردو میں فلم کا نام نہ جاتا ہو۔ ہمارے ملک میں بہت سی صوبائی زبانوں کی فلمیں بھی بنتی ہیں اور ان کا سٹرفکیٹ صوبائی زبان کا ہی ہوتا ہے، جیسے تمل، ملیالم، پنجابی، گجراتی، بنگالی اور بھوجپوری وغیرہ۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کی ایک سب سے بڑی وجہ اردو زبان کے نغمے اور مکالمے ہونے کے باوجود اردو زبان کی فلمیں یہاں نہیں ہوتیں، سوائے چند باہمت وبا حوصلہ فلمسازوں کے، جنھوں نے اپنی فلموں کے سرٹیفکیٹ اردو زبان کے حاصل کیے ہیں۔

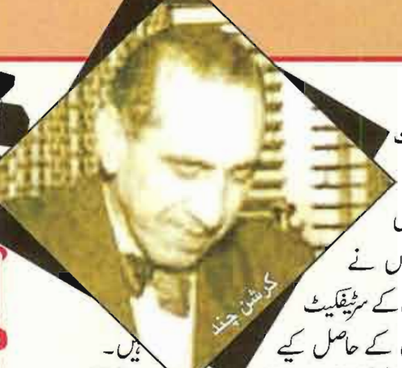

مظفر علی کی مشہور و مقبول فلم 'امراؤ جان' کو بھی ہندی فلم کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ فلم مرزا رسوا کے اردو کے تقریباً پہلے مکمل سماجی ناول 'امراؤ جان ادا' کی کہانی پر مبنی ہے۔ اگر ہندوستانی سنیما کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو جذبات کی عکاسی، کردار کی پختگی، فلمی نغموں کا سرور، مکالموں کا جادو، جو ہمارے معاشرے کے سر چڑھ کر بولتا ہے، اس کی وجہ صرف اور صرف اردو زبان ہی ہے۔ ہماری تاریخ ساز کامیاب اور مقبول ترین فلمیں مغل اعظم، انارکلی، پکار، مرزا غالب، تاج محل، جنون، شطرنج کے کھلاڑی، غزل، لیلیٰ مجنوں، چودھویں کا چاند، نور جہاں، جہاں آرا، رضیہ سلطان، پاکیزہ، میرے محبوب، صاحب بیوی اور غلام، بازار اور 'میرے حضور' وغیرہ سیکڑوں فلموں کی زبان اردو ہی ہے۔ ان تمام فلموں کے بے شمار نغمے، غزلیں اور قوالیاں آج بھی عوام و خواص میں بے حد مقبول ہیں۔ اسی طرح کئی فلموں کے مکالمے جو ہمارے معاشرے میں زبان زد خاص و عام ہیں، وہ بھی اردو کے ہی مکالمے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ہمارے ہندوستانی مخلوط معاشرے میں جو زبان اردو یا ہندوستانی کے نام سے استعمال ہو رہی ہے، اس کو قائم رکھنے میں ہماری فلموں کا بہت زیادہ دخل رہا ہے۔ مگر افسوس اسی بات کا ہے کہ اس کا تمام تر کریڈٹ دوسری زبانوں کو چلا جاتا ہے۔ آج تمام تر فلمساز اپنے تجارتی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی فلموں کے سرٹیفکیٹ دوسری زبانوں کے بنواتے ہیں، جبکہ ان فلموں کی زبان، ان کے مکالمے اور نغمے سب اردو میں ہوتے ہیں۔ اس طرح اردو کے کھاتے میں اُتنی فلمیں بھی نہیں آتیں جتنی کسی ایک صوبائی زبان کے کھاتے میں آجاتی ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی معیاری فلم جیسے 'محافظ' یا 'نسیم' بن بھی جاتی ہے تو وہ اُتنے ناظرین بھی اکٹھے نہیں کر پاتی جتنے کوئی دوسری اول جلول فلم آسانی سے بھیڑ جمع کر لیتی ہے۔ ہندوستانی سنیما کے سو برس مکمل ہونے پر ہمیں اس بات پر ضرور غور کرنا چاہیے کہ فلموں میں زبان کے تعلق سے اردو کی حق تلفی نہ ہو۔

□

ANEES AMROHVI ,54-C/5, J - EXTENSION
LAXMI NAGAR, DELHI - 110092

ہندوستانی سینما اور اردو فکشن

رضوان الحق

ہندوستان میں فلموں کا سنگ بنیاد دادا صاحب پھالکے نے اب سے سوسال قبل رکھا تھا، اس وقت ان کے پیش نظر کوئی سماجی مقصد یا فکر وفن کا اظہار نہ تھا بلکہ انھوں نے مسیح پر ایک فلم دیکھی تھی اور چاہتے تھے کہ وہ ہندوؤں کی دیوی دیوتاؤں اور اساطیر کو بھی اسی طرح پیش کریں۔ انھوں نے جو پہلی فلم راجہ ہریش چندر بنائی وہ ہندوؤں کے ایک اساطیری کردار ہریش چندر پر مبنی تھی۔ لیکن پھالکے جب ایک بار اس نئے میڈیا سے وابستہ ہو گئے تو انھوں نے جنون کی حد تک طرز اظہار کے اس نئے میڈیا کی آبیاری کی۔ راجہ ہریش چندر کے بعد خاموش فلموں کے دور میں کافی حد تک مذہبی اور اساطیری فلمیں غالب رہیں۔ لیکن جلد ہی ایک اور روایت کی شروعات ہوئی، یہ نئی روایت خاموش فلموں پر پارسی تھیٹر کے اثرات کی تھی۔ پارسی تھیٹر نے شروع میں اپنے کچھ ڈراموں کو ہی شوٹ کر کے انھیں تھیٹر ہال میں دکھایا۔ لیکن پارسی تھیٹر کا اصل جادو آواز سے ہی جاگتا تھا، اس کے بغیر خاموش فلمیں بہت کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خاموش فلمیں پارسی تھیٹر کے ڈراموں کے آگے پھیکی ہی رہیں۔ آخر کار تکنیک نے ترقی کی اور پارسی تھیٹر کے فلمی روپ کو آردشیر ایرانی آواز دینے میں کامیاب ہو گئے۔

آردشیر ایرانی نے 1931 میں پہلی کلامیہ فلم 'عالم آرا' بنائی تو یہ فلم جوزف ڈیوڈ کے ایک اردو ڈراما 'عالم آرا' پر مبنی تھی۔ اس کے بارے میں پریم پال اشک لکھتے ہیں:

''14 مارچ 1931 کو امپیریل فلم کمپنی کے جھنڈے تلے اور خان بہادر آردشیر ایرانی کی زیر ہدایت ریلیز ہونے والی اولین متکلم فلم ''عالم آرا'' ہماری پہلی اردو فلم تھی...... عالم آرا اپنے زمانے کے نامور ڈراما نگار جوزف ڈیوڈ کے اردو ڈرامے عالم آرا ہی پر مبنی تھی۔''

(پریم پال اشک، ہندستانی سینما کے پچاس سال، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2، ص 140-139)

یہ ڈراما جوزف ڈیوڈ نے پارسی تھیٹر کے لیے لکھا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ تصویریں بولتی کیسے ہیں؟ اور وہ بھی اتنی نفیس اردو میں اس لیے لوگ اسے دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اس فلم کی کامیابی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فلم 40 ہزار روپے میں تیار ہوئی تھی اور اس سے 20 لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔ ہندوستان کی دوسری کلامیہ فلم شیریں فرہاد تھی اسے مدن تھیٹرز نے بنایا تھا اور اسے لکھا تھا آغا حشر کاشمیری نے۔ شیریں فرہاد بھی اردو کی مشہور داستان پر مبنی تھی۔ یہ فلم عالم آرا سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ آغا حشر نے متکلم فلموں کے آغاز کے بعد اپنی مختصر زندگی میں کئی فلموں کی اسکرپٹ لکھیں جو بہت کامیاب رہیں۔ انھوں نے خود بھی ایک فلم شروع کر دی تھی، شوٹنگ کی ریہرسل چل رہی تھی کہ اسی دوران ان کا انتقال ہو گیا (1935) لیکن ان کے ڈراموں پر فلمیں بننے کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے ڈراموں پر دس فلمیں بنیں جن میں سب سے اہم ڈراما یہودی کی لڑکی ہے جس پر تین فلمیں بنیں۔ سب سے پہلے بی این سرکار نے اسی نام سے فلم بنائی، اس کے بعد بمل رائے نے یہودی کے نام سے اور آخر میں اس پر یہودی کی بیٹی کے نام سے فلم بنی۔ اس کے علاوہ ان کے جن ڈراموں پر فلمیں بنیں ان میں رستم سہراب، صید ہوس، بلوا منگل، خوبصورت بلا، سلور کنگ، سیتا بنواس اور آنکھ کا نشہ شامل ہیں۔

ہندستان کی ان دو اولین کلامیہ فلموں کی اس غیر معمولی کامیابی نے فلموں کا مقدر طے کر دیا۔ اسی کے ساتھ پارسی تھیٹر کا بھی زوال شروع ہو گیا اور پارسی تھیٹر کی بیشتر شخصیات نے فلموں کی طرف رخ کیا۔ آغا حشر کاشمیری، پرتھوی راج کپور اور سہراب مودی جیسی پارسی تھیٹر کی قد آور شخصیات فلموں سے منسلک ہو گئیں۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ہماری ابتدائی فلموں پر پارسی تھیٹر غالب ہو گیا۔ مکالمے ادا کرنے کا انداز، بات بات پر شعر پڑھنا، نغموں کی شمولیت، رقص وموسیقی اور سب سے اہم نفیس اور رواں اردو زبان کا استعمال۔ کچھ اثرات تو بعد میں معدوم ہو گئے لیکن پارسی تھیٹر کے کچھ اثرات تو آج بھی پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر فلمی نغمے جو دراصل پارسی تھیٹر کی ہی دین ہیں لیکن یہ روایت آج بھی جاری ہے۔ اس دور کی فلمیں ایک طرح سے پارسی تھیٹر کی ہی تکنیکی توسیع بن گئیں۔

اردو فکشن اور ہندستانی سینما کا دوسرا سب سے اہم موڑ اس وقت آیا جب 1934 میں پریم چند اجنتا سنیٹون کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت فلموں کی اسکرپٹ لکھنے ممبئی پہنچے۔ ایک سال سے بھی کم عرصے تک پریم چند فلموں سے وابستہ رہے اس دوران انھوں نے مل مزدور (غریب مزدور) اور نوجیون فلموں کی اسکرپٹ براہ راست فلموں کے لیے لکھیں اور ان کے ناول بازار حسن پر ان کی حیات میں ہی فلم ریلیز ہو گئی تھی۔ لیکن فلموں میں

پریم چند کا تجربہ بہت تلخ رہا، وہ صرف پیسے کمانے کے لیے فلموں سے منسلک نہیں ہوئے تھے۔فلموں سے اپنی وابستگی کے مقصد کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

''ادب شاعری اور دوسرے فنون کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ آدمی میں جو بہیمیت ہے اسے مٹا کر اس کی ملکوتی صفات کو جگایا جائے، اس کے ادنیٰ جذبات کو دبا کر یا مٹا کر لطیف، نرم و نازک اور پاکیزہ جذبات کو بیدار کیا جائے ...... اگر سنیما اسی آدرش کو سامنے رکھ کر تصویریں پیش کرتا تو آج وہ دنیا کو آگے بڑھانے میں سب سے موثر طاقت ثابت ہوتا۔''

(پروفیسر قمر رئیس (مرتبہ)، منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2)

پریم چند ایک وسیع حلقے تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتے تھے جن لوگوں تک وہ ادب کے ذریعے نہ پہنچ سکے تھے فلموں کے ذریعے ان تک پہنچنا چاہتے تھے۔فلموں سے اپنے مقصد کی تکمیل کی جب انھیں کوئی امید نہ رہی تو وہ فلموں کو الوداع کہہ کر ادبی دنیا میں واپس آ گئے۔اس کے بعد بھی پریم چند کے فکشن پر فلمیں بنانے کا سلسلہ جاری رہا۔ان کے چار ناولوں بازار حسن، چوگان ہستی، گئو دان، غبن اور نو افسانوں پنچ پرمیشور، عیدگاہ، کفن، دو بیل، شطرنج کے کھلاڑی، نجات، موتی، عورت کی فطرت اور سوامی پر فلمیں بنائی گئیں، ان میں سے نجات (سدگتی، ستیہ جیت رائے) شطرنج کے کھلاڑی، ستیہ جیت رائے) کفن (اوکا اوری کتھا، مرنال سین) اور دو بیل (ہیرا موتی، کرشن چوپڑا) خاص طور سے قابل ذکر فلمیں ہیں۔

پارسی تھیٹر، آغا حشر کاشمیری اور پریم چند کی فلموں سے وابستگی کے بعد بہت سے شاعر و ادیب بھی فلموں سے منسلک ہونے لگے۔آزادی سے قبل جن اردو ادیبوں نے اسکرپٹ نگاری کی شروعات کی ان میں ضیا سرحدی، صفدر آہ، کمال امروہی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، اوپندر ناتھ اشک، رامانند ساگر اور سی ایل کاوش کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ان میں سے بیشتر نے آزادی سے قبل ہی اسکرپٹ نگاری کی شروعات کر دی تھی۔وجاہت مرزا، ضیا سرحدی، کمال امروہی، آرزو لکھنوی، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، رامانند ساگر اور اختر الایمان وغیرہ ادیب تو لمبے عرصے تک فلموں سے منسلک رہے اور نہایت کامیاب اسکرپٹ نگار ثابت ہوئے جب کہ باقی ادیبوں نے کچھ فلمیں لکھنے کے بعد اسکرپٹ نگاری کو الوداع کہہ دیا، یا لکھتے بھی رہے تو وقفے وقفے سے۔

اسی دوران کچھ ایسے اسکرپٹ نگار بھی سامنے آئے جن کی پرورش اردو فکشن کے سائے میں ہوئی تھی ابتدا میں کچھ ایک افسانے، ڈرامے یا ناول لکھے بھی لیکن وہ فلموں سے اس طرح منسلک ہوئے کہ بعد میں ادب کے لیے وقت نہ نکال سکے اور ان کے نام سے اردو فکشن کی تاریخیں عام طور پر خالی ہیں۔لیکن ان میں اردو فکشن نگار بننے کے تمام امکانات موجود تھے اور فلموں سے وہ وہی کام کرتے رہے جو شاید اردو فکشن نگار کے طور پر کرتے۔ایسے چند اہم نام ہیں: وجاہت مرزا، ابرار علوی، سید علی رضا، امان، اختر مرزا، ایم صادق، شمس لکھنوی، آغا جانی کاشمیری، راجندر کرشن وغیرہ اسی نوعیت کے اسکرپٹ نگار ہیں جنھوں نے اردو فکشن کی روایت کو فلموں کے ذریعے آگے بڑھایا لیکن ادب میں وہ کوئی نمایاں کام انجام نہ دے سکے۔

اردو فکشن اور ہندستانی سنیما کا دوسرا سب سے اہم موڑ اس وقت آیا جب 1934 میں پریم چند اجنتا سنیٹون کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت فلموں کی اسکرپٹ لکھنے ممبئی پہنچے۔ ایک سال سے بھی کم عرصے تک پریم چند فلموں سے وابستہ رہے اس دوران انھوں نے مل مزدور (غریب مزدور) اور نوجیون فلموں کی اسکرپٹ براہ راست فلموں کے لیے لکھیں اور ان کے ناول بازار حسن پر ان کی حیات میں ہی فلم ریلیز ہو گئی تھی۔

آزادی سے قبل بھی اگر چہ کچھ یادگار فلمیں بنائی گئیں لیکن اس دور کی بیشتر فلموں پر پارسی تھیٹر غالب رہا۔یہ دور فلم میڈیا کو سمجھنے، اور اس کے تقاضوں و امکانات کو جاننے میں گزرا۔لیکن 1945/46 یا آزادی کے بعد سے لے کر 1970 کے وسط تک کا زمانہ ہماری فلموں کا زریں دور ہے، اب وہ سمجھ چکے تھے کہ فلم کس قدر موثر میڈیا ہے؟ اور اس میں اظہار کی کیسی بے پناہ قوت ہے۔فلمیں صرف تصویریں اور مکالمے نہیں ہیں بلکہ فلموں سے زندگی کے فلسفیانہ مسائل، سماجی اور تہذیبی زندگی کو بھی دکھایا جا سکتا ہے۔اب وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ فلمیں ادب، فن تعمیر، رقص و موسیقی اور مصوری جیسے فنون کی آمیزش سے مکمل ہوتی ہیں۔اس دور کے بہت سے فلمی فن کاروں کا تعلق ترقی پسند ادبی تحریک اور اپٹا (IPTA) سے بھی تھا اور وہ صرف پیسے کمانے کے لیے فلموں سے وابستہ نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ اپنی روشن خیالی اور ترقی پسند فکر کو زیادہ وسیع حلقے تک پہنچانا چاہتے تھے۔

فلموں کے اس زریں دور کے اگر اسکرپٹ نگاروں کا جائزہ لیا جائے تو ہم پاتے ہیں کہ اس زمانے کے تقریباً تمام اہم فلم سازوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی اردو ادیب/اسکرپٹ نگار موجود تھا۔گرودت کے ساتھ ابرار علوی تھے انھوں نے گرودت کے ساتھ آر پار، مسٹر اینڈ مسز ففٹی فائیو (Mr and Mrs 55)، پیاسا، کاغذ کے پھول اور چودھویں کا چاند فلموں کی اسکرپٹ لکھیں۔گرودت کی فلم صاحب بیوی اور غلام کے اسکرپٹ نگار کے ساتھ ساتھ ہدایت کار بھی ابرار علوی تھے۔گرودت کی فلموں کے علاوہ بھی ابرار علوی نے کئی یادگار فلمیں لکھیں جن میں پروفیسر، بہاریں پھر بھی آئیں گی، سورج، چھوٹی سی ملاقات، سنگھرش، ساتھی، منورنجن، لیلیٰ مجنوں اور بیراگ جیسی فلمیں شامل ہیں۔ابرار علوی نے فلموں سے وہ تمام کام لیے جو کام اردو کا ایک اچھا فکشن نگار کر سکتا تھا۔ہندستانی فلموں کے اسکرپٹ نگاروں میں ابرار علوی کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

بمل رائے نے اردو میں کچھ ہی فلمیں بنائیں ان کی بیشتر فلمیں بنگالی میں ہیں، ان کے ساتھ اسکرپٹ نگار راجندر سنگھ بیدی تھے۔دیوداس اور مدھومتی بمل رائے کی یادگار فلمیں ہیں جنھیں راجندر سنگھ بیدی نے لکھا تھا۔ان کے علاوہ بطور اسکرپٹ نگار بیدی کی کچھ اہم فلمیں ہیں: بڑی بہن، داغ، مرزا غالب، بسنت بہار، مسافر، انورادھا، میرے صنم، انوپما، میرے ہمدم میرے دوست۔بیدی نے خود بھی کئی فلمیں بنائیں جن میں گرم کوٹ، دستک اور پھاگن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔راجندر سنگھ بیدی ادب میں خاص جزئیات کی تفصیل اور حسیت کے لیے جانے جاتے ہیں، ان کا وہ اسلوب ان کی فلموں میں بھی نمایاں ہے۔ان کے ایک ناول (ایک چادر میلی سی)، دو افسانوں (گرم کوٹ و گرہن) اور ایک ریڈیائی ڈراما (نقل مکانی) پر فلمیں بنیں۔

راج کپور ہندستانی فلموں کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ان کے بغیر ہندستانی فلموں کی تاریخ نامکمل رہے گی ان کی بیشتر فلمیں خواجہ احمد عباس نے لکھیں، انھوں نے کئی یادگار فلمیں خود بھی بنائیں۔آوارہ، شری چار سو بیس، جاگتے رہو، میرا نام جوکر، بابی اور حنا فلمیں راج کپور کی شاہ کار فلموں میں شمار کی جاتی ہیں ان فلموں کی اسکرپٹ خواجہ احمد عباس نے ہی لکھی تھیں۔اس کے علاوہ انھوں نے جو اہم فلمیں لکھیں ان کے نام ہیں: نیچا نگر (ہدایت چیتن آنند)، ڈاکٹر کوٹنس کا امر کہانی (ہدایت وی شانتا رام)، دھرتی کے لال، زندگی یا

طوفان، چار دل چار راہیں، بمبئی رات کی باہوں میں، شہر اور سپنا، سات ہندستانی۔ ان میں سے بیشتر فلموں کے ہدایت کار و پروڈیوسر بھی وہ خود ہی تھے۔

محبوب خان اپنے زمانے کے سب سے بڑے فلم سازوں میں شمار کیے جاتے تھے ان کی بیشتر فلمیں وجاہت مرزا، ایس علی رضا اور آغا جانی کاشمیری نے لکھیں۔ وجاہت مرزا نے محبوب خان کے لیے عورت اور مدر انڈیا فلموں کی اسکرپٹ لکھیں، ایس علی رضا نے انداز، آن، مدر انڈیا اور امر فلمیں لکھیں جب کہ آغا جانی کاشمیری ہمایوں، انمول گھڑی اور امر فلموں کے اسکرپٹ نگار تھے، وجاہت مرزا نے محبوب خان کے علاوہ دوسرے پروڈیوسروں کے لیے بھی کئی بہت اہم فلمیں لکھیں، جن میں یہودی کی لڑکی، وطن، ایک ہی راستہ، بہن، روٹی، زینت، شہید، آواز، یہودی، کوہ نور، مغل اعظم، گنگا جمنا، لیڈر، پالکی اور لو اینڈ گاڈ فلمیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وجاہت مرزا کا شمار ہندستان کے سب سے بڑے اسکرپٹ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ وہ مدر انڈیا اور مغل اعظم جیسی عظیم فلموں کے اسکرپٹ نگاروں میں شامل تھے۔

آزادی کے بعد چوپڑا برادر کی فلموں کا طوطی اب تک بولتا رہا ہے اخترالایمان نے یوں تو بہت سی فلمیں لکھیں لیکن بی آر چوپڑا اور یش راج چوپڑا کی فلموں کے لیے انھیں خاص طور سے جانا جاتا ہے۔ اخترالایمان نے ان دونوں بھائیوں کی جن فلموں کو لکھا وہ کچھ اس طرح ہیں: قانون، دھرم پوتر، گمراہ، وقت، ہمراز، آدمی اور انسان، اتفاق، داغ، داستان اور دھند۔ ان میں سے صرف داغ ایسی فلم ہے، جس کے پروڈیوسر یش چوپڑا تھے باقی ساری فلموں کے پروڈیوسر بی آر چوپڑا ہی تھے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو اخترالایمان خاص طور سے بی آر چوپڑا کے اسکرپٹ نگار تھے۔ اخترالایمان نے چوپڑا برادرز کے علاوہ جو اہم فلمیں لکھیں وہ آج اور کل، یادیں، پھول اور پتھر، میرا سایہ، غبن، پتھر کے صنم، آدمی وغیرہ ہیں۔

رامانند ساگر اردو ادب میں ایک جانا پہچانا نام ہے، وہ اپنے ناول اور انسان مر گیا کے لیے اردو فکشن میں جانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو میں ڈرامے، افسانے اور مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان کی بنیادی شناخت ان کی فلمیں اور ان کا ٹی وی سیریل رامائن ہے۔ انھوں نے پرتھوی تھیٹر سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اسی وقت راج کپور نے انھیں برسات فلم لکھنے کا موقع دیا جسے انھوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کیا۔ کچھ اور فلموں کی اسکرپٹ لکھنے کے بعد رامانند ساگر نے خود کی فلم کمپنی بنالی اور فلم بنانے لگے۔ ان کی چند اہم فلمیں ہیں سنگ دل، راج تلک، پیغام، گھونگھٹ، راج کمار، زندگی، آرزو، آنکھیں، گیت اور چرس وغیرہ۔

اس طرح اگر ہم فلموں کے اس زریں دور پر نظر ڈالیں جو آزادی کے بعد سے ستر کی دہائی تک پھیلا ہوا ہے، اس دور کے تقریباً ہر بڑے فلم ساز کے ساتھ کوئی نہ کوئی اردو ادیب اور اردو اسکرپٹ نگار موجود ہے۔ اس زمانے میں کچھ ایسے اسکرپٹ نگار بھی تھے جن کی شناخت کسی خاص فلم ساز کی ٹیم کے ساتھ نہیں ہے لیکن انھوں نے بھی نہایت کامیاب اسکرپٹ لکھیں۔ مثال کے طور پر راجندر کرشن۔ راجندر کرشن فلموں میں آنے سے قبل درد شملوی کے نام سے اردو میں شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے فلموں کے لیے نغمے اور اسکرپٹ دونوں لکھیں۔ بطور اسکرپٹ نگار ان کی چند اہم فلمیں ہیں، بڑی بہن، ناگن، بھائی بھائی، پتنگ، نذرانہ، پریم پتر، من موجی، یہ راستے ہیں پیار کے، بھروسہ، خاندان، نئی روشنی، پڑوسن، پیار کیے جا، برہمچاری، وارث، تم سے اچھا کون ہے اور گوپی وغیرہ۔

مذکورہ بالا فلموں میں اردو فکشن کی تمام خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اس دور کے بیشتر اداکار بھی اردو سے اچھی طرح واقف ہوتے تھے اور اکثر یہ اسکرپٹ اردو زبان میں اس کی رسم خط کے ساتھ ہی لکھی جاتی تھیں۔ راج کپور، دلیپ کمار، دیو آنند، دھرمیندر، پران وغیرہ سب اردو رسم الخط میں ہی اسکرپٹ مانگتے تھے۔

ستر کی دہائی اور اس کے بعد بھی کچھ پرانے اسکرپٹ نگار اسکرپٹ لکھتے رہے اور کچھ نئے بھی آئے لیکن جو نئے اسکرپٹ نگار فلموں میں آئے ان میں سے بھی بیشتر کا پس منظر کسی نہ کسی طور پر اردو ادب سے تھا۔ اس زمانے میں سلیم - جاوید، گلزار، ساگر سرحدی، قادر خان، جاوید صدیقی، شمع زیدی، راہی معصوم رضا بڑے اسکرپٹ نگار کے طور پر ابھرے۔ اردو کے کچھ اور شاعر و افسانہ نگار بھی اس دوران فلموں سے وابستہ ہوئے مثلاً ندا فاضلی، سریندر پرکاش وغیرہ۔ اگرچہ ستر کے بعد آنے والی فلموں سے اردو کا اثر کچھ کم ہوا کیونکہ اس وقت فلموں میں جو رجحان دکھائی پڑتا ہے ان میں سنجیدگی کم نظر آتی ہے مار دھاڑ، قتل و غارت، سیکس اور سسپنس بڑھ گیا۔ اس طرح کی فلموں کو لکھنے کے لیے نہ ادبی پس منظر ضروری رہا اور نہ ہی نفیس اردو زبان، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس دور کی تمام فلمیں اسی نوعیت کی رہی ہوں کچھ سنجیدہ فلمیں بھی بنیں اور ایسی فلموں کو لکھنے کے لیے اردو کے اسکرپٹ نگاروں کی ہی ضرورت پڑی۔

تقریباً اسی زمانے میں اردو کا ایک ناول نگار فلم والوں کے لیے سب سے مقبول ادیب ثابت ہوا، جس کے تقریباً تمام ناولوں پر فلمیں بنائی گئیں اور تمام فلمیں باکس آفس پر نہایت کامیاب رہیں۔ یہ ناول نگار تھے اردو کے مقبول عام ادب کے ناول نگار گلشن نندہ۔ ان کے ناولوں پر مبنی چند اہم فلمیں ہیں، پھولوں کی سیج (اندھیرے چراغ پر مبنی)، کاجل (مادھوی پر مبنی)، ساون کی گھٹا، پتھر کے صنم، نیل کمل، کٹی پتنگ، کھلونا، شرمیلی، نیا زمانہ، داغ، جھیل کے اس پار، جگنو، اجنبی، محبوبہ (سسکتے ساز پر مبنی)، آزاد، بندیا چمکے گی۔ شروع میں گلشن نندہ نے ناول ہی لکھے جن پر فلمیں بنائی گئیں پھر گلشن نندہ فلم بنانے کے لحاظ سے ہی افسانے اور ناول لکھنے لگے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسی کہانیاں ہیں جو انھوں نے براہ راست فلموں

کے لیے ہی لکھیں۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ دور میں جو فلمیں بن رہی ہیں ان میں اردو کا بھی اور اردو فکشن کا بھی اثر بہت کم ہو گیا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ اس دور میں اردو کا ہی اثر کم نہیں ہوا ہے بلکہ ہندی اور انگریزی ادب کا بھی اثر کم ہوا لیکن انگریزی زبان کا اثر بہت تیزی سے بڑھا ہے۔ یہ زمانہ ایک کھچڑی زبان کا ہے جو اردو، ہندی اور انگریزی سے مل کر بنی ہے۔ اب سنجیدہ کہانیاں کم ہیں، جو فلمیں بن رہی ہیں ان کا کسی بھی زبان کے ادب سے بہت کم ہی تعلق ہے لیکن اس دور میں بھی کبھی کبھی کچھ ایسی فلمیں بن رہی ہیں مثلاً جودھا اکبر، فنا، سرفروش اور موسم وغیرہ جن میں اردو کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حال کے برسوں میں امراؤ جان پر ایک بار پھر فلم بنی ہے تو جیلانی بانو کے افسانے پر بھی حال ہی میں شیام بینگل نے 'ویلڈن ابا' کے نام سے فلم بنائی۔

مناسب ہوگا اگر ہم ایک نظر ان فلموں پر بھی ڈال لیں جو کسی اردو فکشن پر مبنی ہیں۔ کسی ادبی متن پر فلم بنانا ہمیشہ سے کافی متنازع موضوع رہا ہے اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ لوگ کسی فکشن پر مبنی فلم سے پوری طرح سے مطمئن ہوں، راقم کی اردو فکشن اور سینما پر ایک مستقل کتاب ہے، اس میں راقم نے دونوں میڈیا کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فلم اور فکشن دونوں الگ الگ میڈیا ہیں ان کے اغراض و مقاصد منفرد ہیں، ان کے اظہار کے طریقے الگ ہیں، ان کے اوزار (Tools) الگ الگ ہیں، ان کے خالق الگ ہیں۔ ان کے قاری اور ناظرین بھی الگ الگ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دونوں میں بہت سی یکسانیت ہوتی ہیں۔ دونوں میں ایک کہانی ہوتی ہے جو واقعات و کردار کے Interaction سے وجود میں آتی ہے۔ دونوں میں انسانی احساسات و جذبات کے دائرے میں معاملات ہوتے ہیں۔''

(ڈاکٹر رضوان الحق، اردو فکشن اور سینما، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6، ص 137)

ایسی فلموں کی ایک طویل فہرست ہے جو اردو فکشن پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے ہم اردو ناول پر ایک نظر ڈالیں گے، اردو کے ناولوں پر زیادہ فلمیں نہیں بنی ہیں۔ پریم چند کے چار ناولوں پر فلمیں بنیں۔ فلم سازوں کے لیے ہمیشہ سے اردو کا سب سے مقبول ناول امراؤ جان رہا ہے۔ اس پر تین بار فلمیں بن چکی ہیں سب سے پہلے مہندی بی اسے اے ناڈیاڈ والا نے بنایا، اس کے بعد مظفر علی نے امراؤ جان بنائی اور 2007 میں جے. پی. دتا نے بھی امراؤ جان کے نام سے ہی فلم بنائی۔ مظفر علی کی فلم ان میں سب سے بہتر ہے انھوں نے امراؤ جان کے المیہ کردار کو بڑی شدت سے ابھارا ہے سب سے اہم بات یہ ہے فلم میں پوری تحقیق و ایمانداری سے کام لیا گیا ہے۔ اگرچہ ناول میں امراؤ جان ادا کی زندگی کے حالات کو بچپن سے مابعد تک بیان کیا گیا ہے لیکن فلم میں بچپن کا کچھ حصہ اور مابعد کے حصے کو کم کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی ناول کی تاثیر فلم میں اتر آئی ہے۔ اردو ناول پر مبنی دو اور فلمیں ہیں عصمت چغتائی کے ناول پر ضدی اور علیم مسرور کے ناول بہت دیر کر دی پر طوائف۔ ضدی عصمت کے شوہر شاہد لطیف نے بنائی تھی اور خود عصمت نے اس کی اسکرپٹ لکھی تھی اس لیے فلم میں تشکیل نو کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ فلم اس لیے بھی یادگار بن گئی کہ کشور کمار اور دیو آنند کی یہ پہلی فلم تھی۔ ایک چادر میلی سی ناول پر مبنی فلم میں اگرچہ بہت زیادہ تبدیلیاں نہیں کی گئیں لیکن ناول کی حسیت کو یہ فلم نہ چھو سکی۔

اردو افسانے پر مبنی فلموں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ فلمیں پریم چند کے افسانوں پر بنائی گئیں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اردو افسانے پر مبنی فلمیں گرم کوٹ (فلم اور افسانہ دونوں راجندر سنگھ بیدی)، آنند (فلم رشیکیش مکھرجی، گلزار کے افسانہ بملد پر مبنی اسکرپٹ خود گلزار نے لکھی)۔ گڈی فلم گلزار کے اسی نام کے افسانے پر مبنی ہے۔ فلم کے مکالمے بھی گلزار نے ہی لکھے تھے۔ فریدہ مہتا نے کالی شلوار فلم منٹو کے چار افسانوں کالی شلوار، بابو گوپی ناتھ، ہتک اور ممد بھائی پر بنائی تھی۔ حیات اللہ انصاری کی کہانی پر چیتن آنند نے 1946 میں فلم بنائی تھی۔ یہ ہندستان کی پہلی فلم تھی جسے کسی بین الاقوامی انعام سے نوازا گیا۔ اسے کانس (فرانس) فلم فیسٹیول میں بہترین فلم سے نوازا گیا تھا۔ شیام بینگل نے دو اردو افسانوں پر فلمیں بنائیں۔ ان کی فلم منڈی غلام عباس کی کہانی آنندی پر اور ویل ڈن ابا جیلانی بانو کی کہانی نرسیاں کی باوڑی پر مبنی تھیں، ان دونوں فلموں میں شیام بینگل کا مخصوص انداز نظر آتا ہے۔ گلزار نے اچانک فلم خواجہ احمد عباس کے افسانے دل ہی تو ہے پر بنائی تھی۔ قاضی نذر الاسلام کی اردو کہانی سپیرا پر اسی نام سے دیوکی بوس نے فلم بنائی تھی۔ کرشن چندر کی دو کہانیوں پر فلمیں بنائی گئیں۔ مہالکشمی کا پل پر آر کے منیر نے یہاں سے شہر کو دیکھو اور ان داتا پر خواجہ احمد عباس نے 1946 میں دھرتی کے لال فلم بنائی اس فلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں آرٹ فلم کا آغاز اسی فلم سے ہوتا ہے۔

اردو کی کئی داستانوں پر بھی فلمیں بنائی گئیں۔ حاتم طائی پر اردو میں چار فلمیں بنائی گئی ہیں جن میں سے آخری فلم 1990 میں بنائی گئی جسے بابو بھائی مستری نے بنایا 1956 میں بنیں فلم بہت کامیاب رہی تھی۔ میر امن کی باغ و بہار پر چار درویش فلم ہومی واڈیا نے بنائی تھی۔ لیلیٰ مجنوں پر کہا جاتا ہے اب تک 18 فلمیں بن چکی ہیں۔ پریم پال اشک لکھتے ہیں:

''لیلیٰ مجنوں کو اب تک 18 مرتبہ فلمایا جا چکا ہے۔ دو فلمیں خاموش دور میں آئیں اور 16 فلمیں متکلم دور میں ان میں 8 فلمیں ہندی میں۔''

(پریم پال اشک، ہندستانی سنیما کے پچاس سال، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2، ص 142)

اس کے علاوہ اردو کی مقبول داستانوں شیریں فرہاد، ہیر رانجھا وغیرہ کو بھی کئی بار فلمایا گیا۔ ان میں ہیر رانجھا (چیتن آنند، اداکار راج کمار) اور لیلیٰ مجنوں (ایچ ایس رویل، اداکار رشی کپور) نہایت کامیاب اور اردو تہذیب سے پر فلمیں ہیں۔

جہاں تک سوال اردو ڈراموں پر مبنی فلموں کا ہے اس میں سرفہرست نام آغا حشر کاشمیری کا ہے۔ ابتدائی دور کی فلموں میں امانت لکھنوی کا ڈراما اندر سبھا بہت اہم ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ ایک منظوم ڈراما تھا اس لحاظ سے مدن تھیٹرز نے اس ڈرامے پر مبنی فلم کو اوپیرا کی شکل دی، اس فلم میں اب تک کے رکارڈ کے مطابق 72 نغمے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے چار بار اور فلمایا گیا۔ اس کے بعد اردو ادب کے شاہ کار ڈراما انارکلی کا نام آتا ہے۔ اس ڈرامے پر دو فلمیں بنائی گئیں انارکلی اور مغل اعظم۔ انارکلی ایک یادگار فلم ثابت ہوئی لیکن مغل اعظم کے بارے میں ایک بڑے حلقے کا خیال ہے کہ یہ ہندستان کی اب تک کی سب سے اچھی فلم ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ڈرامے نقل مکانی پر خود ایک فلم دستک بنائی تھی۔ یہ فلم نہایت خوبصورتی اور سنجیدگی سے بنائی گئی تھی اسے اس سال کے چار نیشنل ایوارڈز سے نوازا گیا تھا اور حسیت کے اعتبار سے بیدی کی یہ فلم ان کے ڈرامے نقل مکانی سے بھی آگے نکل گئی تھی۔

اردو فکشن اور سینما کا تعلق اتنا وسیع ہے کہ اس ایک موضوع پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اگر بالی ووڈ کی فلموں سے اردو فکشن اور اردو فکشن نگاروں کو الگ کر دیا جائے تو بالی ووڈ سنیما کے پاس کچھ خاص نہ بچے گا۔

■

Dr Rizvanul Haque, Asst. Prof., Urdu, DESSH, Regional Institute of Education (NCERT), Bhopal-462013

سہیل اختر خان

ہندوستانی
فلمی نغموں میں اردو کلچر

اردو اور بالی ووڈ کا نام آتے ہی ذہن میں اردو مکالموں کے الفاظ اور نغمے مع دھنوں کے گونجنے لگتے ہیں۔ نہ جانے کتنے ہی کرداروں کی حرکات وسکنات، اداکاری، جذبات سے پر مناظر ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اپنی تمام تر نیرنگیوں کے ساتھ جلوے دکھانے لگتی ہے۔ دھوتی کرتا پہنے، قشقہ کھینچے، نمستے کرتے ہوئے کرداروں کے ساتھ، شیروانیاں، ٹوپیاں، شام ڈھلے چھڑی لیے آداب و تسلیمات کرتے ہوئے کردار اِس بے تکلفی سے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے نظر آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ عالم یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کردار خدا کا نام لے کر فریاد کی لے بلند کرے تو ناظرین کو ایک لمحے کے لیے کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ یہ اعجاز برِّصغیر کی اِس طرفہ تماشہ، رنگ ونور سے بھرپور، گاتی گنگناتی، اپنے شانوں پر اُردو زبان کے گیسو بکھرائے ارتقا وتحول کے مدارج طے کرتی فلمی صنعت میں ہی نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں، بالی ووڈ کہا جاتا ہے۔

1931 میں اردشیر کی پہلی بولتی فلم، عالم آرا، منظرِ عام پر آئی اور پہلی بار ہندوستانی ناظرین، لطفِ نظارہ کے ساتھ لذتِ سماع سے آشنا ہوئے۔ اب تک شاعری لکھی جاتی تھی، پڑھی جاتی تھی، سنی اور سنائی جاتی تھی لیکن یک دفعہ سلور اسکرین کی نظّارگی، موسیقی کی سنگت اور غیرتِ ناہید تانوں نے مل جل کر شاعری کو ایک نیا ڈائمنشن دے دیا۔ ادب وشعر کو ایک ایسا پیرایۂ اظہار مل گیا جو فائن آرٹس کا ایک بے پناہ سنگم تھا۔ ہندوستانی فلموں کا پہلا نغمہ جو ہم نے سنا وہ تھا،

دے دے خدا کے نام پہ گر تجھ میں دینے کی طاقت ہے
یا مجھ سے کچھ لے لے اگر لینے کی طاقت ہے

جس زبان اور اس کے شعر وادب کی بنیاد ساڑھے چھ سو سال پہلے پڑی تھی، وہ امیر خسرو کے ہندوی کلام سے ہوتی ہوئی میر وغالب ومومن کے عہد سے درجہ بہ درجہ، اپنے دامن میں ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کے پات پھول لیے ہندوستانی فلموں کے دیوانِ عام میں اجلاس کرتی ہے۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف اپنی تمام تر زرخیزی کے ساتھ اِس سنگم میں اِس طرح حلول کرجاتی ہیں کہ ان کے بغیر ہندوستانی فلموں کے مکالموں اور گیتوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے موضوعات، تراکیب، لفظیات، محاورے اور روزمرّہ بے تکلفی سے اپنی محفل سجا لیتے ہیں۔ لکھنو اسکول کے شاعر وادیب ہوں یا دلّی اسکول کے، اردو ادب کے سارے ہی اسکولز اپنی روایات کے ساتھ ہندوستانی فلموں میں داخل ہوجاتے ہیں اور اسے ایک گرانڈ اوپیرا میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ غزل، قطعہ، رباعی، نظم اور نظم کے سبھی فارم، اپنی تکنیکی خوبیوں کے ساتھ مل جل کر ہندوستانی نغمگی کو اس کی شکل وصورت عطا کرتے ہیں۔

اردو ادبیات پر ایک بڑا الزام بعض اوقات لگایا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا زبان وادب ہے۔ ادیبوں میں پریم چند، کرشن چندر وغیرہ تو اردو ادب کے اِتنے بڑے نام ہیں کہ دوسرے ناموں کو گنوانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ شعرا میں فراق گورکھپوری، پنڈت برج نرائن، ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد، تنقید میں گیان چند جین، اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کی ایسی درخشاں مثالیں موجود ہیں جن کے بغیر اردو ادب، شعر اور تنقید کی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ مسلم سوشل فلموں کی مثال بھی ایسی ہی ہے کہ اِن فلموں کے کرداروں کے نام ویسے ہی مسلم نام ہیں جب کہ ان فلموں کی تھیم اتنی ہی رومانٹک یا سماجی شعور کی حامل ہے جتنی کہ وہ فلمیں جن کے کرداروں کے نام غیر مسلم ہیں۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مسلم معاشرے کی عکاسی اِن فلموں میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کی گئی ہے جو ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اٹوٹ حصہ اس لیے کہا کہ فلموں کے مسلم کردار ہوں یا غیر مسلم کردار۔ دونوں کی زبان و بیان میں اتنی یکسانیت ہے کہ اِسے ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔ شیروانی پہنے، دو پلّی ٹوپی لگائے، چھڑی لیے ہوئے پاکیزہ کے نواب صاحب ہوں، غرارے شرارے میں ملبوس 'چودھویں کا چاند' کی وحیدہ رحمان ہوں، یا دیوداس کی غیر مسلم نرتکی ہوں، یا میرے ہمدم میرے دوست کی وہ دو غیر مسلم سہیلیاں جو اپنے محبوب کی تعریف بیان کر رہی ہیں۔ اِن دونوں میں ہی زبان و بیان کی مماثلت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ غیر مسلم کردار ہیں، جن سے ہندی زبان کا جڑا ہونا ثابت کیا جاتا ہے، وہ اللہ، دعا، تعویذ، آیت، خدا جیسی مذہبی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے جھجکتے نہیں، اور فلم کے مسلم کردار جنم جنما نتر جیسے عقیدے کا بیان کرتے ہوئے اجنبی نہیں لگتے۔ مثال کے طور پر 'میرے ہمدم میرے دوست' کا یہ مشہور گیت ہے جو نوک جھونک، اور قوالی کے ٹھاٹ لیے ہوئے ہے، مجروح سلطانپوری کا گیت ہے جو اقبال کی ایک غزل کی بھی یاد دلاتا ہے:

اللہ یہ ادا کیسی ہے اِن حسینوں میں
روٹھیں پل میں نہ مانیں مہینوں میں

اقبال کا شعر ہے:

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجروح صاحب کا ہی ایک گیت اور یاد آیا۔ فلم، ساتھی، میں مکیش کی پرسوز آواز سے سجے ہوئے گیت کا مکھڑا ہے:

حسنِ جاناں اِدھر آ، آئینہ ہوں میں ترا
میں سنواروں گا تجھے سارے غم دے دے مجھے

انترے میں وہ کمال نظر آتا ہے جو برِّصغیر کی ملی جلی تہذیب میں ہی ممکن ہوسکتا تھا:

کتنے ہی داغ اٹھائے تو نے
میرے دن رات سجائے تو نے
گھر تیرے دم سے ہے مندر میرا
تُو ہے دیوی میں پجاری تیرا
سجدے سو بار کروں آ تجھے پیار کروں
میری آغوش میں آ، آئینہ ہوں میں تیرا

مندر، اور، دیوی کے پجاری، والے ایکسپریشن کے فوراً بعد، سجدے سو بار کروں، کے تہذیبی مزاج کا خمیر صرف اور صرف ہندوستان کی زرخیز زمین سے ہی اُٹھ سکتا تھا۔

بمل رائے، کی 'دیوداس' کی نرتکی، دیوداس کے سامنے جب اپنا دل کھول کر رکھ دیتی ہے تو ساحر کے الفاظ میں کہتی ہے:

مری بے بسی ہے ظاہر مری آہِ بے اثر سے
کبھی موت بھی جو مانگی تو نہ پائی اس کے در سے
جو مراد لے کے آئے وہ دعا کہاں سے لاؤں

لفظِ 'دعا' پر غور فرمائیں اور سنجے لیلا بھنسالی کی 'دیوداس' کی چندر مکھی کو بھی دیکھیں، نصرت بدر کے الفاظ ہیں:

یہ کس کی ہے آہٹ، یہ کس کا ہے سایا
ہوئی دل میں دستک یہاں کون آیا
ہم پہ یہ کس نے ہرا رنگ ڈالا
خوشی نے ہماری ہمیں مارڈالا، اللہ مارڈالا

، کے ساتھ، 'اللہ' کی دہائی ایسے دیتی ہے کہ غیر مسلم طوائف پر کسی قسم کا الزام نہیں آنے پاتا۔ آنند بخشی کا ایک گیت فلم 'دوستانہ' میں ہے:

دعا بد دعا دے یہ ممکن نہیں
مجھے تو دغا دے یہ ممکن نہیں
خدا جانے کیا ماجرا ہوگیا
سنا ہے کہ تو بے وفا ہو گیا

امیتابھ بچن اور شتروگھن سنہا، اِس فلم میں بھی غیر مسلم کردار ہیں، مزے کی بات یہ ہے کہ آنند بخشی بھی کوئی مسلم نغمہ نگار نہیں ہیں۔ لیکن دعا، بد دعا، کے ساتھ لفظِ خدا کس بے تکلفی سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اِسے سن کر غالب بھی کہیں نہ کہیں یاد آتے ہیں:

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

اِسی 'دعا' کو اِس مکھڑے میں دیکھیے جو کوئی مسلم کردار کی زبانی نہیں ہے، اور نہ صرف دوسرے مصرعے میں 'ادا' کے قافیے کی مجبوری۔ بلکہ اُردو اور اُردو کلچر کی دین ہے:

مزاجِ گرامی، دعا ہے آپ کی
بڑی خوبصورت ادا ہے آپ کی

حسرت کے ایک گیت میں تو لفظ 'خدا' اور 'بھگوان' ایسے رل مل گئے ہیں کہ بس سنائے ہی بنتی ہے:

میں کیسے خدا حافظ کہہ دوں مجھ کو تو کسی کا یقین نہیں
چھپ جاؤ ہماری آنکھوں میں بھگوان کی نیت ٹھیک نہیں

آپ کہیں گے، وہی قافیے کی مجبوری، جو اوپر سے انسان، ایمان، کی وجہ سے 'بھگوان' لایا گیا ہے، حضور والا، خدا کے ساتھ بھگوان کا استعمال قافیے کی مجبوری نہیں بلکہ وہی گنگا جمنی تہذیب ہے۔

بالی ووڈ کے جدید عہد میں بھی اُردو کا یہ کلچر جابہ جا دیکھا جاسکتا ہے۔ قیامت سے قیامت تک، دل چاہتا ہے، جودھا اکبر، فنا، سانوریا، قربان، زندگی نہ ملے گی دوبارہ، اس کی واضح مثالیں ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جنم جنمانتر اور آواگون کا عقیدہ اسلام اور مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا لیکن جب، جاوید اختر صاحب، ایک مسلم کردار کے لیے کہلواتے ہیں:

جو اب کیے ہو داتا ایسا نہ کیجو
اب کے جنم موہے بٹیا نہ کیجو

تو لڑکی ذات کے ساتھ ہونے والے سماجی ظلم وستم کی داستان ہی نہیں سنائی دیتی بلکہ تہذیبوں کا خوبصورت سنگم بھی دکھائی دیتا ہے۔

ایک مثال بروقت، گلزار صاحب کے گیت سے یاد آئی، یہ بات گولڈن ایرا کی نہیں بلکہ 1998 کی ایک فلم 'دل سے' کی ہے۔ چل چھیاں چھیاں، گیت ہے:

جن کے سر ہو عشق کی چھاؤں
پاؤں کے نیچے جنت ہوگی
جن کے سر ہو عشق کی چھاؤں

اِس گیت میں گلزار صاحب لکھتے ہیں:

وہ یار ہے جو خوشبو کی طرح
ہے جس کی زباں اُردو کی طرح
مری شام و رات مری کائنات
وہ یار مرا سیاں سیاں

شاید گلزار صاحب پہلے نغمہ نگار ہیں جنھوں نے 'اُردو' کو زبانِ یار کا بہترین وصف بتایا ہے۔ انھیں تو وہی معشوق اچھا لگتا ہے جس کی زبان اردو کی طرح ہو۔ 'اردو کی طرح' سے آپ کو یہ شبہہ نہ ہو کہ اُردو نہیں، بلکہ اُردو کی طرح، ہو۔ یہ تو ویسی ہی شاعرانہ بات ہوئی جیسی کہ اُردو شاعری کے خدائے سخن میر تقی میر نے کہی تھی:

نازکی اُن کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

'کی سی' نے جو لطف پیدا کیا ہے اسی کا لطف، ہو جس کی زباں اردو کی طرح، میں اٹھایئے اور شام رات کے ساتھ 'کائنات' کی داد دیجیے۔ اسی نغمے کے دوسرے انترے میں:

گلپوش کبھی اترائے کہیں
مہکے تو نظر آجائے کہیں

کے ساتھ:

تعویذ بنا کے پہنوں اُسے
آیت کی طرح مل جائے کہیں

میں تعویذ اور آیت کے تلازمات کی داد نہ دینا اردو کلچر کے ساتھ سخت بے ایمانی ہی کہی جاسکتی ہے۔

گلزار صاحب وہ پہلے نغمہ نگار ہیں جنھیں نغمہ نگاری کے لیے آسکر ایوارڈ دیا گیا ہے۔ جے ہو، کے علاوہ پورے گیت میں اُردو کا ڈکشن ہی تو ہے۔ اسے اُردو کی فتح نہ کہیں تو نہ سہی لیکن لفظِ 'اردو' کا جیسا کچھ استعمال گلزار صاحب نے کیا ہے اس پر 'اردو ایوارڈ' تو اُنھیں دیا ہی جاسکتا ہے۔

اُردو اپنے مسلم معاشرے میں۔ اردو غیر مسلم معاشرے میں۔ اپنے روزمرّہ اور محاوروں، دوسری زبانوں کے الفاظ سے مل کر نئے الفاظ اور اصطلاحات کی تراش خراش کی زرخیزی، کے تانوں بانوں سے اِس زبان نے اپنا ایک کلچر وضع کر لیا ہے۔ آداب وتسلیمات، انشاء اللہ، ماشاء اللہ، کا بلا تکلف استعمال تو سامنے کی چیزیں ہیں ورنہ اُردو اپنے اِس کلچر کے ساتھ ہندوستانی فلموں کا ایسا حصہ بن چکی ہے جسے جدا کرنا، یا اُس سے انکار کرنا ناممکن ہے۔

Suhail Akhtar Khan, 501, Khoja Bldg, 196, Maulana Azad Road, Mumbai- 400008.

▪ کرشن بھاوک

ہندوستانی

فلمی نغمات کو اردو شاعری کی سوغات

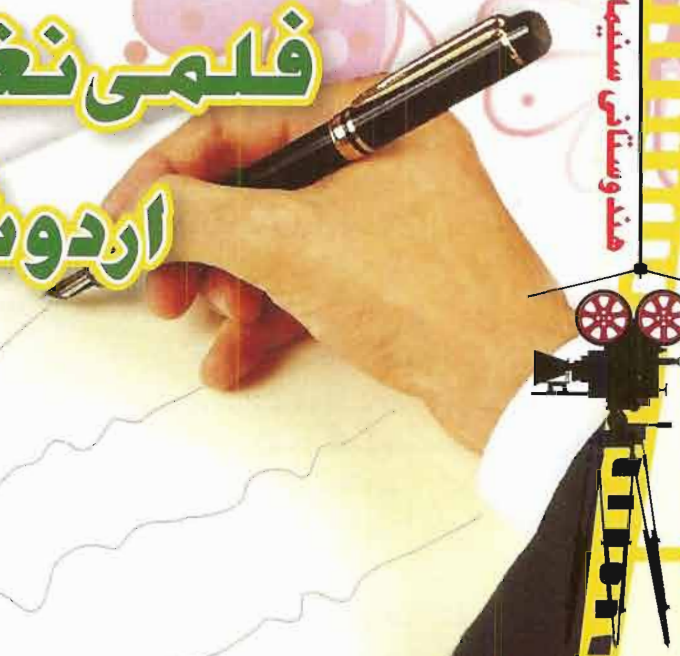

ہندی فلموں کا اثر

عوام کی روزمرہ زندگی پر قدیم زمانے سے پڑتا رہا ہے۔ ان میں شامل نغموں کو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک گاتے اور گنگناتے رہے ہیں۔ اگرچہ ہندی فلموں اور ان کے گانوں یا نغموں کے ضمن میں بہت کچھ تحقیق بھی تاحال ہوچکی ہے، تاہم نغموں کے الفاظ وتکنیک وغیرہ اور ان پر اردو شاعری کے ناقابلِ تردید اثرات کے نظریے سے کوئی بھی تحقیقی مضمون یا کتاب وغیرہ قارئین کی نظروں سے نہیں گزری ہے۔ موجودہ مقالے کی افادیت اسی سے واضح ہوجاتی ہے۔ تحقیق کے اس علاقے میں کوتاہی، کمیابی یا فقدان کی وجہ اس سے تعلق رکھنے والے بنیادی لوازم کی ازحد کمی ہی کہی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے بزرگ محققوں کی وہ یادداشت، جو کہ اس نوعیت کی تحقیق کے لیے لازم ہوا کرتی ہے، اس کا بتدریج کم ہوتے چلے جانا، مطالعے کی سہولت اور مزید تفتیش وتحقیق میں افادیت کے مقصد کے مدنظر اس مقالے کو چند عنوانات کے تحت آگے پیش کیا جارہا ہے۔

'پہلی نظر' اس پرانی فلم کے ایک نغمے کے ایک مکھڑے کا حوالہ محترمہ فریدہ رحمت اللہ نے اپنی ادارت میں بنگلور سے شائع ہونے والے جریدے 'زریں شعائیں' کے مئی سنہ 2012 کے شمارے کے زیرِعنوان اداریہ 'مجھے بھی کچھ کہنا ہے' میں دیتے ہوئے ایک خاص موقع پر لکھا تھا ''دوستو! کسی شاعر نے غلط کہا تھا... 'دِل جلتا ہے، تو... آنسو نہ بہا فریاد نہ کر...' (ص5) اصل میں یہ نغمہ ڈاکٹر صفدر آہ جیسے نامور شاعر کا لکھا ہوا تھا اور پرانی ہندی فلم 'پہلی نظر' میں شامل تھا۔ اس فلم کے موسیقار انل بسواس تھے اور نغمے کے گلوکار مکیش تھے۔ ممبئی سے شائع ہونے والے رسالے 'شاعر' کے اسی سال سنہ 2012 کے کسی شمارے کے ایک مضمون میں ہی اس امر کی خط کشی کی گئی ہے۔

'میلہ' (ڈائریکٹر: ایس یوسنی، موسیقی: نوشاد، نغمہ نگار: شکیل بدایونی، گلوکار: محمد رفیع) اس نام کی ایک بہت پرانی فلم ہے، جس میں دردآمیز اداکاری کرنے کے موجب ہی 'ٹریجڈی کنگ' اداکار جناب دلیپ کمار پر فلمائے گئے ایک نغمے کے یہ الفاظ قارئین کو ابھی تک یاد ہوں گے 'یہ زندگی کے میلے، دنیا میں کم نہ ہوں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے، یہ زندگی کے میلے ...' انسانوں اور جانوروں وغیرہ کی زندگی کی بے ثباتی اور عارضی حیثیت کی خط کشی کرنے والے اس نغمے میں مرزا محمد تقی ترقی کے جس شعر سے کچھ استفادہ کیا گیا تھا۔ وہ یہ ہے 'دنیا کے جو مزے ہیں، ہرگز وہ کم نہ ہوں گے، چرچے یہیں رہیں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے۔'

شاید اسی شعر سے متاثر ہوکر شاعرِ اعظم قائم چاندپوری نے بھی اپنا یہ شعر کہا ہوگا۔ 'کیا کیا عدم میں ہم پر ظلم وستم نہ ہوں گے/ چرچے یہیں رہیں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے۔' یہاں دوسرا مصرع ہو بہو ترقی کے شعر والا ہی ہے۔

'برسات کی رات' (موسیقی: روشن، گلوکار: محمد رفیع) ریاض خیرآبادی جیسے بلند پایہ شاعر کا ایک مقبولِ عام شعر رہا ہے۔ 'کیا مزہ دیتی ہے بجلی کی چمک مجھ کو ریاض/ مجھ سے لپٹے ہیں مِرے نام سے ڈرنے والے۔' بعد میں بنی فلم 'برسات کی رات' میں شامل ساحر لدھیانوی کے لکھے ایک مشہور نغمہ کے یہ الفاظ بھی یاد آرہے ہیں۔

'ڈر کے بجلی سے اچانک وہ 'لپٹنا' اس کا، اور پھر شرم سے بل کھا کے سمٹنا اس کا۔' ابھی دیکھی نہ سنی ایسی طلسمات کی رات، زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات ... '

فلم 'ہریالی اور راستہ' میں بھی ہیرو منوج کمار پر فلمائے گئے ایک نہایت شیریں نغمے (گلوکار: کشور کمار) کے چند الفاظ اس طرح تھے 'لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے، الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے۔'

اب کسی نامعلوم شاعر کے اس شعر کا بھی موازنے کے ہی مدنظر ملاحظہ کریں: 'ڈرنا کسی کا اور وہ بجلی کا کودنا، موسم بہت پسند ہے برسات کا مجھے۔'

'بیجو باورا' (نغمہ نگار شکیل بدایونی، موسیقی: نوشاد) اس فلم میں ہیروئن پر فلمائے گئے مشہور نغمے کے مکھڑے کے الفاظ تھے 'بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا، جب یاد میری آئے، ملنے کی دعا کرنا۔' اصل میں اس مصرعے کی بنیاد میں مشہور شاعر جلال مانک پوری کا یہ شعر تھا۔ 'جاتے ہو خدا حافظ / ہاں اتنی گزارش ہے، جب یاد ہم آجائیں، ملنے کی دعا کرنا۔'

'پاکیزہ' (ڈائریکٹر: کمال امروہی، نغمہ نگار: مجروح سلطان پوری) اُمید ہے، اس شہرۂ آفاق فلم کے ایک نغمے کے یہ بول قارئین کے ذہن میں تاحال ضرور محفوظ ہوں گے۔ 'ٹھاڑے رہیو او بانکے یار رے، ٹھاڑے رہیو۔' اور ان ہی بولوں کے بعد الفاظ آتے ہیں۔ 'چاندنی رات بڑی دیر کے بعد آئی ہے، آج کی رات وہ آئے ہیں بڑی دیر کے بعد، آج کی رات بڑی دیر کے بعد آئی ہے۔' اس پچھلے مصرعے کا ماخذ کہے جانے والا ہو بہو یہی شعر پاکستانی معروف وممتاز شاعر سیف الدین سیف کے نام سے ہمیں دستیاب ہو جاتا ہے۔

'ضدی' (ڈائریکٹر پرمود چکرورتی، نغمہ نگار: حسرت جے پوری، گلوکار: محمد رفیع، موسیقی: ایس ڈی برمن) 18 ویں صدی کے کلاسیکل شاعر (شیخ امام بخش) ناسخ کا ایک شعر ہے 'تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت، ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں۔' شری دیوداس بسمل نے 'نہیں ملتی کسی کی صورت' مصرع کی بجائے لکھا ہے 'کسی کی نہیں ملتی صورت'۔

'داغ' (نغمہ نگار: ساحر لدھیانوی، موسیقی: لکشمی کانت پیارے لال) اس فلم میں ہیروئن شرمیلا ٹیگور پر فلمائے گئے ایک نغمے کے معرض میں گایا جاتا ہے۔ 'جب بھی جی چاہے نئی دنیا بسا لیتے ہیں لوگ، اک چہرے پہ کئی چہرے لگا لیتے ہیں لوگ۔' ان الفاظ کا بھی ماخذ قتیل شفائی کا یہ شعر ہے 'جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں، لوگ ایک چہرے پر کئی چہرے لگا لیتے ہیں لوگ'

جگر مرادآبادی کا ایک مشہور و معروف شعر ہے 'ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے / رونے کو نہیں کوئی، ہنسنے کو زمانہ ہے' اس فلم میں ہو بہو یہی شعر حسرت جے پوری کے نام سے غلطی سے دے دیا گیا ہے۔

'امراؤ جان' (نغمہ نگار: شہریار، موسیقار: خیام) اس فلم میں آشا بھونسلے کا گایا ہوا ایک نغمہ مشہور اداکارہ ریکھا پر فلمایا گیا تھا اور اس کا مکھڑا یہ تھا 'دل چیز کیا ہے، آپ میری جان لیجیے، بس ایک بار میرا کہا مان لیجیے' اس نغمے کا ماخذ شاعر اعظم مصحفی کا یہ شعر ہے 'کیا چیز دل ہے، چاہے تو جان لیجیے / پر بات کوئی ہے، جو کہا مان لیجیے۔' اس شعر کو ہی تصحیح کے بعد شاعر زماں نے اِس صورت میں پیش کیا تھا۔ 'دل چیز کیا ہے، آپ مری جان لیجیے، بس ایک بار، میرا کہا مان لیجیے' اسی فلم میں جگجیت کور کی آواز بھی نکاح کے وقت لڑکی کے جدائی والے نغمے سے درد کی پنہائیاں ناپتی گونجتی سنی گئی تھیں۔ 'کاہے کو بیاہی بدیس ... ' یہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اولین اور بانی مانے جانے والے شاعر و صوفی حضرت امیر خسرو کے عوامی گیت کے سانچے میں ڈھلی ایک زندہ جاوید تخلیق رہی ہے، تاہم اس عوامی گیت کا امیر خسرو کے نام سے منسوب ہونا اصل میں مشکوک ہونے کے موجب ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا ہے۔

'لیلیٰ مجنوں' اداکار رشی کپور کے ساتھ مرکزی کردار ادا کر رہی اداکارہ رنجیتا پر فلمایا ہوا ایک نغمہ اس مکھڑے والا تھا 'حسن حاضر ہے محبت کی سزا پانے کو، کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو' شیخ تراب علی قلندر کاکوروی کا محرک یہ شعر قابلِ غور ہے۔ 'شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے مناہی کردی ... کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو۔'

'دو بھائی' (سنہ 1947 میں بنی فلم ڈائریکٹر منشی دل، نغمہ نگار: راجہ مہدی علی خان، موسیقی: ایس ڈی برمن، گلوکارہ: گیتا رائے، ڈائریکر: گورودت سے شادی کے بعد گیتا دت) فلم میں گیتا رائے نے بطور گلوکارہ یہ مکھڑا گایا تھا۔ 'یاد کرو گے، یاد کرو گے، اک دن ہم کو یاد کرو گے / تڑپو گے فریاد کرو گے، اک دن ہم کو یاد کرو گے۔' اصل میں یہ مکھڑا میر تقی میر کے اس شعر سے متاثر ہے، جس کا حوالہ پونہ کے شاعر و فاضل ادیب دیوداس بسمل نے بھی اپنی 1225 منتخب اشعار والی ہندی کتاب 'عمر بھر سفر میں'، ص 9) کے تحت دیا ہے اور میر تقی میر کا وہ ماخذ شعر یہ ہے۔ 'اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے، پر ہم جو نہ ہوں گے، تو بہت یاد کرو گے۔' (بیاضِ سخن، ص 202، کلیاتِ میر 289) یہ شعر اختر شیرانی کے اس رومانی نوعیت کے شعر سے بھی لائقِ موازنہ ہے: 'بھلا بیٹھے ہو ہم کو آج، لیکن یہ سمجھ لینا / بہت پچھتاؤ گے، جس وقت کل ہم یاد آئیں گے۔'

'آرزو' (نغمہ نگار: حسرت جے پوری، موسیقی: شنکر جے کشن، گلوکار: محمد رفیع) اداکار راجیند رکمار پر فلمائے گئے نغمے کا ایک مصرع تھا 'چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ، کھلتے رہیں ہونٹوں کے گلاب اور زیادہ ... ' مشہور شاعر مجاز لکھنوی کی غزل کا ہی ایک شعر ہے۔ 'چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ / مہکیں تیرے عارض کے گلاب اور زیادہ) یہاں بھی چند الفاظ ہی تبدیل کر کے شعر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ 'مہکیں تیرے عارض' ان الفاظ کی جگہ 'کھلتے رہیں ہونٹوں' کر دیا گیا ہے۔

'دشمن' (نغمہ نگار: آنند بخشی، موسیقی: لکشمی کانت پیارے لال) گلوکار کشور کمار نے ایک نغمے کی ابتدا میں سید غلام محمد مست کلکتوی کے ایک مشہور شعر میں صرف ایک لفظ 'حقیقت' کی جگہ 'سچائی' لفظ تبدیل کر کے یوں کر دیا تھا۔ 'سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے، کہ خوشبو آنہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔' سید غلام محمد مست کلکتوی کے متعدد اشعار اردو کے ضرب المثل بن چکے ہیں اور ان کا ہی ایک شعر یہ ہے۔ 'حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے، کہ خوشبو آنہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے' (حوالہ 'شعرائے بنگالہ، ص 519-518)

دیگر نغمات کے شروع میں بھی اکثر اِسی طرح اشعار کی زیبائش کی جاتی رہی ہے۔

'انجمن' سنہ 1986 میں بنی اِس فلم میں مذکورہ بالا جگجیت کور کے ساتھ سنگیت کار خیام نے بھی ایک دوگانہ گایا تھا، جس کے بول تھے 'جب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، جب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں ... ' یہ الفاظ فیض احمد فیض کی ہی ایک غزل کے ہیں۔

'حنا' اِس فلم میں ہیروئن ایک ایسا نغمہ گاتی ہے، جس میں ہیروئن اشونی بھاوے کسی مشہور شاعر کی رباعی کو ہو بہو 'دیر نہ ہو جائے، کہیں دیر نہ ہو جائے' مکھڑے والے نغمے کے معرض میں گاتی ہے اور مذکورہ بالا رباعی کے چار مصرعے اس طرح ہیں۔ 'دل دیا میرے پیار کی حد تھی / جاں دی تیرے اعتبار کی حد تھی / مر گئے ہم کھلی رہی آنکھیں / یہ میرے انتظار کی حد تھی۔' شاعرِ اعظم امیر بینائی کے شاگرد ریاض خیرآبادی کا بھی یہ شعر قابلِ دید و داد ہے۔ 'کس لطف سے کھلی ہوئی آنکھیں ہیں بعدِ مرگ / ہم مٹ گئے، مزا نہ مٹا انتظار کا۔'

'داستان' (نغمہ نگار: ساحر لدھیانوی، گلوکار: محمد رفیع، موسیقی: روی) اِس فلم میں دنیا و حیات کی بے ثباتی

کی نشان دہی کرنے والی ایک سنجیدہ غزل کے الفاظ تاعمر یاد رہنے والے ہیں۔ 'نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے/ تیرا وجود ہے اب صرف داستاں کے لیے۔' دلیپ صاحب پر فلمائے گئے اس نغمے پر علامہ اقبال کی شانت رس میں ڈوبی اوراس مطلع 'نہ تو زمیں کے لیے ہے، نہ آسماں کے لیے۔' یہ مصرع ہو بہو لیا گیا ہے۔ اگلا مصرع ہے۔ 'جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے' اِس شعر والی غزل کا اثر نمایاں و ناقابل تردید ہی محسوس ہوسکتا ہے۔ کیفی اعظمی نے بھی اِسی مفہوم کے اشعار کہے ہیں۔

'رفو چکر' (نغمہ نگار، گلشن باورا، گلوکارہ: آشا بھونسلے کے ہمراہ نغمہ سرا شیلیندر سنگھ، موسیقی: کلیان جی آنند جی) اِس فلم میں ایک نغمے میں شیلندر سنگھ کی آواز کا جادوان الفاظ سے ہی اپنا آغاز کرتا ہے۔ 'کسی پہ دل اگر آ جائے تو کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے، جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔' مرزا رضا خان برق کا اصل شعر یہ تھا۔ 'اے صنم وصل کی تدبیروں میں کیا رکھا ہے/ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے' (مرزا محمد رضا خان برق، غزلیاتِ برق، 82) دیگر متن ہے 'اے صنم وصل کی تدبیروں میں کیا رکھا ہے' کی جگہ 'مدعی لاکھ برا چاہے، تو کیا ہوتا ہے' مصرعہ عام عوام میں زیادہ مقبول ہوا ہے۔

فلم **'محل'** (1949 میں بنی فلم، ڈائریکٹر: کمال امروہی، موسیقی: کھیم چند پرکاش، نغمہ نگار، جے نخشب، گلوکارہ: لتا منگیشکر) شاعر جے نخشب جارچوی کا ایک شعر ہے 'الجھن ہیں بہت پھر بھی ہم تم کو نہ بھولیں گے/ ممکن تو نہیں لیکن، تم ہم کو بھلا دینا۔' فلمی نغمے کا مکھڑا یہ ہے۔ 'مشکل ہے، بہت مشکل چاہت کا بھلا دینا/ آسان نہیں دل کی یہ آگ بجھا دینا۔'

'رم جھم' (ڈائریکٹر: رمیش گپت اور سشیل ساہو، موسیقی: کھیم چند پرکاش، نغمہ نگار: بھرت ویاس، گلوکارہ: شمشاد بیگم) جوش ملیح آبادی کا ایک شعر ہے 'ایک ایک کرکے بجھ گئے ہیں چراغ/ نیند اب دیکھیے کب آتی ہے۔' مذکورہ بالا فلم میں ایک نغمے کے الفاظ ہیں 'نہ تم آئے، نہ نیند آئی، تمھاری یاد آئی۔'

'رات کی رانی' (سنہ 1949 میں بنی، ڈائریکٹر: جگدیش سیٹھی، موسیقی: ہنس راج بہل، نغمہ نگار: سید انور حسین آرزو لکھنوی، گلوکار: محمد رفیع) آرزو کی ایک غزل کا مطلع اِس فلم میں ہو بہو لے لیا گیا ہے۔ 'جن راتوں میں نیند اڑ جاتی ہے، کیا قہر کی راتیں ہوتی ہیں/ دروازوں سے ٹکرا جاتے ہیں، دیواروں سے باتیں ہوتی ہیں۔'

'ضدی' (ڈائریکٹر: عصمت چغتائی کے خاوند شاہد لطیف، موسیقی: کھیم چند پرکاش، نغمہ نگار: معین احسن جذبی، گلوکار: کشور کمار) جذبی کا ایک شعر ہے 'جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی/ اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے۔' فلم کے اوّل نغمے میں ہی متذکرہ بالا شعر والی غزل کے اِس مطلع کو ہی مکھڑا بنایا گیا ہے۔ 'مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے/ اب ایسی ظالم دنیا میں جینے کی تمنا کون کرے۔'

'حقیقت' (ڈائریکٹر چیتن آنند، موسیقی: مدن موہن، نغمہ نگار: کیفی اعظمی، گلوکار: محمد رفیع) فانی بدایونی کا ایک شعر ہے 'روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے چلے/ مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے۔' فلم میں ایک نغمے کی جاوداں لائنیں ہیں۔ 'میں یہ سوچ کر اُس کے در سے اٹھا تھا کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو۔ مگر اس نے روکا، نہ دامن ہی تھاما/ نہ آواز ہی دی، نہ بڑھ کر منایا، میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا۔

مومن خاں مومن کا ایک شعر ہے 'ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی/ ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ۔' مذکورۂ بالا فلم میں ایک نغمے پر اِسی شعر کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ 'ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو دل سوچتا ہے (فلم میں شاید لفظ 'ڈرتا' ہے)، کہیں یہ وہ تو نہیں'

فلمی مکالموں پر بھی اشعار کا اثر

نغموں کے علاوہ فلموں کے مکالموں پر بھی اردو اشعار کی حاکمیت دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً ایک ہندی فلم میں بدمعاش، خبیث و مکار شخص کا ہی بیشتر جاندار و شاندار رول یا کردار کرتے رہنے والے پریم چوپڑا صاحب سے فلم کے ڈائریکٹر صاحب نے یہ ایک خاص مکالمہ بلوایا تھا۔ 'میرا نام ہے پریم چوپڑا... میں وہ بلا ہوں، جو شیشے سے پتھر کو توڑ دوں۔'

کہا جاتا ہے کہ خاص مکالمہ بلوانے سے از حد خوش ہوکر پریم چوپڑا صاحب نے ڈائریکٹر صاحب سے اُس فلم میں کام کرنے کا کوئی بھی محنتانہ وصول نہیں کیا تھا۔ اصل میں اس مکالمے کا ماخذ (شیخ محمد ابراہیم) ذوق کا یہ شعر ہی کہا جائے گا۔ 'نازک خیالیاں میری توڑیں عدو کا دل، میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں۔' اسی طرح دیگر فلموں میں بھی اردو اشعار کو ہو بہو یا چند ایک الفاظ کے ردو بدل سے مکالموں میں گفتنی قول یا بات وغیرہ میں مطلوب زور پیدا کرنے کے لیے بخوبی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اپنی یادداشت کی بنا پر اس طرح مستعمل اشعار کو ان کے معزز شعرا کے نام کے ساتھ یہاں حسب ذیل دیا جارہا ہے:

1. ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں
(جگر مرادآبادی، کلیات جگر، ص 82)
2. وقت دو مجھ پر کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں
اک ترے آنے سے پہلے، اک ترے جانے کے بعد
(داغ دہلوی)
3. ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
(میر تقی میر، کلیات میر، ص 133)
'ابتدائے عشق ہے' الفاظ کی بجائے دیگر متن 'راہِ دورِ عشق' بھی ملتا ہے۔
4. مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
(مرزا علی بیگ عشرتی، شہکار، ص 275)
5. فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے گی، جسے روشن خدا کرے
(شہیر مچھلی شہری، حوالہ: حفیظ جونپوری، حیات وشاعری، ص 28)
6. سرخ رو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد
(سید غلام محمد مست کلکتوی، ص 519-518)
7. ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
(علامہ اقبال، 353)
8. قیس صحرا میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو
خوب گزرے گی، جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو
(میاں داد سیاح، ص 89)

کیفی اعظمی

گلشن باورا

حسرت جے پوری

آنند بخشی

مجروح سلطان پوری

ساحر لدھیانوی

شکیل بدایونی

9. کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
اب تو تپ بھی رہا نہیں جاتا
(میرتقی میر،کلیات میر،ص362)

10. مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے
جو گزرے ہیں مجھ پر خدا جانتا ہے
(قائم چاند پوری، برمحل اشعار اور ان کے ماخذ، خلیق الزماں نصرت،ص27)

11. ایک جا گہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
ہے عجب حال مرا، صبح کہیں شام کہیں
(قائم چاند پوری، اردو شاعری کا انتخاب، ص11، کلیات قائم ص119)

12. شعلہ بھڑک اٹھا میرے اِس دل کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے
(پنڈت مہتاب رائے تاباں، شعر کہ ہنوز، ص39)

13. سیر کر دنیا کی غافل، زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی، تو نوجوانی پھر کہاں
(خواجہ میر درد، ص123)

اردو زبان کے ایک ابتدائی قاعدہ میں اس شعر کا تخلیق کار نوازندہ واجندہ بتایا گیا تھا، اس لیے اس سلسلے میں مزید تحقیق درکار ہے۔ درد کا ہی یہ شعر ہوگا۔

14. صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
(غالب، دیوانِ غالب، ص625)

15. ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
(غالب، دیوانِ غالب، ص626)

16. وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا
(خواجہ میر درد، دیوانِ درد، ص60، تذکرہ میر حسن، ص75)

ایک بار ممبئی میں منعقد ایک بہت بڑے فلمی اجلاس میں جہاں بڑے بڑے لوگ ہندی فلموں کی تعریف و تحسین کے پل باندھ رہے تھے، تب مشہور ایکٹر شری منوج کمار جی اسٹیج پر چند الفاظ میں اپنا اظہارِ خیال کرنے کے لیے مدعو کیے گئے، انھوں نے یہ چند بیش قیمت الفاظ کہہ کر اسٹیج سے اترنا ہی مناسب سمجھا کہ ''آپ سب لوگ اردو پڑھتے اور لکھتے ہیں، جب کہ ہم فلم والے اردو زباں کو جیتے ہیں۔'' اور صرف اتنے الفاظ کہہ کر ہی عظیم اداکار اسٹیج سے نیچے اُتر گئے تھے۔ کوزے میں سمندر بھرنے کی ضرب المثل اِس سے زیادہ بھلا کیسے اور کب صادق آسکتی ہے؟

اس طرح ہندی فلموں کے نغمہ نگاروں نے اردو شاعری کے چیدہ چیدہ اشعار سے اپنے نغموں کے خط و خال یا نقش و نگار کی تشکیل دیتے وقت متواتر استفادہ کیا

> ایک بار ممبئی میں منعقد ایک بہت بڑے فلمی اجلاس میں جہاں بڑے بڑے لوگ ہندی فلموں کی تعریف و تحسین کے پل باندھ رہے تھے، تب مشہور ایکٹر شری منوج کمار جی اسٹیج پر چند الفاظ میں اپنااظہارِ خیال کرنے کے لیے مدعو کیے گئے، انھوں نے یہ چند بیش قیمت الفاظ کہہ کر اسٹیج سے اترنا ھی مناسب سمجھا کہ "آپ سب لوگ اردو پڑھتے اور لکھتے ھیں، جب کہ ھم فلم والے اردو زباں کو جیتے ھیں۔" اور صرف اتنے الفاظ کہہ کر ھی عظیم اداکار اسٹیج سے نیچے اُتر گئے تھے۔ کوزے میں سمندر بھرنے کی ضرب المثل اِس سے زیادہ بھلا کیسے اور کب صادق آسکتی ھے؟

ہے۔ اگر چہ مرزا غالب کے نام سے پوری فلم ہی بنائی گئی تھی، تو بعض فلموں میں شاعروں کی غزلوں، نظموں و گیتوں کا با موقعہ استعمال کیا گیا ہے، مثلاً فلم 'پھر صبح ہوگی' میں ساحر لدھیانوی کے 'وہ صبح کبھی تو آئے گی' لائن سے شروع مکمل نغمے کو بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح فلم 'امراؤ جان' میں شامل شہر یار کی 'یہ کیا جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے، حدِ نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے' مطلع سے شروع ہونے اور آشا بھونسلے کی شیریں آواز سے مزین غزل بے حد مقبولِ عام رہی ہے۔ کسی فلم میں شاعرِ اعظم میر تقی میر کی 'پتا پتا بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے، جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے' (کلیاتِ میر، ص760) مطلع سے شروع ہونے والی غزل اور فلم 'لال قلعہ' میں بہادر شاہ ظفر کی مشہور و معروف 'لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں/ کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں' مطلع دیکھیں اور گلوکار محمد رفیع اور موسیقار ایس این تریپاٹھی والی غزل اور فلم 'دھول کا پھول' میں ساحر لدھیانوی کی موسیقی کے ساتھ این دتا، کے سدا بہار نغمے 'تو ہندو بنے گا، نہ مسلمان بنے گا/ انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا' کی ادبی صلاحیتوں کی مانند متعدد مثال بھی دستیاب ہونے عین ممکن ہیں۔ اصل میں اس نوعیت کے تمام ادبی و فنی شعری اثرات سے متعلق ایک وسیع تحقیق آج کے وقت کی ایک ناقابلِ تردید مانگ یا ضرورت کہی جاسکتی ہے۔

آخر میں میری التجا ہے کہ اس مضمون کے توسط سے خاکسار نے اپنی کمزور یادداشت کی مدد سے ہندی فلموں کے چند نغموں کی ہی اردو اشعار میں ماخذوں کی تحقیق و تفتیش کرنے کی ایک حقیری سی سعی ہی کی ہے۔ میرا خاص مقصد یہ رہا ہے کہ اردو ادب کے بلند پایہ و مایۂ ناز مدرس، ناقد و محقق صاحبان اِسی زاویے و پہلو سے اپنے ملک کے ہندی فلمی نغموں کی تحقیق کرنے کا جلد از جلد بیڑا اٹھائیں، تاکہ سرشار سیلانی، مجروح سلطان پوری، قتیل شفائی، کیفی اعظمی، راجہ مہدی علی خان، راجیندر کرشن، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر، آنند بخشی، شیلندر، حسرت جے پوری، خمار بارہ بنکوی، اختر رومانی، دیوکوہلی، سمیر، قمر جلال آبادی، یوگیش، پریم دھون، گلزار، جی ایل راول، نیرج، نقش لائل پوری، اسد بھوپالی، اندر جیت سنگھ تلسی، انجان، اندیور، ساون کمار، بھرت ویاس، گوہر کان پوری، حشمت، ورما ملک، پردیپ وغیرہ بے شمار شاعروں نے نغموں کو بھی جس ادبی معیار کی بلندیوں سے وقتاً فوقتاً نوازا ہے، اس بھولے بسرے پہلو کی بھی مناسب خط کشی ممکن ہو سکے۔ اگر میرا یہ مقالہ اِس ضمن میں کچھ بھی محرک ثابت ہو سکا، تو میں اپنی محنت کو رائیگاں نہیں سمجھوں گا۔

عرفان صدیقی کے اِس شعر کے حوالے سے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں 'کبھی تو کوئی پڑھے گا لکھا ہوا میرا، کبھی تو کام یہ شوقِ فضول بھی دے گا'۔

□

Dr. Krishan Bhavuk, Kothi No. 201-A, Guru Nanak Nagar, Street No. 18, K, Patiyala-147003 (Punjab)

ہندوستانی سنیما اور قومی سیاست

■ زین شمسی

جب ہمارا ملک انگریزوں کا غلام تھا اور ہر ہندوستانی اپنی جان کی بازی لگا کر ہندوستان کو آزاد کرانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ ایسے وقت میں فلمسازوں نے بھی فلموں کے ذریعے ہم وطنوں کے ساتھ آزادی کی لو تیز کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک ایسے دور میں جب ہر طرف انگریزوں کے ظلم و تشدد کا بازار گرم تھا اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ایسے حالات میں حب الوطنی پر مبنی فلمیں بنانا جوکھم بھرا کام تھا۔ غلامی کی زندگی جی رہے ہندوستانیوں کے لیے انگریزوں کے ذریعے عائد سنسر حق آزادی چھیننے کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ ایسی صورت میں فلمسازوں نے ایک ترکیب نکالی اور ہندوستانیوں میں حب الوطنی کو بیدار کرنے کے لیے گیتوں کا سہارا لیا اور گیتوں کا کبھی براہ راست تو کبھی علامتی طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ فلمسازوں نے فلموں میں ایسے گیت رکھے، جن کو سن کر لوگوں کے دلوں میں ملک کی محبت بڑھتی جاتی تھی اور انگریزوں سے لڑنے کا ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

حب الوطنی پر مبنی فلم 'جنم بھومی' 1936 میں آئی تھی۔ اشوک کمار اور دیویکا رانی کی اس فلم کے گیت تھے 'گاؤں کی ماٹی مات ہماری .. گئی رات آیا پربھات ہم ہیں ندرا سے جاگے ..' اور 'سیوا کے ہم ورت دھاری سیوا سے نہیں ہٹیں گے ...' 1940 میں آئی 'بندھن' کے گیت شاعر پردیپ نے لکھے تھے 'چل چل رے نوجوان، رکنا تیرا کام نہیں چلنا تیری شان .. تو آگے بڑھتے جا آفت سے لڑتے جا آندھی ہو یا طوفان، چل چل رے نوجوان ...' اس گیت کو دہلی کی ایک نمائش میں جب لوگوں نے پہلی دفعہ سنا، تو وہ دیر تک وطن عزیز کی محبت میں ڈوب کر تالیاں بجاتے رہے۔ اسی سال دو فلمیں ایسی آئیں، جو قومی جذبے سے سرشار تھیں۔ ایک تھی 'ہند کا لال' جس کا گیت تھا 'ڈگمگ ڈولے دیش کی نیا پار لگاؤ کرشن کنہیا ..'۔ دوسری فلم تھی 'ہندوستان ہمارا'۔ اس فلم کا لازوال گیت تھا 'تمھیں کیا بتائیں کہ کیا چاہتے ہیں، دکھی ہیں دکھوں کی دوا چاہتے ہیں ...' 1941 میں 'نیا سنسار' میں فلم کے ہیرو اور ہیروئن اشوک کمار اور رینوکا دیوی کی آواز میں ایک گیت فلمایا گیا تھا 'ایک نیا سنسار بسا لیں ایک نیا سنسار، ایسا ایک سنسار کہ جس میں دھرتی ہو آزاد کہ جس میں بھارت ہو آزاد ...' اسی سال سہراب مودی کی منروا مووی ٹون نے فلم بنائی 'سکندر'۔ اس کے ایک گیت کی دھن تھی 'زندگی ہے پیار سے پیار میں لٹائے جا، آگے بڑھ کے اپنی جان داؤ پر لگائے جا ...' جب نیتا جی سبھاش چندر بوس نے دوسری جنگ عظیم کے وقت آزاد ہند فوج بنائی تو اسی گیت کی طرز پر بنے ایک گیت کو علامت کے طور پر منظور کیا گیا، جس کے بول تھے 'قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا، یہ زندگی ہے

قوم کی تو قوم پر لٹائے جا...'

1942 میں جب گاندھی جی نے 'انگریزو! بھارت چھوڑو' کا نعرہ دیا، اس کے ٹھیک ایک سال بعد فلم 'قسمت' کا گیت' آج ہمالیہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے، دور ہٹو اے دنیا والوں ہندوستان ہمارا ہے ...' کے بول سے صاف تھا کہ اس میں ملک کی سماجی ثقافتی اور بین مذاہب رواداری کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا تھا۔ فلم 'بھنورا' کا گیت 'ٹھکرا رہی ہے دنیا ہم ہیں کہ سو رہے ہیں، برباد ہو چکے تھے برباد ہو رہے ہیں ...' میں ملک کی خستہ حالی کے اشارے تھے۔ سنسر شپ پر سہراب مودی کی فلم 'پکار' میں اس گیت کے ذریعے طنز کیا گیا تھا، بول تھے 'زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے، بج رہا ہے اور بے آواز ہے ...' 1946 میں 'اپٹا' نے خواجہ احمد عباس کی ہدایت میں فلم 'دھرتی کے لال' بنائی۔ فلم کی ہیروئین ممتاز شانتی اظہار رائے کی آزادی کی وکالت ان الفاظ میں کرتی ہیں، 'اب نہ زباں پر تالے ڈالو، جی کا حال سنانے دو..'

1946 کے آغاز کے ساتھ ہی ملک میں آزادی کی کرنیں دکھائی دینے لگی تھیں اور آزادی کے متوالوں کے خلاف انگریزوں کے ظلم وستم میں اضافہ ہو چکا تھا لیکن فلم ساز ایسے موضوع والی فلمیں بنانے سے پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے، ساتھ ہی ساتھ نغمہ نگار بھی اپنے الفاظ سے تیر چلانے میں کمی نہیں کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے پہلے ریلیز ہونے والی ایسی کچھ فلموں میں ہمیں ہندوستانیت اور حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آجاتی ہے۔ 15 اگست 1947 کو ملک آزاد ہو گیا، لیکن ایسی فلمیں بعد میں بھی آتی رہیں۔ 1948 میں فلمستان کی ایک فلم آئی 'شہید'۔ اس فلم کے گیت 'وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو...' کو فلم میں اس وقت رکھا گیا تھا، جب شہید (دلیپ کمار) کی لاش لے جائی جاتی ہے۔ ناظرین تو اس فلم کو دیکھتے ہوئے اس وقت روئے ہی تھے، محمد رفیع کے ذریعے گائے اس گیت کو سن کر دل آج بھی بھر جاتا ہے۔ وطن سے محبت کا کوئی بھی موقع ہو یا کسی بھی قومی تقریب پر ہمیں یہ نغمہ اپنے خوبصورت بول کے ساتھ سنائی دے جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک امر گیت 1950 میں آئی فلم 'ہندوستان ہمارا' میں تھا۔ اس فلم کا گیت ڈاکٹر اقبال کا لکھا 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا..' تھا اور ترانہ ہندی کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد مختلف وجوہات کی بنا پر فلم بنانے کا کاروبار ملک کے تین بڑے شہروں ممبئی، کولکاتا اور چنئی تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ان میں سے ممبئی ہندی اور مراٹھی فلموں کا گڑھ بنا۔ آزادی کے ارد گرد پنے اور کولہاپور میں اکا دکا مراٹھی فلمیں بنتی تھیں۔ تقسیم کے بعد لاہور سے کئی فلمی ہستیوں نے ممبئی کی طرف رخ کیا۔ اگر ملک تقسیم نہ ہوا ہوتا، تو یقیناً ہندوستانی فلموں کی تاریخ میں ممبئی کے ساتھ ساتھ لاہور بھی ایک بڑا مرکز رہا ہوتا اور یقیناً پوری دنیا میں ہماری فلم انڈسٹری کا ڈنکا بجتا۔

ہندوستانی سنیما کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کچھ ایسی فلمیں بھی ہیں جو فرقہ پرستی اور عوام کی سچی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان فلموں میں اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ملک میں فرقہ

اتنے بڑے سانحے کو بھلا کوئی فن نظر انداز کر سکتا ھے؟ کوئی بھی فن سچائی سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ وقت کی اھمیت، المیہ، حالات اور مسائل کی عکاسی فنون سے ممکن ھے۔ ھندی، اردو، پنجابی، سندھی اور بنگالی زبان کے ادب میں تقسیم کا المیہ اور اس سانحے کو مختلف صورتوں میں ظاھر کیا گیا ھے۔ مشھور نغمہ نگار گلزار کا کھنا ھے کہ تقسیم کے وقت اور دھائیوں بعد تک ادیب تقسیم کا درد صفحہ قرطاس پر بکھیرتے رھے اور انسانی نقطہ نظر سے دونوں ھی سرحدوں کے مجبور شھریوں کی کتھا کھتے رھے۔ ملک کے سیاستدانوں نے دو ملکی نظریے کے اصول کی بنیاد پر ھندوستان اور پاکستان کی اھمیت قبول کر لی مگر ادیبوں نے اسے کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ھی اپنی تخلیقات میں اسے منظوری دی۔

پرستی، دو مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات فطری نہیں ہیں بلکہ یہ سیاسی مفاد حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ ان فلموں میں کسی کو براہ راست قصوروار نہیں ٹھہرایا جاتا ہے بلکہ واقعات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جاتا ہے۔ مضبوط اسکرپٹ اور تاریخی پس منظر کی مدد سے سچ کو سچ کے طور پر پردہ سیمیں پر اتارا گیا ہے۔ یہاں حب الوطنی کا ابال اور قومیت کی بلاوجہ تشہیر نہیں ہے بلکہ انسانیت اور انسانی المیے کو گہرائی کے ساتھ دیکھنے کی کامیاب کوشش ہے۔ شدت پسندی اور فاشزم پر نکیل کسی گئی ہے۔ حقیقت کی عکاسی تو ہے ہی، ساتھ ہی ایک دوسرے سے نفرت کی وجہ بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ فلمیں فن کی سطح پر بھی بہت کامیاب ہیں۔ ایسی فلموں میں گرم ہوا (1973)، تمس (1987)، ٹرین ٹو پاکستان (1997)، شہید محبت (1999)، نسیم (1995)، ممو (1994)، 1947 دی ارتھ (1999)، مسٹر اینڈ مسیز ایّر (2002)، ماچس (1996)، پنجر (2003) قابل ذکر ہیں۔

ہندوستانی فلموں میں مسلمانوں کو منظر پر لانے کے لیے زیادہ تر فلم ساز ان سے اضافی حب الوطنی کا مطالبہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ اس خیال کی تردید کرتے ہیں، جو تقسیم کی وجہ سے ملک میں رہ گئے مسلمانوں کے ذہن میں آیا تھی۔ ہندوستان کی حکومت نے ملک کی اکثریتی آبادی کے ذہن میں یہ بات غیر محسوس طور پر بٹھا دی تھی کہ مسلمانوں نے ہی ملک کو تقسیم کروایا۔ نتیجے میں ملک میں بچے مسلمانوں کے لیے بالواسطہ طور پر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ملک کے تئیں اپنی حب الوطنی کو ثابت کریں۔ سنیما جیسے مقبول ذرائع سے اس رویے کی تشہیر ہو سکتی تھی۔ اس کو ایم ایس ستھیو، دیپا مہتا، شیام بینگل، گووند نہلانی جیسے ہدایتکاروں نے توڑا۔ یہ روایت آگے بڑھی جس میں اپرنا سین، پرکاش جھا، اور 'پنجر' کے ڈائریکٹر کے طور پر ڈاکٹر چندر پرکاش دویدی کا اہم رول ہے۔ شیام بینگل کے مطابق آزادی کے چند برسوں کے بعد مسلم کرداروں کو ترجیح دی گئی۔ خاص طور پر پاکستان سے آئے فلم سازوں نے خاص توجہ دی، لیکن ان کے مسلمان کردار ان ہی کی دنیا سے تھے۔ ہندوستان آنے سے قبل وہ تمام مسلمان خاندانوں کے ساتھ ایک ہی بستی میں رہتے تھے۔

ہندوستان میں فرقہ پرستی اور قوم پرستی کی بات ملک کی تقسیم کو شامل کیے بغیر نہیں کی جا سکتی ہے۔ ملک کی تقسیم صرف جغرافیائی تقسیم نہیں تھی بلکہ اعتماد، یکجہتی اور انسانیت کی بھی تقسیم ثابت ہوئی۔ نہرو اور جناح نے شاید ہی سوچا ہو کہ تقسیم اتنی خطرناک ثابت ہوگی۔ نقل مکانی اور باز آباد کاری کے درمیان لاکھوں زندگیاں تلف ہو جائیں گی اور لاکھوں دلوں سے درد و کرب نصف صدی کے بعد بھی سماج کو زخم خوردہ کرتے رہیں گے۔ آج ہندوستان اور پاکستان جس طرح مختلف النوع تکالیف سے دوچار ہیں، اس کا بیج تقسیم میں چھپا ہوا ہے۔ تقسیم وطن ایک ایسا سانحہ تھا جس سے ہندوستان اور پاکستان اب تک نہیں نکل پائے ہیں۔

دونوں ممالک کے درمیان اب تک تین خطرناک لڑائیاں ہو چکی ہیں باوجود صورتحال جوں کی توں بنی ہوئی ہے۔

اتنے بڑے سانحے کو بھلا کوئی فن نظر انداز کر سکتا ہے؟ کوئی بھی فن سچائی سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ وقت کی اہمیت، المیہ، حالات اور مسائل کی عکاسی فنون سے ممکن ہے۔ ہندی، اردو، پنجابی، سندھی اور بنگالی زبان کے ادب میں تقسیم کا المیہ اور اس سانحے کو مختلف صورتوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مشہور نغمہ نگار گلزار کا کہنا ہے کہ تقسیم کے وقت اور دہائیوں بعد تک ادیب تقسیم کا درد صفحہ قرطاس پر بکھیرتے رہے اور انسانی نقطہ نظر سے دونوں ہی سرحدوں کے مجبور شہریوں کی کتھا کہتے رہے۔ ملک کے سیاستدانوں نے دوملکی نظریے کے اصول کی بنیاد پر ہندوستان اور پاکستان کی اہمیت قبول کر لی مگر ادیبوں نے اسے کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی اپنی تخلیقات میں اسے منظوری دی۔ تقسیم کے پس منظر میں بہت سارا ادب تخلیق کیا گیا، مگر حیرت ہے کہ فلمسازوں میں تقسیم کے لیے ویسی فکر نظر نہیں آئی۔ ادیبوں کی طرح کئی ایسے فلم ساز بھی تھے، جو تقسیم کی لپٹوں کی گرفت سے نکل کر آئے تھے، پھر بھی وہ خاموش رہے اور تفریح کے نام پر خیالی یا حقیقی محبت کی کہانیاں ناظرین کو پیش کرتے رہے۔

چونکہ ملک کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہوئی تھی اس لیے بٹوارے کے بعد جو نفرت پھیلی وہ مذہبی منافرت ہی تھی۔ شاید ہمارے فلم ساز بٹوارے کی تلخ حقیقت کو موضوع بنانے میں ڈرتے ہوں گے تاکہ کوئی فرقہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس موضوع پر طویل عرصے تک ہماری فلم نگری میں سناٹا چھایا رہا۔ 1973 میں ایم ایس ستھیو نے 'گرم ہوا' بنا کر اس خالی پن کو دور کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس کرایا۔ 'گرم ہوا' میں تقسیم کے بعد پیدا ہوئے بحران سے مختلف سوالات کو اٹھایا گیا۔ آخر کوئی مسلمان اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان کیوں جائے؟ صرف مقام کی بات نہیں ہے بلکہ روزگار، کاروبار، گھر، زمین، سماج سب کو ایک ساتھ اس لیے چھوڑ دے کہ وہ مسلمان ہے؟ اس فلم کا کردار سلیم (بلراج ساہنی) سوال اٹھاتا ہے کہ کیا میں نے پاکستان مانگا تھا؟ جس نے پاکستان مانگا تھا اور جس نے بنایا، وہ جائے میں کیوں جاؤں؟ یہ ایک اہم اور انقلابی سوال تھا۔ اس فلم نے اس وقت سوال اٹھایا جب ہندوؤں کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان دے دیا گیا ہے اور انھیں پاکستان جانا چاہیے۔ فلم کی نمائش پر پابندی بھی لگا دی گئی لیکن اندرا گاندھی کی مداخلت کے بعد یہ فلم ناظرین کے سامنے پیش کی گئی۔

'گرم ہوا' کے بعد ایسا لگ رہا تھا کہ اب اس موضوع پر فلمسازوں کی نظر جائے گی جس کے نتیجے میں اور کئی فلمیں بنیں گی جس سے ہمارے سیاسی نظام میں ماضی قریب کے بڑے سانحہ پر سوچنے کا ماحول تیار ہوگا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ فلمسازوں نے اس میں دلچسپی نہیں دکھائی۔ 'گرم ہوا' کے بعد 1987 میں گووند نہلانی نے 'تمس'، فلم بنائی۔ اس سے پہلے انھوں نے 'تمس' سیریل کی ہدایت کاری کی تھی۔ 'تمس' تقسیم اور فرقہ پرستی پر ایک غیر جانبدارانہ فلم تھی جو تقسیم کی مختلف سازشوں کو نمایاں کرتی ہے۔ تقسیم پر بنی تیسری اہم فلم 'ٹرین ٹو پاکستان' (1997) ہے۔ پامیلا روکس کی ہدایت میں بنی اور خشونت سنگھ کے ناول پر مبنی اس فلم میں تھیٹر اور آرٹ فلم کے تین تجربہ کار فنکاروں (موہن اگاشے، نرمل پانڈے، رجت کپور) نے اداکاری کی۔ فلم میں اسمرتی مشرا نے مسلم لڑکی کا کردار ادا کیا ہے۔ روزانہ لاشوں سے پٹی گاڑیاں گاؤں سے ہو کر گزرتی لیکن کسی کو پروا نہیں۔

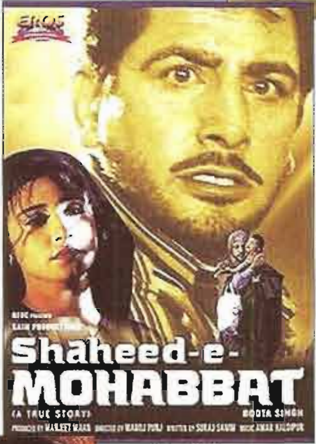

مقامی مجسٹریٹ عیش پرستی میں ملوث ہے۔ ایک دن ایک کمیونسٹ کارکن (رجت کپور) گاؤں پہنچتا ہے اور لوگوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرقہ پرستی کی آگ میں جھلستے پنجاب میں سکھ ڈاکو (نرمل پانڈے) اور مسلم لڑکی (اسمرتی مشرا) کی محبت کی کہانی گویا زندگی کی امید جگاتی ہے۔ بٹوارے کی سیاست سے بے خبر یہ عاشق جوڑا نفرت اور کدورت کے ماحول میں انسانیت کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

1999 میں بنی 'شہید محبت' بٹوارے پر پنجاب میں ہونے والے واقعات پر مبنی ہے۔ آج بھی اسے پنجاب کی ویرگاتھاؤں کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس فلم میں ریٹائرڈ فوجی بوٹا سنگھ (گرداس مان) اپنے گاؤں لوٹتا ہے تو دیکھتا ہے چاروں طرف تشدد اور نفرت کی آگ پھیلی ہے۔ تقسیم وطن کے بعد نقل مکانی اور باز آبادکاری کی جدوجہد میں ہندو مسلمان اور سکھ آپس میں ہی ٹکرا رہے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک جتھا پاکستان جا رہا ہے۔ تب ہی سکھ فسادی حملہ کرتے ہیں اور زینب نام کی لڑکی کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ بوٹا سنگھ اس کی جان بچانے کے لیے اسے خرید لیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں اور شادی کر لیتے ہیں۔ ایک دن زینب (دویا دتہ) ایک بچی کو جنم دیتی ہے۔ بوٹا انتہائی خوش ہے، لیکن اس کی خوشی قدرت کو راس نہ آئی۔ اچانک ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان معاہدے کے مطابق زینب کو یرغمال خاتون کے طور پر شناخت کیا گیا۔ اسے پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ فلم کا آخری منظر بہت جذباتی ہے۔ سرحد پر لگائے گئے خاردار تاروں کے ایک طرف بوٹا سنگھ اور اس کی چھوٹی بچی اور دوسری طرف اس کی بیوی زینب۔ یہ تار طاقت کی علامت ہے جو انسانی رشتوں میں حائل رکاوٹوں کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ فلم سیاسی فیصلوں اور نظام مذہب اور روایات کو کٹہرے میں کھڑا کرتی ہے۔

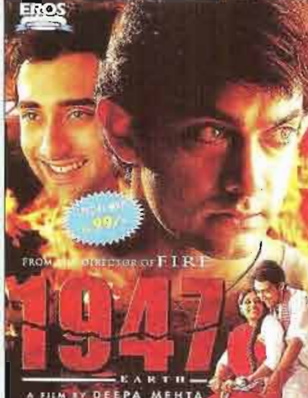

'شہید محبت' میں رگھویر یادو کا جو کردار تشکیل کیا گیا ہے وہ انتہائی دل کو چھو لینے والا ہے۔ ایک ایسا شخص جو نہیں جانتا ہے کہ ہندو، مسلمان اور سکھ میں کیا فرق ہے۔ وہ ویسا عام آدمی ہے جو نہ تو تعلیم یافتہ ہے نہ ہی اس میں کوئی سیاسی بیداری ہے۔ اس کے باوجود وہ سماج میں سب کے ساتھ اپنے خول میں جیتا ہے۔ اس کے لیے مندر، مسجد، گرودوارا کچھ بھی اچھوتا نہیں ہے۔ وہ پوجا کے

مقامات پر پوجا کے لیے نہیں بلکہ پرساد کے لیے جاتا ہے لیکن ہندو فسادی اسے صرف مسلم ہونے کی وجہ سے مار ڈالتے ہیں۔

90 کی دہائی میں ہندی سینما میں مسلم کردار مضبوطی کے ساتھ اپنی موجودگی درج کرانے لگے تھے۔ ملک کے سیاسی حالات بھی 90 کی دہائی میں فرقہ واریت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ 1994 میں شیام بینگل نے جو کہ سنجیدہ فلم ساز کے طور پر جانے جاتے ہیں، 'مموُ' بنائی۔ حالانکہ مموُ میں واضح طور پر فرقہ واریت اور تقسیم کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے لیکن تقسیم کے بعد الگ ہوئے خاندانوں اور ان کے تئیں ہندستان میں سسٹم کے برتاؤ پر فوکس کیا گیا ہے۔ اس فلم میں دو بہنوں کی کہانی ہے۔ بٹوارے کے بعد محمودہ (مموُ) اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان چلی جاتی ہے شوہر کے اچانک انتقال ہو جانے کی وجہ سے خاندان والے اس کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کرتے ہیں۔ وہ پاکستان سے ہندوستان اپنی بہن کے یہاں ممبئی آ جاتی ہے۔ مموُ تین مہینے کا ویزا لے کر آتی ہے لیکن تین ماہ بعد بھی وہ جانا نہیں چاہتی ہے۔ وہ پولس انسپکٹر سے ویزا کی مدت بڑھانے کی درخواست کرتی ہے۔ مموُ انسپکٹر سے کہتی ہے بیٹا یہ میرا وطن ہے۔ میں ہندوستانی ہوں، میرا جنم ہریانہ کے پانی پت میں ہوا تھا۔ انسپکٹر کہتا ہے کہ یہ دو جنموں کی بات نہیں ہے دو ملکوں کی بات ہے۔ ملک کے بٹوارے نے مموُ کو کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے اس کے پاس سب کچھ تھا لیکن اچانک ایک فیصلہ اسے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ یہ صرف ایک مموُ کی کہانی نہیں ہے بلکہ مموُ جیسی کتنی خواتین بیگانے پن کی شکار رہی ہیں۔ مموُ کو قانون ہندوستان میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا ہے بالآخر اسے پاکستان جانا پڑتا ہے۔ لیکن مموُ آخر تک مانتی نہیں ہے۔ اس فلم کے ذریعے بینگل نے بھی سوال اٹھایا ہے کہ کوئی مسلمان پاکستان کیوں جائے جہاں اپنا کوئی ہے ہی نہیں۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ مسلمان ہے؟

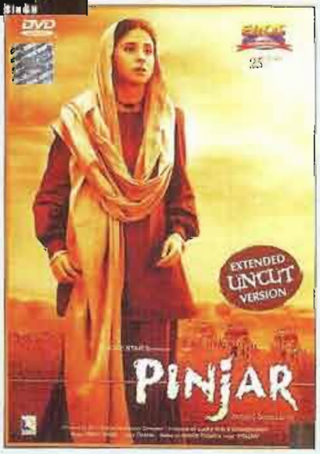

تقسیم وطن کے بطن میں بھٹکتے درد کو تلاش کرنے کی کوشش کے طور پر گرم ہوا سامنے آئی۔ ہندی سینما کی تاریخ میں سب سے بہترین فلموں میں 'گرم ہوا' سب سے کم لاگت میں بنی فلموں میں سے ایک ہوگی۔ 1973 میں اس فلم کی لاگت 8 لاکھ روپے کے آس پاس تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جس نے تقسیم کی تباہی کے بعد پھیلے مایوسیوں اور ناامیدیوں کے اندھیرے میں زندگی کی سچائیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ایم ایس ستھیو کی ہدایت میں بنی یہ فلم ہندوستانی فلم میں آرٹ فلموں کو جنم دینے والی فلموں میں سے ایک ہے۔ فلم مشہور مصنفہ عصمت چغتائی کی ایک غیر شائع شدہ کہانی پر مبنی ہے۔ آگرہ میں رہ رہا ایک جوتے کا تاجر سلیم مرزا (بلراج ساہنی) جو تقسیم کے بعد پاکستان نہیں جانا چاہتا اور ہندوستان میں ہی رہنا چاہتا ہے۔ سلیم مرزا کی لڑکی امینہ اپنے ہی کزن قاسم سے محبت کرتی ہے اور دونوں شادی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ دیگر ہندوستانی مسلمانوں کی طرح سلیم مرزا کے رشتے دار بھی ایک ایک کر کے پاکستان روانہ ہو رہے ہیں اور قاسم بھی اپنے والد کے ساتھ پاکستان جاتا ہے، اس وعدے کے ساتھ کہ وہ واپس آ کر آمنہ سے نکاح کرے گا۔ سلیم مرزا غمگین دل سے سب کو رخصت کر رہے ہیں اس امید میں کہ، ایک دن سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سلیم مرزا اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلانے میں دشواری کا سامنا کر رہا ہے کیونکہ اسے آج اپنے ان حقوق کے لیے لڑنا پڑ رہا ہے جو کل تک اسے آسانی سے میسر تھے، جس کی وجہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور سے اس کا مسلمان ہونا ہی ہے۔ اس دوران اپنے وعدے کے مطابق قاسم نکاح کے لیے واپس آتا ہے لیکن سیاسی وجوہات کی بنا پر اسے نکاح کے پہلے ہی گرفتار کر کے واپس پاکستان بھیج دیا جاتا ہے اور یہ قاسم کی امینہ سے آخری ملاقات ثابت ہوتی ہے۔

دکھی امینہ کو ایک بار پھر اپنا پیار شمشاد (جلال آغا) میں دکھائی دیتا ہے، جو امینہ کو ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا تھا۔ کاروبار میں ہو رہا نقصان اور ہر جگہ سے مل رہی مایوسیوں کی وجہ سے سلیم مرزا کا بڑا بیٹا بھی پاکستان جانے کا فیصلہ کرتا ہے اور اب سلیم مرزا اپنی بیٹی، بیوی (شوکت اعظمی) اور چھوٹے بیٹے سکندر (فاروق شیخ، جو ہمیشہ سے ہی ہندوستان میں رہنے کا طرفدار ہے) کے ساتھ ہندوستان میں رہ جاتا ہے۔

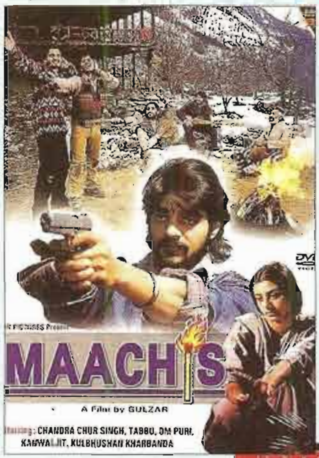

امینہ ایک بار پھر مایوس ہے۔ شمشاد کا خاندان بھی پاکستان جا رہا ہے۔ ایک بار پھر شمشاد بھی امینہ سے وعدہ کر کے جاتا ہے کہ وہ اپنی ماں کو بھیج کر اسے پاکستان بلا لے گا۔ پاکستان میں اچھا مستقبل ملنے کی امید، ہندوستان میں اس کے ساتھ ہو رہی تفریق، گھر سے بے گھر ہو جانے اور دوسری طرف بیٹی کا غم سلیم مرزا کی ہمت توڑ دیتا ہے اور ان حالات میں وہ اپنا آخری فیصلہ کرتا ہے۔

فلم کا مقصد تقسیم اور گاندھی جی کے قتل کے بعد ملک میں مسلم فرقے میں ہو رہی اتھل پتھل اور ان کے تئیں عوام کی سوچ میں آ رہی تبدیلی کو دکھانا ہے، جس میں ڈائریکٹر ایم ایس ستھیو پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی پہلی فلم تھی لیکن بطور ہدایت کار انھوں نے اس فلم سے اپنا لوہا منوایا۔ کم لاگت میں کسی بھی فلم کو سمیٹنا اپنے آپ میں ایک چیلنج ہوتا ہے۔ ستھیو نے نہایت ہی نازک معاملات کو بڑی سنجیدگی سے سنبھالا ہے۔ سلیم مرزا بینک منیجر اور مالک مکان سے بات کرتے وقت اور سکندر ملازمت کے انٹرویو کے دوران، براہ راست کیمرے پر بات کرتا ہے اور سامنے والے شخص کو نہیں دکھایا جاتا۔ یہ بہت ہی مؤثر منظر کشی ہے۔ فلم کے مکالمے کیفی اعظمی اور شمع زیدی کے لکھے ہیں جو عام زبان میں ہیں اور تمام حالات کا پوری طرح انکشاف کرنے کے قابل ہیں۔ فلم مسلم سماج کے اندر ہو رہی تبدیلی اور سوچ کے تمام پہلوؤں کو بخوبی چھوتے ہیں۔

■

Zainul Haque Shamsi,
Roznama Urdu Sahara

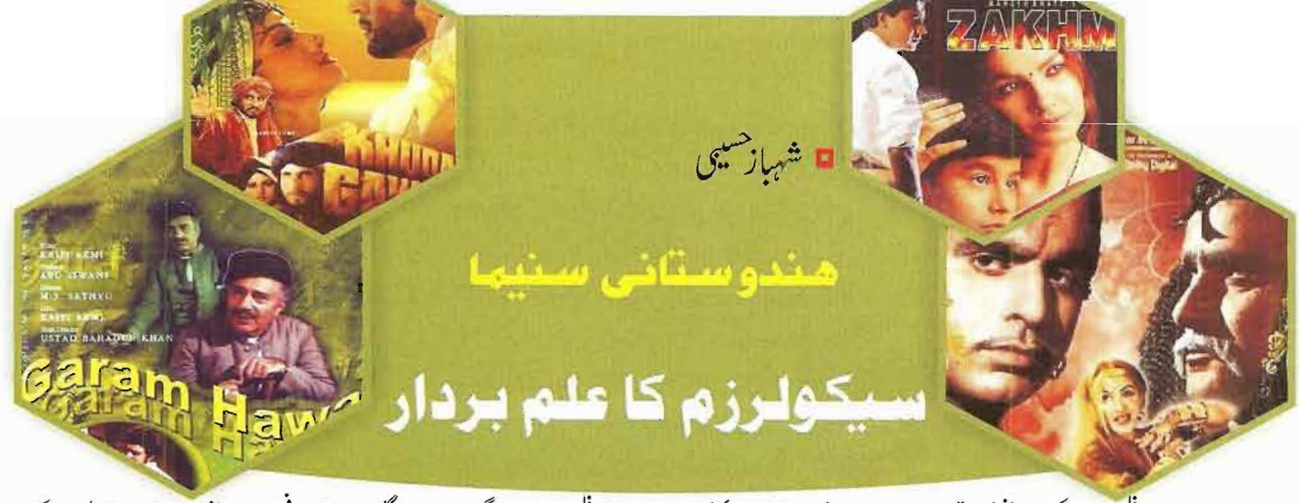

ہندوستانی سینما

سیکولرزم کا علم بردار

شہباز حسینی

ہندوستان میں فلم سازی کی تاریخ کے مختلف ادوار اوران میں بیان کیے جانے یا برتے جانے والے مختلف موضوعات پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان فلمی داستانوں کا مرکز اورمحور تو ہر دور میں انسانی زندگی ہی رہی ہے، لیکن فلمی کہانیوں کے موضوعات کا مرکزی خیال یا تھیم انسان دوستی پر ہی مبنی رہا ہے۔ 1913 کی پہلی خاموش فلم راجہ ہریش چندر سے اب تک کی ہر بولتی فلم کی کہانی کا مرکزی خیال انسان دوستی پر مبنی نظر آتا ہے۔ بعد میں 1931 کی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' کا بھی مرکزی خیال انسانی زندگی اور انسان دوستی پر ہی مرکوز رہا ہے اور آگے بڑھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم اور ہندوستان کی تحریک آزادی کے بحرانی عہد کے دوران فلم ساز آنجہانی وی شانتارام نے اس دور کی معرکۃ الآرا فلم 'پڑوسی' پیش کی۔ آنجہانی شانتارام نے اس فلم میں انتہائی مہارت کے ساتھ فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ بعدازاں 1945 میں نمائش کے لیے پیش کی جانے والی فلم 'ہمراہی' میں بھی انسانی قدروں کو انتہائی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ اجاگر کیا گیا تھا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہندوستان میں یہ عہد ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ ظاہر ہے کہ اس دور کی فلموں پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کا مرتب ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں لیا جانا چاہیے کہ فلموں میں نمائش کی جانے والی انسانی قدروں کی پاسداری صرف ترقی پسند تحریک کی ہی مرہون منت تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسانی خمیر میں موجود انسان دوستی اور آپسی بھائی چارے کو ترقی پسند تحریک نے خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

بعدازاں 1945 میں ہدایت کار بمل رائے نے اپنی فلم 'ہمراہی' پیش کی۔ انھوں نے اس فلم میں وطن دوستی اور انسانیت نوازی کے جذبات کو نہایت باکمال طریقے سے پیش کیا تھا۔ یہاں اس تاریخی سچائی کا بیان بھی غلط نہ ہوگا کہ ہدایت کار بمل رائے نے اپنی فلم ہمراہی میں گورو دیو رابندرناتھ ٹیگور کے ترانے 'جن گن من ادھی نائک جے ہے بھارت بھاگیہ ودھاتا' کو وطن دوستی اور حب الوطنی کے قومی ترانے کے طور پر پیش کیا تھا۔ بعد میں اس ترانے کو ہندوستان کے قومی ترانے کی حیثیت حاصل ہوئی۔

تحریک آزادی کی کامیابی اور آزادی وطن کے موقع پر ہی ملک وقوم کو 1947 میں تقسیم کے خوفناک سانحے سے دوچار ہونا پڑا۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ انسانی رشتے تقسیم ہوگئے۔ فلمی دنیا بھی تقسیم وطن کے مہلک اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اس دور کی فلمی صنعت پر تقسیم ملک کے مضر اثرات بیان کرتے ہوئے معروف مصنف مہندر متل بھارتیہ چل چتر کی کہانی میں لکھتے ہیں کہ ''تقسیم وطن سے پہلے ہندوستان میں تقریباً 60 فلم اسٹوڈیو تھے۔ تقسیم کے بعد ان میں سے چار پاکستان کے حصے میں آئے اور 56 ہندوستان میں رہ گئے۔ اس وقت موجود تقریباً 2202 سنیما گھروں میں سے 230 سنیما گھر پاکستان کے حصے میں آئے اور باقی ہندوستان میں رہ گئے۔ اس کے علاوہ رہائشی علاقے بھی محدود ہوکر رہ گئے۔ فلمی فنکار بھی ادھر اُدھر بکھر گئے۔ کچھ پاکستان چلے گئے اور کچھ ہندوستان میں رہ گئے۔ اس طرح فلم انڈسٹری تقسیم وطن کے خوفناک اور مضرت رساں اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکی۔''

یہ وہ دور تھا جب لوگ، ہندو اور مسلمان کے خانے میں تقسیم ہوگئے تھے آپسی بھائی چارہ خطرے میں آگیا تھا لوگ ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ تاہم فلمی دنیا پر تقسیم وطن کے علیحدگی پسند اور فرقہ پرست اثرات زیادہ دنوں تک مسلط نہیں رہ سکے۔ زیادہ عرصے تک یہ بات ممکن بھی نہیں تھی۔ اس لیے کہ فلمی دنیا نے رفتہ رفتہ تقسیم کے زخموں سے نجات حاصل کرکے اپنی تخلیقی مصروفیات پر توجہ دینی شروع کردی۔ فلمی کاروبار کے لوگوں نے ہندو، مسلمان کی تفریق سے بالاتر ہوکر 'بیجو باورا' جیسی فلمیں بنانی شروع کردیں۔ فلم کے تاریخ ساز گلوکار تھے محمد رفیع مرحوم جنھوں نے ہندو مسلمان کے امتیاز سے بالاتر ہوکر 'من تڑپت ہری درشن کو آج' اور 'او دنیا کے رکھوالے' بھجن گائے جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ فلم کے ہیرو تھے آنجہانی بھارت بھوشن اور ہیروئن تھیں مسلم اداکارہ مینا کماری۔ یعنی فلمی دنیا کے ہندوؤں اور مسلمان فن کاروں نے مذہبی تفریق کو پس پشت ڈال کر فلم وفن کے تئیں اپنی زندگی وقف کردی تھی۔

دراصل سیکولرزم یا مذہبی رواداری ہماری فلمی دنیا کی بھی ضرورت ہے۔ صرف ایک فرقے کی پسند یا ناپسندیدگی کو پیش نظر رکھ کر ایسی فلمیں نہیں پیش کی جاسکتی جن کی کامیابی کا دعویٰ کیا جاسکے کیونکہ فلم کے ناظرین صرف ہندو یا محض مسلمان نہیں ہوتے۔ ہر فرقے کے ناظرین فلم بینوں میں شامل ہوتے ہیں، اس لیے سبھی کی پسند و ناپسند کو پیش نظر رکھ کر فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ اسی طرح فلمی فنکار بھی ہندو مسلمان کا امتیاز کم از کم فلم کی سطح پر تو نہیں رکھتے۔ یہاں یوسف خان دلیپ کمار جیسے تاریخ ساز شہنشاہ جذبات بن جاتے ہیں۔ ممتاز بیگم مدھوبالا کا نام اختیار کرلیتی ہیں۔

مطلب یہ کہ فلمی فن فرقہ پرست خانوں میں تقسیم نہیں ہوسکتا۔ معروف نغمہ نگار وقلم کار اور سرگرم سماجی رہنما جاوید اختر کے الفاظ 'فن (ادب اور سنیما) معاصر خوابوں، آرزوؤں، نفسیاتی وتصوراتی معاملوں اور سماجی مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ عام آدمی کی تکلیفوں اور حسرتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح فن کو عام آدمی کے مورخ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا سنیما بھی تمام تر مبالغہ آرائیوں اور غلط بیانیوں کے باوجود یہی عکاسی کرتا ہے۔'' جاوید اختر ہی نہیں فلمی دنیا کے سبھی لوگ انسانی نفسیات کے اس پہلو سے واقف ہیں، بقول جاوید اختر ''ہندوستانی عام طور سے فلم بینی کے شائق ہوتے ہیں۔ سنیما عام ہندوستانی کے لیے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ معروف شیام بینگل کی رائے بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

ہندوستانی سینما کا اصل مسئلہ معاصر نوعیت کے موضوعات کی محتاط فلم سازی کرنا ہے یعنی فلمیں بنانے میں ایسی فضا اور تہذیب وثقافت کی عکاسی کرنا ضروری ہے جو سماج کے سبھی طبقوں کے لیے قابل قبول ہوں۔ اس طرح ہندوستانی فلمیں ایک قومی تہذیب وثقافت کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ یعنی ہندو اور مسلمان فرقوں کے افراد کو ہندوستانی فلموں میں کامیاب طریقے سے بھائی بھائی کے طور پر پیش کرکے ہندو مسلم بھائی بھائی کے قومی وسماجی نعرے کا عملی ترجمہ کرکے، ہندوستانی فلموں نے قومی یکجہتی، یگانگت اور مذہبی رواداری یعنی سیکولرزم کو عملی جامہ پہنانے کا اہم قومی فریضہ انجام دیا گیا ہے۔ 1946 کی فلم 'پڑوسن' اور 1944 میں بنائی جانے والی فلم 'ہمراہی' اسی مفروضے کی عملی تصدیق کرتی ہیں یعنی اس عہد کی فلموں میں مسلم لیگ کے علیحدگی پسند نظریے کو بھی قبول نہیں کیا گیا بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو 1950 کے عہد کی فلموں میں بھی اس علیحدگی پسند نظریے کی مخالفت کرنے والے نظریات کو ان فلموں میں انتہائی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر اس دور کی فلم 'دیوار' میں ناظرین اور عام لوگوں کو بہت ہی دل نشیں طریقے سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ تقسیم کنبوں کے اتحاد کے لیے سنگین خطرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ آنجہانی پی سی جوشی نے انڈین پیپل تھیٹر ایسوسی ایشن کی تشکیل میں ترقی پسند فنکاروں، شاعروں، اداکاروں اور مصنفین کو جمع کرکے ایک مفید عام محاذ تشکیل دے کر ترقی پسند انسانیت نوازی کا ایسا ماحول تیار کردیا تھا جسے تقسیم کے بعد کے انتشار زدہ دور نے کشادہ دلی کے ساتھ قبول کرلیا تھا۔ سعادت حسن منٹو، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، کیفی اعظمی اور خواجہ احمد عباس جیسے بیشتر تخلیق کاروں نے ہندوستانی سینما میں اپنی تخلیقات کے ذریعے سیکولرزم کے نظریے کو فروغ دیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ تقسیم وطن کے بعد کے شورش زدہ دور کی فلموں میں مسلم کرداروں کو بامعنی اور مثبت طریقے سے پیش کرنا سنگین مسئلہ تھا۔ اس کے لیے جارحیت سے گریز اور سیاسی درستگی کی کوششیں ضروری تھیں۔ اس لیے ہمارے ترقی پسند مصنفین نے اس عہد کی فلموں کے کرداروں کی عکاسی حساس، معقولیت پسند اور انسان دوست اور سیکولر شخصیت کے طور پر کی۔ مثال کے طور پر 1959 کی شاندار اور معرکۃ الآرا فلم 'دھول کا پھول' کو رکھا جاسکتا ہے۔ فلم میں ایک مسلم بزرگ ایک لاوارث بچے کی پرورش کے دوران اسے ایک گیت گا کر نصیحت کرتا ہے جو کہ اسے نہ تو ہندو بننے اور نہ مسلم بننے بلکہ اسے انسان کی حیثیت سے انسان بن کر زندگی جینے کی ترتیب۔ یہ نغمہ تھا 'تو ہندو بنے گا نہ مسلم مسلمان بنے گا، انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا'۔ ساحر لدھیانوی کا یہ وہ دلکش نغمہ تھا جس نے عام لوگوں کے اس خوابیدہ جذبے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ مذہبی تفریق وامتیاز کی دیواروں کو پس پشت ڈال کر انسان کو انسان بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس طرح 1970 تک پیش کی جانے والی فلموں میں مسلم کرداروں کو محتاط طریقے سے قابل قبول شکل میں پیش کرکے ہندوستانی سینما نے سیکولرزم کے سرپرست کا کردار ادا کیا۔ ہندوستانی سینما اس وقت معاصر سماجی و

1970 تک پیش کی جانے والی فلموں میں مسلم کرداروں کو محتاط طریقے سے قابل قبول شکل میں پیش کرکے ہندوستانی سینما نے سیکولرزم کے سرپرست کا کردار ادا کیا۔ ہندوستانی سینما اس وقت معاصر سماجی و سیاسی موضوعات اور تقسیم وطن کے تلخ تجربات و مہارت کے ساتھ برتنے کی اہلیت حاصل کرچکا تھا اس لیے فلمسازی کے رویوں میں بھی غیرمحسوس طریقے سے تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ھی عام مسلمانوں کی سوچ اور نظریات میں بالغ نظری اور کشادہ ذہنی جگہ بنانے لگی۔

سیاسی موضوعات اور تقسیم وطن کے تلخ تجربات ومہارت کے ساتھ برتنے کی اہلیت حاصل کرچکا تھا اس لیے فلمسازی کے رویوں میں بھی غیرمحسوس طریقے سے تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی عام مسلمانوں کی سوچ اور نظریات میں بالغ نظری اور کشادہ ذہنی جگہ بنانے لگی۔ مسلمانوں میں موجودہ حالات کا وسیع النظری کے ساتھ تجزیہ کرکے انھیں قبول کرنے کا رجحان مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگا۔

ابھی عوامی سوچ میں اس مثبت تبدیلی کے اثرات پیدا ہونے شروع ہی ہوئے تھے کہ 1971 میں برصغیر کی ایک اور تقسیم کے بعد بنگلہ دیش کے قیام نے ہندوستانی مسلمانوں کو بخوبی باور کرادیا کہ مذہبی بنیادوں اور مذہبی فاصلوں سے اوپر اٹھ کر اپنے مادر وطن سے محبت کے جذبے کے ساتھ ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں کے ساتھ پرامن طریقے سے زندگی گزارنا ہی اتحاد اور ترقی کا واحد راستہ ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سقوط پاکستان کے مثبت اثرات نے مسلمانوں کے دلوں میں جگہ بنانی شروع کردی۔

انھیں دنوں ہندوستان کی فلمی دنیا کی شاہکار فلم 'گرم ہوا' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ گرم ہوا میں ہندوستانی مسلمانوں کی سوچ میں اس اجتماعی تبدیلی کی کامیاب اور موثر عکاسی کی گئی تھی پاکستان کو ہجرت کرنے والے مسلم نوجوانوں کی پاکستان میں بے بسی اور بدحالی کی اس فلم میں بڑی حقیقت آمیز عکاسی کی گئی تھی اور نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ اکل حلال کمانے اور اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی سوچ نے اب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا سفر خوش حالی اور آسودگی کی سمت میں موڑنا شروع کردیا تھا۔

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں اس انقلابی تبدیلی کا سفر زور وشور کے ساتھ جاری تھا کہ 1987 میں فلمساز گووند نہلانی نے معروف ترقی پسند ادیب آنجہانی بھیشم ساہنی کے معرکۃ الآرا اور یادگار ناول 'تمس' پر مبنی ٹی وی سیریل 'تمس' پیش کردیا۔ خوش قسمتی سے اس سیریل میں بیان کی جانے والی تقسیم وطن سے پہلے کے دور کی تلخ سچائیوں نے ملک کے اکثریتی طبقوں کو اپنے نظریات پر ازسرنو غور کرنے پر مجبور کردیا۔ گووند نہلانی نے آنجہانی بھیشم ساہنی کی بیان کردہ فرقہ پرست تنظیموں کی کالی کرتوتوں کو اس قدر موثر طریقے سے اجاگر کیا کہ ان علیحدگی پسند اور تنگ نظر تنظیموں کے تئیں اکثریتی طبقے بالخصوص ہندو برادران وطن کی سوچ میں تبدیلی کی مثبت لہر نے جنم لینا شروع کردیا۔ ان تلخ حقیقتوں نے ان تنظیموں کے چہروں سے فرقہ وارانہ وطن پرستی کے نقاب نوچ کر انھیں اس طرح بے نقاب کیا کہ عام لوگوں میں مذہبی بنیاد پر وطن پرستی کے بجائے آپسی اتحاد وآشتی اور یکجہتی پر مبنی سیکولر یعنی مذہبی غیر جانبدار اور جمہوری وطن پرستی کے جذبات پیدا ہونے شروع ہوگئے۔

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں لینا چاہیے کہ 1987 سے پہلے ہندوستانی سینما اور ہمارے فلمسازوں میں سیکولر سوچ اور نظریات کا فقدان تھا۔ ہندوستانی فلمی دنیا کے تاریخ ساز ہدایت کار مرحوم کے آصف کی عظیم الشان تاریخی فلم مغل اعظم ہماری اس دلیل کی بین علمی مثال ہے جس میں شہزادہ خرم یا سلیم کا جگری دوست اور شہنشاہ اکبر کی فوج کا ایک جانباز دوست درجن سنگھ اپنے دوست ولی

عہد سلیم کی محبوبہ انارکلی کو اپنی جان پر کھیل کر اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر اکبر اعظم کے قید خانے سے آزاد کرالاتا ہے۔ شہزادہ سلیم سے ایک ہندو راجپوت سردار کی اس جانباز دوستی کی فلمسازی کو ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں سیکولرزم یعنی مذہبی یگانگت اور رواداری کی شاہکار مثال سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یعنی ہماری دنیا کم ازکم فلمسازی کی حد تک تو ہمیشہ ہی سیکولرزم کی پاسداری کرتی رہی ہے۔ یہاں اگر راجپوت سردار درجن سنگھ مسلم ولی عہد سلیم کی دوستی پر جان قربان کردیتا ہے تو فلم خدا گواہ کا پٹھان ہیرو بادشاہ محض اپنی منہ بولی مسلم بہن کو بچانے کی خاطر افغانستان سے واپس آکر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردیتا ہے۔ ایک راجپوت پولیس افسر سے کیے گئے محض زبانی وعدے کو نبھانے کی خاطر بادشاہ نامی اس فلم کا ہیرو اپنی جان پر کھیل جانے سے گریز نہیں کرتا۔ مطلب یہ کہ خواہ سماجی فریضے کی ادائیگی کے لیے یا کاروباری مصلحتوں اور مجبوریوں کی خاطر ہماری فلموں نے سیکولرزم کی پاسداری کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ ہماری فلموں نے ہمیشہ سیکولرزم کے نظریے کو فروغ دینے کی کوششیں کیں۔ لوگوں کو مذہبی اور نسلی تفریق سے بالاتر ہوکر مثالی سیکولر زندگی جینے کا پیغام دیا۔ ہمارے فلمساز ہمیشہ اتحاد و آشتی، مذہبی یگانگی اور رواداری کے تئیں عہد بستہ رہے۔ یہاں گووند نہلانی نے جس نیک نیتی اور منصف مزاجی سے 'تمس' جیسا معرکۃ الآرا ٹی وی سیریل پیش کرنے کا حوصلہ کیا اس ایمانداری اور معقولیت کے ساتھ انھوں نے ممو، سرداری بیگم اور زبیدہ جیسی فلمیں بنانے میں استقلال اور دلیری کا مظاہرہ کیا جب کہ فلم کل یگ اور انکور جیسی فلمیں بنانے والے گوند نہلانی سے قطعاً یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اپنے دور کی دلکش ترین فلم دھرم پتر بنانے والے بلدیو راج نے اسی نیک نیتی کے ساتھ مسلم معاشرے پر مبنی فلم نکاح کی فلم سازی بھی کی جس منصف مزاجی سے انھوں نے دھرم پتر تخلیق کی تھی آنجہانی راج کپور نے اگر ستیم شیوم سندرم جیسی فلم تخلیق کی تو حنا جیسی مسلم معاشرے کی کہانی کی فلمسازی کا تصور بھی پیش نظر رکھا۔

اس مرحلہ پر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ہوگی کہ ہماری فلمی دنیا کسی مجبوری یا تو صرف پیسہ کمانے کی غرض سیکولرزم کی پاسداری نہیں کی بلکہ فلموں میں سیکولرزم کی تبلیغ و تشہیر کے ذریعے ملک وقوم کے اتحاد و یکجہتی کو تنگ نظر اور علیحدگی پسند فاشسٹ عناصر سے محفوظ رکھنے کا قومی فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ کشمیر سے کنیا کماری تک ملک کی سالمیت اور اتحاد کا نعرہ بلند کرنے والے لوگ، شاید ہی اس بات سے واقف ہوں کہ کشمیر سے کنیا کماری تک کے فاصلے میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، کتنی ذاتیں، کتنے قبائل آباد ہیں اور کتنی لسانی اور سماجی جہتیں پروان چڑھی ہیں۔ اگر ہمارے سینما نے، ہماری فلمی دنیا نے ان ہمہ جہت رنگارنگیوں کی منصفانہ فلمسازی نہ کی ہوتی تو شاید ہم ان سے لاعلم ہی رہتے کہ ہمارا ملک رنگ برنگی لسانی اور سماجی دولت سے مالا مال ہے۔ مطلب یہ کہ ہماری فلمی دنیا نے، ہر قسم کے امتیاز و تفریق سے بالاتر ہوکر، سیکولرزم اور رواداری کے ذریعے ملک وقوم کے اتحاد و سالمیت کو قائم رکھنے کا قومی فریضہ انجام دیا۔

ہندی سنیما کے سیکولر کردار پر انگشت نمائی کرنے والے عناصر بعض ایسی بین سچائی نظر انداز کر جاتے ہیں

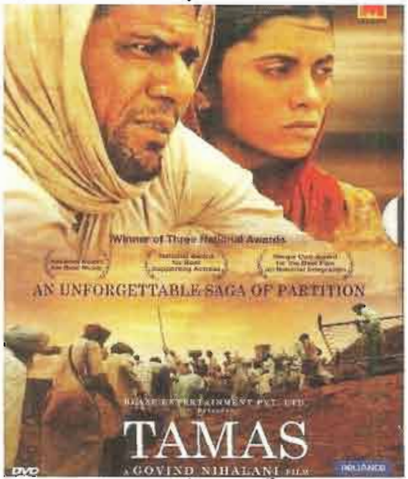

جن کے بغیر ہماری فلمی دنیا اپنی تکمیل کے سفر کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے میں ناکام ہی رہ جاتی مثال کے طور پر مشہور و معروف فلمی بھجن 'اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام' ہندوستان کے ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی نے نظم کیا تھا۔ فلم گنگا جمنا کے ہیرو دلیپ کمار نے فلم کے آخری منظر میں جس درد بھرے لہجے میں 'ہے رام' کہا تھا اس نے ناتھو رام گوڈسے کے ہاتھوں شہادت کے دوران بابائے قوم آنجہانی مہاتما گاندھی کے آخری الفاظ 'ہے رام' کی دردناک یاد تازہ کردی تھی۔

ہندوستانی فلموں کی سیکولر روایت پر گفتگو میں معروف فلمساز مہیش بھٹ کی معرکۃ الآرا فلم 'زخم' کا تذکرہ نہ کرنا اپنے آپ میں ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ جس میں ایک مسلم ضعیفہ کا بیٹا اجے دیوگن، فرقہ پرست طاقتوں کو اپنی ماں کی لاش کی آخری رسوم کے تنازعہ میں سیاست سے باز رکھنے کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہوئے انتہائی ٹھوس اور مضبوط لہجے میں اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنی ماں کی لاش پر فرقہ پرست عناصر کو سیاست کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بھٹ صاحب کی ہی ایک اور فلم 'کچے دھاگے' میں ایک ہندو باپ کے دو ہندو اور مسلمان بیٹے ایک دوسرے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ فلم کے ایک ہیرو سیف علی خان نے ہندو باپ اور مسلم ماں کے مسلمان بیٹے کا کردار ادا کیا ہے۔ ہندو اور مسلم سگے بھائیوں کا ایک دوسرے کے لیے جان پر کھیل جانا، ہندی سنیما میں سیکولرزم کی پاسداری کی سنہری مثال ہی قرار دیا جائے گا۔

اس مرحلے پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بھٹ صاحب ہندوستانی سنیما میں سیکولرزم اور مذہبی غیر جانبداری کے زبردست پرچم بردار رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی فلموں میں معاصر موضوعات اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ملک کے دو بڑے فرقوں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان باہمی یگانگت و یکجہتی کی پرزور تبلیغ و اشاعت کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہم ماضی کے اذیت ناک تجربات سے آزاد ہوچکے ہیں۔ ان فرقہ پرست فاشسٹ طاقتوں کی سازشوں سے بخوبی آگاہ ہوچکے ہیں جنھوں نے 1992 میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد اور 2002 میں گجرات میں بےقصور لوگوں کا یکطرفہ قتل عام کرکے ملک میں عدم استحکام کا ماحول پیدا کردیا تھا۔ بھٹ صاحب کہتے ہیں کہ یہ طاقتیں آج بھی اپنے علیحدگی پسند عزائم سے دست بردار نہیں ہوئی ہیں۔ یہ طاقتیں آج بھی سرگرم اور تقسیم کار سازشیں رچنے میں مصروف ہیں۔ سیکولرزم کے دعویداروں کو ان طاقتوں کے سیاہ کارناموں پر خاموش نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسی عزم اور طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ جس سے 1951 میں آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے فرقہ پرستوں کا مقابلہ کیا تھا۔ بھٹ صاحب جاوید اختر کے اس قول سے پوری طرح اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستانی سنیما میں سیکولرزم کا تحفظ اور پاسداری، مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندوؤں کی ذمے داری ہے۔

ہندوستانی سنیما میں برتے جانے والے سیکولرزم کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لیے پورا ایک دفتر چاہیے تاہم مختصراً یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی فلمی صنعت نے ہماری فلموں کے سیکولر کردار کو برقرار رکھنے میں جس ہمت، استقلال اور منصف مزاجی کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے یقین پختہ ہوجاتا ہے کہ ہندوستانی سنیما سیکولر تھا، سیکولر ہے اور سیکولر ہی رہے گا۔

■

Dr. Shahbaz Hasibi, Media & Com. Prime Minister's Office, New Delhi

ہندوستانی سنیما میں مشترکہ تہذیب اور اردو معاشرہ

مظہر حسنین

6 اگست 1926 میں پہلی متکلم فلم ڈان جان کی نمائش نیویارک کے وارنر برادرز تھیٹر میں کی گئی۔ یہ دنیا کی اولین کلامیہ فلم تصور کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی معاشرتی و تہذیبی زندگی پیش کرنے میں مشہور کہانیوں پر مبنی فلمیں معاون ثابت ہوئیں۔ یہ تفریح طبع کے ساتھ حقیقت سے بھی باور کراتی تھیں۔ اس زمانے میں محبت کی کہانیوں پر مبنی فلموں میں لیلیٰ مجنون 1922، 1927، شیریں فرہاد 1926، انارکلی 1928 میں دو تیار ہوئیں۔ علی بابا اور چالیس چور 1927، حاتم طائی 1929، پریوں کی کہانی گل بکاؤلی 1924، بلبل پرستاں 1926، گل صنوبر 1928، بلبل شیراز 1931 وغیرہ جیسی فلمیں ہمارے سامنے آتی ہیں لیکن یہ سب خاموش فلمیں تھیں۔ ہندوستانی فلم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ اس وقت ہوا جب پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' منظر عام پر آئی۔ مسلمانوں کی معاشرتی وتہذیبی صورتحال کو پیش کرنے والی جو فلمیں منظر عام پر آئیں وہ ایک مخصوص انداز میں تیار ہوئیں اور انھیں کو بنیاد بنا کر دوسری فلمیں بھی تیار ہونے لگیں۔ آزادی کے بعد ممبئ کو ہندوستانی فلم انڈسٹری کا مرکز قبول کیا گیا۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری ابتدا سے ہی ملک کی معاشرتی صورتحال کو پیش کرتی رہی ہے۔

مشاعرے اور مجرے سماج و معاشرے پر اپنی گہری گرفت رکھتے ہیں، لکھنوی تہذیب کا گہرا اثر فلموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ گرچہ مجرے کو اسلامی لحاظ سے ممنوع قرار دیا گیا لیکن مجرے سماج میں بے حد مقبول تھے اور سماج و معاشرے میں تہذیب نشست و برخاست کے آداب کی درسگاہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ قوالی کو فلموں میں بے انتہا پسند کیا گیا ہے۔ فلمی نغموں کے حوالے سے اگر اردو زبان کا جائزہ لیا جائے تو کوئی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اردو زبان میں لکھے گئے پرکشش نغمے ابھی پوری طرح ہندوستانی فلم انڈسٹری کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ پرانی فلمیں ہوں یا نئی سب میں یہ بات واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس زبان کی دلکشی نغموں کے ذریعے آشکار ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے پرانی اور نئی امراؤ جان کا جب ہم موازنہ کرتے ہیں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر پرانی امراؤ جان کے نغمے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں تو نئی امراؤ جان کے نغمے اپنا جدا مقام رکھتے ہیں۔

جب ہم ہندوستانی فلموں میں اردو معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو کئی ایسے پہلو نظر آتے ہیں جن سے فلموں میں اردو معاشرے کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہندوستانی فلم صنعت کے ذریعے تیار کی جانے والی فلموں کو ہندی کا نام دے دیا گیا ہے اور باضابطہ طور پر فلم سنسر بورڈ اس کے ہندی ہونے کی مہر بھی ثبت کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سی ایسی فلمیں تیار ہوئیں جنھیں کسی بھی رُخ سے ہندی نہیں قرار دیا جاتا اور اس میں اردو کے ایسے ثقیل اور فارسی آمیز الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کی بنیاد پر ہندی فلم قرار دینا درست نہیں ہے۔ بیشتر فلموں میں استعمال ہونے والی زبان میں زیادہ تر الفاظ اردو کے ہوتے ہیں اور اگر فلمی نغموں کا جائزہ لیا جائے تو اس میں چاشنی اور جاذبیت اردو کی وجہ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ خوبصورت غزلیں فلموں کی مقبولیت میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ فلموں میں اردو معاشرے کی بات کی جائے تو ایسی بہت سی فلمیں مثلاً مغل اعظم، رضیہ سلطانہ، میرے محبوب، میرے حضور، محبوب کی مہندی، طوائف، خدا گواہ، امراؤ جان، پاکیزہ وغیرہ میں اردو معاشرے کی خوبصورت پیش کش کی گئی ہے۔ ہندوستانی فلموں میں یہاں کی تہذیب کے گہرے نقوش ہیں۔ مختلف ذات، طبقے اور مذاہب کی نمائندگی ہوتی ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور اخلاقی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہندوستانی فلم انڈسٹری فلمیں تیار کرتی ہے۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری نے جہاں فلموں میں ملکی و بیرون ملکی موضوعات کو پیش کیا وہیں 'اردو معاشرہ' بھی ہندوستانی فلموں کا اہم موضوع رہا ہے جس پر فلمیں تیار ہوتی رہی ہیں، جن میں مسلم معاشرے کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور مذہبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو معاشرے کے تعلق سے مختلف موضوعات پر مبنی بہت سی ہندوستانی فلمیں خون کا خون، الہلال، پکار، نجمہ، پھول، زینت، عرب کا چاند، عرب کا ستارہ، وامق عذرا، نیک پروین، اعلان، مرزا صاحبان اور مہندی منظر عام پر آئیں۔ کمال امروہی نے 1939 میں پکار بنائی۔ انارکلی 1953 میں، 1954 میں سہراب مودی کی مرزا غالب، چودھویں کا چاند اور بے نظیر جو 1960 اور 1964 میں گرودت اور ولی رائے کی ہدایت کاری میں تیار ہوئیں۔ برسات کی رات 1960 کی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔ آزاد فلم جس میں یوسف خان (دلیپ کمار) نے خان صاحب کا بہترین کردار پیش کیا۔ جیسا کہ مغل اعظم میں 1960 میں پیش کیا تھا۔ بعد کے بیس سالوں میں 1963 سے 1983 تک فلمیں مسلم تاریخ، مسلم خیالات اور اسلامی سماج کو پیش کرتی رہیں۔ ان کے علاوہ 1960 کی دہائی میں دیگر فلمیں صاحب بیوی اور غلام، دو راستے وغیرہ بھی آئیں۔

1972 میں پاکیزہ کمال امروہی کی ہدایتکاری میں تیار ہوئی، اسی زمانے کی دیگر فلمیں میرے محبوب، میرے حضور اور محبوب کی مہندی ہیں۔ گرم ہوا، نکاح، سرفروش، فضا، غدر، دیو، مقبول، ویر زارا اور غلام مصطفیٰ جیسی فلموں کے نام آتے ہیں۔ ابھی گزشتہ برسوں میں کچھ ایسی فلمیں منظر عام پر آئیں جن کا تجزیہ کرنے پر یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت اور طرز زندگی کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کی صحیح عکاسی فلموں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ پہلے ہندوستانی فلم صنعت کا کردار سیکولر اور انسان دوستی کا پیغام دینے والا تھا۔ محبت، اخوت، بھائی چارگی اور اعتماد کے مضبوط دھاگے سے یہاں کی تمام اقوام و مذاہب کے مابین آپسی لگاؤ تھا۔ ان سب کی بنیاد پر ایک نمایاں تہذیب وجود میں آئی جس کو مشترکہ تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔

فلم میرے محبوب ایک ایسی فلم ہے جو لکھنؤ کے اجڑے نوابوں کی زندگی کو پیش کرتی ہے۔ ایسے مسلم گھرانے کی بھی داستان ہے جو حالات کا شکار ہو کر اپنے والدین سے دور ہو جاتے ہیں۔ فلم میں جہاں ایک طرف مسلم تہذیب اور معاشرے کو پیش کیا گیا ہے وہیں دوسروں سے محبت و ہمدردی کے لیے بندا دین گھائل جیسے کردار بھی ہیں جو آپسی بھائی چارے، محبت و اخوت کی علامت ہیں۔ فلم میں علی گڑھ یونیورسٹی کے زیر اثر پروان چڑھنے والی تہذیب کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں اردو معاشرے یا مسلم معاشرے کی عمدہ پیشکش کی گئی ہے۔

فلم میرے حضور لکھنؤ کی تہذیب کی عکاس ہے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس میں تہذیب اودھ کی عکاسی ہے۔ یہ سماج و معاشرہ لکھنؤ کی تہذیب میں رچا بسا نظر آتا ہے۔ شعر و سخن کی محفلوں اور دیگر رسموں تک میں دونوں فرقوں میں یکسانیت دیکھنے کو مل جائے گی جس کی نمائندگی اختر حسین اختر اور جناب بے ڈر جیسے کرداروں سے ہوتی ہے۔ فلم میں مسلمانوں کے اعلیٰ نواب خاندانوں کی پوری طرز زندگی، آداب و تہذیب، شادی بیاہ کی شان و شوکت، تہواروں کے طور طریقے، طرز گفتار اور یہاں تک کہ لباس و زبان کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ شاعری کو اس زمانے میں مقبولیت حاصل تھی، بیت بازی اور طرحی محفلوں کا بھی خوب چلن تھا اور شاعروں کی شاعرانہ قابلیت کی پرکھ کے لیے طرحی محافل بھی خوب آراستہ کی جاتی تھیں۔ فلم میں لالہ چنوٹی لال کے کردار سے لکھنؤ کی مشترکہ تہذیب اور اردو معاشرے کی ترجمانی ہوتی ہے جس میں لباس سے لے کر آداب و اطوار اس قدر مماثل ہیں کہ یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ کوئی غیر مسلم بھی اس میں موجود ہے، آداب و تسلیم کے طریقے، الفاظ کی ادائیگی، زبان و بیان اور لباس میں شیروانی، کرتہ پائجامہ، ٹوپی سب کچھ اردو معاشرے کی خوبصورت عکاسی کے لیے کافی ہیں۔ فلم میں لکھنؤ کی بیگماتی محفل کا بھی ذکر ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں جہاں مرثیہ گوئی، داستان گوئی، مثنوی اور قصیدہ گوئی کی ادبی محفلیں ہوتی تھیں وہیں طوائفوں کے کوٹھے تہذیب کا اہم مرکز تھے۔

کریم الدین آصف کی شاہکار فلم مغل اعظم ہندوستانی فلم انڈسٹری کی ایسی فلم ہے جس کا اثر آج بھی لوگوں پر ویسا ہی ہے جیسا کہ پچاس برس قبل تھا جب یہ 1960 میں ریلیز کی گئی تھی۔ فلم کی زبان اور مکالمے اس قدر پر اثر ہیں کہ آج بھی یہ لوگوں کی زبانوں پر اکثر جاری ہو جاتے ہیں۔ فلم کی زبان چونکہ اردو ہے اس لیے فلم کو اور بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مغل اعظم میں ایسے مناظر ہیں جو فلم کی مقبولیت کے لیے بہت اہم تصور کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد اور جنگ آزادی جو 1857 سے ہی شروع ہو چکی تھی اور تقریباً ایک صدی کے بعد ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی تو ضرور لیکن تقسیم ملک کی ایک ایسی کربناک داستان رقم ہوئی جس کے تلخ نتائج تقریباً 6 دہائیوں بعد بھی اس پرانے زخم کو کرید دیتے ہیں اور آج بھی اس کا بہانہ بنا کر ہندو پاک ایک دوسرے پر الزامات عائد کرتے رہتے ہیں۔ تقسیم ملک ہندوستانی تاریخ میں نہایت سیاہ ورق ہے۔ جس کو ہندوستانی فلموں کے ذریعے بھی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فلم گرم ہوا اوّلین فلم ہے جس میں تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی صورتحال اور کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں روزی سے لے کر شادی تک کے مسائل کی خوبصورت عکاسی ایم ایس ساتھیو نے کی ہے۔ اس سے قبل اس طرح کی پیش کش ہندوستانی فلموں میں نہیں کی گئی۔

گرم ہوا کے ذریعے ایم ایس ساتھیو نے بٹوارے کے بعد کی صورتحال کو پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کی کیفیات کو فلمی پردے پر اتارا ہے۔

مسلمانوں کی نفسیات کو تقسیم ملک نے کس طرح متاثر کیا ہے، فلم ساز نے بٹوارے کے کرب کو مسلمانوں کے حوالے سے بہت ہی موثر طریقے سے اس فلم میں جگہ دی ہے اور ان کی تمام تر کیفیات کو سامنے لا کر ان کی نفسیاتی ناآسودگی کو بڑی سنجیدگی سے فلم میں پیش کیا ہے۔

فلم امراؤ جان کے تجزیے اور مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فلم ساز مظفر علی نے مرزا ہادی رسوا کے ناول کو پردہ سیمیں پر اسی حقیقت اور لوازمات کے ساتھ پیش کیا ہے جو ناول امراؤ جان ادا کی خصوصیت تھی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ مظفر علی نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے امراؤ جان کو اپنی فلم کے سہارے زندہ کر دیا ہے۔ ابھی تک جس کردار کو پڑھ کر ہم اپنی تصوراتی دنیا میں دیکھتے تھے وہ کردار پردہ سیمیں پر جلوہ گر ہو گئے۔

امراؤ جان کی جو شان و شوکت فلم میں پیش کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خانم کا کوٹھا اعلیٰ درجے کی طوائفوں کے لیے ہے۔ جہاں نواب، اشرافیہ طبقہ اور روؤسا لوگ بصد ادب تشریف لاتے ہیں اور ان کی خوش آمدید گلوریوں سے کی جاتی ہے۔ اس میں لکھنوی تہذیب کے آداب نشست و برخاست کو بھی خوب پیش کیا گیا ہے۔

فلم پاکیزہ میں کمال امروہی نے اپنے فن کمال کے ذریعے مسلم خواتین کے سنجیدہ مسائل کو فلم کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی جو سماج کے اوپر ایک بدنما داغ ہے۔ عورت کی مجبوری اور لاچاری کی کربناک داستان گرچہ اس کے مجرے اور گانے سے بھی بیان ہوتی ہے لیکن ایک کوٹھے پر بیٹھی ہوئی عورت کو سماج کا پست ترین طبقہ بھی قبول کرنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔

فلم سرفروش میں اردو معاشرہ کی بھرپور جھلک گلفام حسن کے کردار سے ہوتی ہے۔ وہ اردو شاعری اور غزلوں کے معیار پر اس فلم میں ایک مقام پر تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جب اچھی غزلیں کہی نہیں جائیں گی تو پڑھی کیسے جائیں گی''۔

یش چوپڑا کی فلم ویر زارا اگرچہ عشق و معاشقے کے موضوع پر ہے لیکن اس میں بھی مشترکہ تہذیب اور اردو معاشرے کی پیش کش کی گئی ہے۔

جہاں زارا کے افراد خاندان کے ذریعہ بزرگ صوفی کی درگاہ پر حاضری اور پرکشش قوالی کو پیش کیا گیا ہے۔ معاشرے میں پھیلی برائیوں، ظلم و جبر، ستی کی رسم، جاگیر دارانہ نظام، زمیندارانہ نظام، بچپن میں شادی، غلط رسومات، مذہبی افتراق جیسے معاملات کو فلموں میں پیش کر کے اس کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہے۔ ہندوستانی فلموں میں یہاں کی تہذیب صاف طور پر نظر آتی ہے۔ اس میں مختلف ذات، طبقے اور مذاہب کی نمائندگی ہوتی ہے۔ معاشرتی زندگی کی جھلک ہندوستانی فلموں میں پائی جاتی ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور اخلاقی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہندوستانی فلم انڈسٹری فلمیں تیار کرتی ہے۔

حالیہ برسوں میں بننے والی فلموں میں مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کی صحیح عکاسی فلموں میں دیکھنے کو نہیں ملتی بلکہ مسلمانوں کے تئیں نفرت آمیز اور مضحکہ خیز تصورات کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ پہلے ہندوستانی فلم صنعت کا کردار سیکولر اور انسان دوستی کا پیغام دینے والا تھا۔ محبت، اخوت، بھائی چارگی اور اعتماد کے مضبوط دھاگے سے ایک نمایاں تہذیب وجود میں آ گئی تھی جس کو مشترکہ تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ مسلم معاشرہ، اردو معاشرہ اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب یہ تینوں آپس میں اس قدر ضم ہیں کہ انھیں بہت واضح انداز میں الگ نہیں کیا جا سکتا ہے اور کسی ایک پر اظہار خیال کریں گے تو باقی دونوں کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے اور ہندوستانی فلموں میں اردو معاشرے کی بھرپور جھلک سامنے آجاتی ہے۔

□

Mazhar Hasnain, 212-E, Mahanadi Hostel, JNU, New Delhi-110067

ہندوستانی سینما

بچوں کی فلمیں

مصنف: مہیشور   مترجم: ارشد گوڑ

ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو اور ہندی میں بچوں کے لیے زیادہ فلمیں بنائی گئی ہیں۔ راج کپور سے لے کر عامر خان تک نے بچوں کو مرکز میں رکھ کر فلمیں بنائی ہیں۔ یہ فلمیں صرف تفریح کا ذریعہ ہی نہیں ہیں بلکہ بچوں کے مسائل کی طرف بھی توجہ دلاتی ہیں۔ 1980 کی دہائی میں 'مسٹر انڈیا' آئی تھی، جو غائب ہوجانے والے انسان کو لے کر بنائی گئی تھی لیکن اس فلم کے مرکزی کردار بچے ہی تھے۔ یہ اپنے زمانے کی پسندیدہ فلموں میں سے ایک ہے۔ ننھے جیسلمیر، اپنا آسمان، تارے زمین پر، بھوت ناتھ، بلیو امبریلا، بم بم بولے وغیرہ فلموں سے بچوں کے سینما کے نظریے میں تبدیلی آئی ہے۔ نئے جذبے کے ساتھ تیار کی گئی یہ فلمیں نئے امکانات کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ ان فلموں میں انسانی رشتوں کے تعاون کے ساتھ ساتھ بچوں کے مسائل کو مختلف انداز میں خوبصورتی سے فلمایا گیا ہے۔

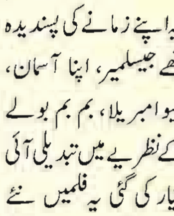

بی آر چوپڑا کی فلم کے ہدایت کار وویک شرما ہیں۔ اس فلم میں بنکو اور بھوت ناتھ کے رشتے نے مشترکہ خاندان کے روبہ زوال نظریے اور ہندوستانی خاندان کی بکھرتی اقدار کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں بچوں کی موجودگی یا بچوں کی فلموں کے بارے میں ہماری رائے میں فلم 'مکڑی' سے تبدیلی آئی۔ وشال بھاردواج کی 'بلیو امبریلا' نے بھی جذبات کی سطح پر بہت متاثر کیا۔

عرفان کمل نے اپنی فلم 'تھینکس ماں' میں ممبئی کی جھگی بستیوں کے آوارہ اور بے سہارا بچوں کے ذریعے ادھورے بچپن کی دردناک کہانی سنائی ہے۔ اس فلم میں ایک بے سہارا بچہ ہے۔ وہ خود کو سلمان خان کہلانا پسند کرتا ہے۔ دیگر آوارہ اور بے سہارا بچوں کے ساتھ وہ پاکٹ ماری کر کے اپنا گزارا کرتا ہے۔ اس کی ایک ہی خواہش ہے کہ کسی دن اپنی ماں سے ملے۔ بچوں کی جیل سے فرار ہوتے وقت اُسے دو دن کا ایک نوزائیدہ بچہ ملتا ہے۔ وہ اس بے آسرا بچے کو لے آتا ہے اور اس کی پرورش کرتا ہے۔ اپنے دوستوں کی مدد سے وہ اس بچے کی ماں تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ لیکن جب اُسے حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ اُس بچے کو اس کی ماں نے ہی وہاں چھوڑا تھا تو وہ حیران رہ جاتا ہے۔ فلم کے مطابق ملک میں روزانہ 270 بچے بے سہارا چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ان بچوں کی زندگی شہر کی گمنام گلیوں میں گزرتی ہے اور کچھ بچے روزی روٹی کے لیے جرائم کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔

پریہ درشن کی فلم 'بم بم بولے' کو بچوں نے بہت دلچسپی سے دیکھا۔ اس فلم میں دو چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ ایک دن بھائی غلطی سے اپنی بہن کے جوتے گم کردیتا ہے۔ والدین غریب ہیں اس لیے ان کی ڈانٹ پھٹکار سے بچنے کے لیے دونوں بھائی بہن ایک ترکیب سوچتے ہیں۔ اس کے مطابق صبح کو جو جوتے پہن کر بہن اسکول جاتی ہے وہی جوتے دوپہر میں بھائی پہن کر اپنے اسکول جاتا ہے۔ خاندان اور اسکول کے درمیان کا یہ ٹائم مینجمنٹ دلچسپ رنگ لاتا ہے۔

حال ہی میں آئی فلم 'پاٹھ شالا' کے ذریعے معاشرے اور بچوں کے مستقبل کے ساتھ جو کھلواڑ ہو رہا ہے اسے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اساتذہ اور بچوں کے والدین کی آنکھیں کھول دینے والی فلم ہے۔ اس میں اسکولی بچوں سے متعلق فوری توجہ طلب مسائل پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ پبلک اسکولوں کے کاروباری نقطۂ نظر کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پریہ درشن کی فلم 'بم بم بولے' کو بچوں نے بہت دلچسپی سے دیکھا۔ اس فلم میں دو چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ ایک دن بھائی غلطی سے اپنی بہن کے جوتے گم کردیتا ہے۔ والدین غریب ہیں اس لیے ان کی ڈانٹ پھٹکار سے بچنے کے لیے دونوں بھائی بہن ایک ترکیب سوچتے ہیں۔ اس کے مطابق صبح کو جو جوتے پہن کر بہن اسکول جاتی ہے وہی جوتے دوپہر میں بھائی پہن کر اپنے اسکول جاتا ہے۔ خاندان اور اسکول کے درمیان کا یہ ٹائم مینجمنٹ دلچسپ رنگ لاتا ہے۔ بھائی انٹر اسکول میراتھن دوڑ میں پہلے نہیں بلکہ تیسرے نمبر پر آنا چاہتا ہے کیونکہ تیسرا انعام جوتے ہیں جو اس کی بہن کو چاہئیں۔ لیکن وہ میراتھن دوڑ میں اوّل آتا ہے۔ اسے آگے کی تعلیم کے لیے وظیفہ ملتا ہے، لیکن وہ خوش نہیں ہوتا۔ اوّل آنے پر وہ غمگین ہوجاتا ہے کہ اب اسے تیسرے نمبر کا انعام 'جوتے' نہیں مل پائیں گے، جن کی اس کو ضرورت تھی اس فلم کا یہ بہت ہی جذباتی منظر ہے۔ وہ جیت کر بھی خود کو شکست خوردہ ہی مانتا ہے۔ یہ فلم معروف فلم کار ماجد مجدی کی ایرانی فلم 'چلڈرن آف ہیون' 1997 سے ترغیب لے کر بنائی گئی۔ ہندوستان میں خالد وائی باٹلی والا نے 'سلام بچے' نام سے یہ فلم بنائی تھی۔

عامر خان کی فلم 'تارے زمین پر' ڈسلیکسیا' کے مریض ایک کمزور دماغ کے بچے پر مبنی ہے۔ یہ ایک کامیاب فلم ہے اور اس میں ڈسلیکسیا کے مریض بچے کی نفسیات کو بڑی سنجیدگی اور ہوشیاری سے دکھایا گیا۔ 'تارے زمیں پر' کے گیت بھی متاثر کرتے ہیں۔ 'تہان' اور 'راجچند پاکستانی' جیسی فلموں میں بچے کہیں پیچھے چھوٹ گئے۔ بچوں کی تعلیم پر مبنی 'ننھے جیسلمیر' کی اسکرپٹ میں کچھ نیا پن تو تھا، لیکن فلم کی کہانی بابی دیول کے اردگرد ہی گھومتی رہی۔ وشال بھاردواج کی 'بلیو امبریلا' کو تو نیشنل ایوارڈ تک سے نوازا گیا ہے۔ راہل بوس کی 'چین کلی کی مین کلی'، انوراگ کشیپ کی 'بال گنیش'، 'مائی فرینڈ گنیشا'، 'ریٹرن آف ہنومان' جیسی فلمیں بھی قابل ذکر ہیں۔ اجے دیوگن کی 'راجو چاچا' بھی ٹھیک ٹھاک چلی تھی۔ کچھ

برسوں پہلے سنجے لیلا بھنسالی کی 'بلیک' آئی تھی، جو ایک اندھی لڑکی کی کہانی تھی۔ اس میں امیتابھ اُس اندھی لڑکی کے سخت گیر ٹیچر کے کردار میں تھے۔ اس فلم نے کئی انعامات بھی حاصل کیے۔ یہ فلم بہت مقبول ہوئی۔ اسی طرح 'پا' بھی بہت پسند کی گئی، جس میں امیتابھ بچن نے پرجیریا کے مریض ایک بچے کا رول ادا کیا ہے۔

پیوش جھا کی فلم 'سکندر' میں کشمیر کی کشیدگی اور درد کو بچوں کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'سکندر' ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جسے فٹ بال سے بے حد لگاؤ ہے اور وہ قومی سطح پر فٹ بال کھیلنا چاہتا ہے لیکن ایک دن اُسے سڑک پر ایک بندوق مل جاتی ہے۔ بس اس کے بعد اس کی زندگی میں سب کچھ بدلنے لگتا ہے۔ اس فلم میں کشمیری بچوں کے درد کو پردے پر اُتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

'اسٹینلی کا ڈبہ' فلم کی کہانی ایک اسکول میں پڑھنے والے نو برس کے اسٹینلی کی ہے۔ اسٹینلی اپنے دوستوں کے ساتھ پڑھائی کے ساتھ ساتھ نارمل زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن ایک دن جب ہندی کے ٹیچر بابو رام کی نظر اس کے اور اس کے ساتھیوں کے کھانے کے ڈبوں پر پڑ جاتی ہے تو اس کی مصیبت آ جاتی ہے۔ پھر بابو رام کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اسٹینلی تو ڈبہ لاتا ہی نہیں تو اس کی مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ بابو رام اس پر ڈبہ لانے کے لیے دباؤ ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ ڈبہ نہیں لایا تو اُسے اسکول میں نہیں گھسنے دیا جائے گا۔ آخر کار اسٹینلی کے ڈبے کی تلاش میں جو مہم شروع ہوتی ہے اور اس سلسلے میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں انھیں کا مجموعہ ہے 'اسٹینلی کا ڈبہ'۔ فلم 'اسٹینلی کا ڈبہ' کے آخر میں جب پتہ چلتا ہے کہ اسٹینلی بے سہارا ہے، اس کے والدین نہیں ہیں اور وہ اپنے کھڑوس چچا کے رحم و کرم پر جی رہا ہے، تو ناظرین کی آنکھوں سے آنسو چھلک جاتے ہیں۔

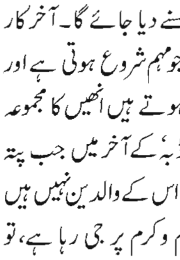

یو ٹی وی اسپاٹ بوائے اور سلمان خان کے پروڈکشن میں بنائی گئی 'چلر پارٹی'، معصوم بچوں کے ایسے گروپ کی کہانی ہے جو ایک سیاسی لیڈر کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک آوارہ کتے کی زندگی بچا کر سب کا دل جیت لیتے ہیں۔

ملک کے مقبول ترین صدر اور میزائل مین اے پی جے عبدالکلام سے ملاقات کرنے کے لیے ایک بچہ کس طرح کے جتن کرتا ہے یہ فلم 'آئی ایم کلام' کی کہانی میں ہے۔ اس کے ہدایت کار ہیں نیلا مادھو پانڈا۔ 'آئی ایم کلام' ایک غریب راجستھانی لڑکے چھوٹو کی کہانی ہے جو اے پی جے عبدالکلام کا بہت بڑا مداح ہے اور ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ فلم کی کہانی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ننھے چھوٹو کے اردگرد گھومتی ہے، جو نامساعد حالات میں بھی جوش و جذبے کو قائم رکھتا ہے۔ چھوٹو کو تحریک سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام سے ملتی ہے۔ ان کی ایک تقریر سننے کے بعد زندگی کے بارے میں چھوٹو کا نظریہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ دن بھر مزدوری کرنے کے بعد شام کو کتابوں کے ساتھ وقت گزار کر چھوٹو اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ چھوٹو کو یقین ہے کہ ایک دن وہ کلام جیسی بڑی شخصیت بنے گا۔

حال ہی میں آئی ودھو ونود چوپڑا کی فلم 'فراری کی سواری' خوابوں کے ٹوٹنے اور شرمندہ تعبیر ہونے کے درمیان تین پیڑھیوں کے تعلقات اور سمجھداری کی کہانی ہے۔ یہ فلم خاندانی رشتے کی ڈور کو بہت ہی موثر طریقے سے پیش کرتی ہے۔ اداکاروں نے 'فراری کی سواری' کو قابل ذکر فلم بنا دیا ہے۔ فلم کا مرکزی کردار روسی اپنے ہونہار کرکٹر بیٹے کایو کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنے بستر پر بیٹھے ٹی وی دیکھنے میں مشغول موٹا پاپا گھر کی ہر بات سے واقف رہتے ہیں۔ موٹا پاپا اپنے لڑکپن کے زمانے میں کرکٹر تھے۔ رنجی کھیل چکے تھے، لیکن نیشنل ٹیم میں انتخاب کے دن دوست دلیپ دھرما دھیکاری کی سازش کی وجہ سے ٹیم میں شامل نہیں ہو پاتے۔ کرکٹ میں مکر و فریب کا شکار ہونے والا موٹا پاپا نہیں چاہتے کہ ان کا بیٹا کرکٹر بنے۔ بیٹا تو مان جاتا ہے، لیکن پوتا کرکٹر بن ہی جاتا ہے۔ پوتے کایو کا انتخاب لارڈس کی خصوصی ٹریننگ کے لیے ہونے والا ہے۔ ایک ہی دقت ہے کہ منتخب ہونے پر اُسے ڈیڑھ لاکھ روپے کی فیس جمع کرانی ہوگی۔ محدود آمدنی والے اس خاندان کے لیے اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا مشکل کام ہے۔ روسی بہت ایماندار اور فرض شناس شہری ہے۔ بیٹے کے مستقبل کے لیے ایک بار وہ اپنی ایمانداری کے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ اُسے کچھ گھنٹوں کے لیے اپنے والد کے تعلقات سے سچن تیندولکر کی لال فراری کسی کو فراہم کرانی ہے، جس کے بدلے میں اسے ڈیڑھ لاکھ روپے مل جائیں گے۔ واقعات کچھ اس طرح رونما ہوتے ہیں کہ وہ سچن تیندولکر کو بتائے بغیر ان کی فراری لے کر نکل جاتا ہے۔ فراری کی سواری میں باپ اور بیٹے کے رشتے کی بہت ہی جذباتی انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ کایو کے خاندان کے حالات دیکھ کر آنکھیں بھر آتی ہیں۔ فراری کی سواری اوسط طبقے کے خواب اور اُسے پورا کرنے کی جدوجہد کو دکھاتی ہے۔ فلم میں سچن تیندولکر اور ان کی لال فراری کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

بچوں کے علاقائی سنیما کے سلسلے میں مراٹھی کی 'شواس' اور سندھی کی 'ہارون ارُن' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ 'شواس' میں ایک چھوٹا سا بچہ ہے جس کی آنکھوں میں کچھ تکلیف ہو گئی ہے اور اُسے دیکھنے میں پریشانی ہونے لگتی ہے۔ اس کے والد ایک سڑک حادثے کی وجہ سے اپاہج ہو گئے ہیں اور گھر میں بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے دادا اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔ لیکن وہ اُسے شہر کے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی صلاح دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے علاج کو لے کر ہی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ جذبات کی سطح پر یہ فلم کافی دردناک منظر پیش کرتی ہے۔

'ہارون ارُن' کا تانا بانا جنگ آزادی کے واقعے پر مبنی ہے۔ ملک کی تقسیم کے وقت ہزاروں بچے بھی متاثر ہوئے تھے۔ یہی اس فلم کا مرکزی موضوع ہے۔ ہارون اور ارُن سرحدی علاقے میں رہتے ہیں۔ وہ پکے دوست ہیں۔ غم اور خوشی میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ ارُن کی ماں ہارون کو بہت پیار کرتی ہے، بلکہ اُسے اپنا ہی بیٹا مانتی ہے۔ تقسیم کی ٹریجڈی کو فراموش کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بھائی چارے کو اس فلم میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ہماری ثقافتی خصوصیت ہے کہ ہم انسانیت کو اولیت دیتے ہیں اور آخر کار ہم سب ایک ہیں۔

اس طرح تجزیاتی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ایک دہائی میں بچوں کو لے کر کافی فلمیں تیار کی گئی ہیں۔ بڑے پردے پر بھی ان فلموں کا کاروبار اچھا رہا، جو ملک میں بچوں کے لیے فلمیں تیار کرنے والوں کے لیے حوصلہ افزا ہے۔ بیرونی ممالک کے مقابلے میں بھارت میں بچوں کے سنیما کو مین اسٹریم میں سنجیدگی سے نہیں لیا گیا ہے۔ مین اسٹریم کی فلموں میں بچوں کی فلموں کو بھی جگہ ملے تو یقیناً ملک میں بچوں کے سنیما کا مستقبل روشن ہوگا اور اسے ایک نئی سمت ملے گی۔ اس کے لیے ہمیں علاقائی سنیما کی بھی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی اور نئے فلمسازوں کی بھی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی اور ان کی مدد کرنی ہوگی۔

■

Arshad Gor, 121-A/D2,
DDA Flates Mayour Vihar, Ph. 3, Delhi-3

▪ ثمینہ پروین

ہندوستانی فلمی نغموں کا جادوگر

ساحرلدھیانوی

ہندوستانی سنیما کے سو برسوں کی فلمی شاعری پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو آرزو لکھنوی، مجروح سلطانپوری، خمار بارہ بنکوی، نخشب جارچوی اور راجہ مہدی علی خاں سے لے کر گلزار اور ان کے بعد ندا فاضلی اور جاوید اختر تک کئی شاعروں کے نام ذہن میں آتے ہیں جنھوں نے اردو کو ہندوستانی فلموں کی مادری زبان بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن بات کو صرف اردو زبان تک محدود نہ رکھا جائے اور اسے اردو تہذیب و ثقافت، مقصدیت، سماجی افادیت، مثبت جذبات واحساسات کو فروغ دینے، زندگی کے سبھی پہلوؤں کی عکاسی کرنے اور فلمی تقاضوں کو ذہن میں رکھ کر شاعری کے فن اور تکنیک کے بہتر سے بہتر استعمال اور موضوعات کے تنوع تک پھیلایا جائے تو صرف ایک عبقری شخصیت سامنے آجاتی ہے، جس کا نام ساحر لدھیانوی ہے۔ ساحر ادب اور فلم دونوں کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے کروڑوں ہندوستانی فلم بینوں کو ذہنی طور پر متاثر کیا، اور فلمی شاعروں کو اسٹار ڈم Stardom دلائی۔ ورنہ ان سے پہلے ممبئی کی زبان میں فلمی گیت کاروں اور مکالمہ نویسوں کو منشی جی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

ساحر کا اصل نام عبدالحئی تھا 8 مارچ 1921 کو لدھیانہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ سردار بیگم تھیں۔ والد فضل محمد ایک غصہ ور جاگیردار تھے اور انھوں نے متعدد شادیاں کی تھیں۔ سردار بیگم نے شدید گھریلو اختلافات کی بنا پر شوہر سے علاحدگی اختیار کر لی اور ساحر زندگی بھر اپنے والد سے ناراض رہے۔ والد نے بعد میں انھیں واپس لینے کی کوشش کی، جائداد میں پورا حصہ دینے

جاں نثار اختر

ادبی شعری تخلیقات کی طرح فلمی نغموں میں بھی شستہ و شائستہ انداز سخن، اردو شعری روایات کی مکمل پاس داری، اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود، نرم ودھیمے لہجے کی بنا پر سب سے الگ پہچانے جانے والے جاں نثار اختر نے بہت کم فلموں کے لیے کام کیا، یہاں تک کہ خود اپنی پروڈیوس کی ہوئی فلم 'بہو بیگم' کے لیے بھی ساحر لدھیانوی سے گیت لکھوائے، لیکن جتنے بھی نغمے انھوں نے لکھے (کل 151) وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ یاسمین کا نغمہ 'بے چین نظر بے تاب جگر' ہو یا رضیہ سلطان کا 'اے دل ناداں آرزو کیا ہے، جستجو کیا ہے' یا پھر 'پریم پربت' کا 'یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے' ان کے ہر نغمے، اردو شاعری کا دل دھڑکتا تھا۔ 'پریم پربت' کے ہی ایک گیت 'رات پیا کے سنگ جاگی رے سکھی' کو فحش قرار دے کر سرکاری ریڈیو اسٹیشن کے لیے بعض افسروں نے اس گیت پر پابندی لگادی تھی۔ اس وقت مرحوم اندر کمار گجرال وزیر اطلاعات ونشریات تھے جنھوں نے بذات خود گیت کا ریکارڈ سنا اور ادب ناآشنا افسروں کو ڈانٹ کر گیت پر سے پابندی ہٹوائی تھی۔ جاں نثار کی پیدائش 14 فروری 1914 کو گوالیار میں ہوئی اور انتقال 19 اگست 1976 کو ممبئی میں ہوا۔ اپنے دور کے مشہور مضطر خیر آبادی ان کے والد تھے۔ جاں نثار نے گوالیار میٹرک کے بعد 1930 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا، لیکن گھریلو حالات کے سبب پی ایچ ڈی چھوڑ کر گھر لوٹ آئے۔ ان کی اہم فلمیں یاسمین، الیلی، انارکلی، باپ رے باپ، چھومنتر، سی آئی ڈی، رستم سہراب، داستان لیلی مجنوں، نیا انداز، پریم پربت، رضیہ سلطانہ، نوری، شنکر حسین ہیں۔ چینی حملے پر محبوب خاں کی بنائی ہوئی، حب الوطنی کے دو نغموں کی فلموں میں سے ایک 'آواز دو' کا نغمہ 'آواز دو ہم ایک ہیں' بھی انھوں نے لکھا۔ انھیں شعری مجموعہ 'خاکِ دل' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، 1980 میں دیا گیا اور فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزد کیے گئے۔

پردیپ

حب الوطنی کے نغمے، بھجن اور اصلاحی گانے لکھنے میں کمال حاصل کرنے والے کوی پردیپ گلوکار بھی تھے اور منفرد انداز میں گائے ہوئے ان کے گانے آج بھی مقبول ہیں۔ ہندی شاعر ہونے کے باوجود ان کے اکثر گیت اردو کے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے گیتوں کے مکھڑے، بہت اچھے ہوتے تھے۔ پردیپ کا اصل نام رام چندر بریان جی دیویدی تھا۔ ان کی پیدائش 6 فروری 1915 کو اجین، مدھیہ پردیش میں ہوئی۔ 1940 میں پہلی بار فلم 'بندھن' کے لیے گیت لکھے۔ فلموں میں حب الوطنی کے لیے لکھے گئے نغموں کے لیے انھیں 'راشٹر کوی' کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ اور بنگالی فلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن ایوارڈ بھی دیے گئے۔ جھولا، ناستک، پیغام، جاگرتی، طلاق، سمبندھ، جے سنتوشی ماں

کی پیش کش بھی کی گئی، اور معاملہ عدالت میں بھی پہنچا مگر ساحر تب تک بڑے ہو چکے تھے اور انھوں نے والد کے پاس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ سردار بیگم نے اپنے بھائیوں کی مدد سے بڑی جفاکشی میں ساحر کی پرورش کی۔ لدھیانہ کے خالصہ ہائی اسکول میں میٹرکیولیشن کے بعد ساحر کو گریجویشن کے لیے ستیش چندر دھون گورنمنٹ کالج فار بوائیز (لدھیانہ) میں داخل کرایا گیا جہاں بظاہر انھیں پرنسپل کے لان میں ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھے ہونے کی بنا پر کالج سے نکال دیا گیا لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ جدوجہد آزادی سے ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لڑکی امرتا پریتم تھیں لیکن یہ غلط ہے کیونکہ امرتا کبھی لدھیانہ گئی ہی نہیں اور ساحر سے ان کی پہلی ملاقات تقسیم وطن کے بعد دہلی میں ہوئی جہاں وہ لاہور سے آکر رہنے لگی تھیں۔

لدھیانہ چھوڑ کر ساحر لاہور آبسے جہاں سے انھوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ 'تلخیاں' شائع کیا جس سے وہ اردو کے تمام ادبی حلقوں میں مشہور ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے ادب لطیف، شاہراہ، پریت لڑی اور سویرا جیسے ادبی رسائل کی ادارت کی۔ فلموں میں قسمت آزمائی کے لیے ممبئی بھی گئے جہاں خواجہ احمد عباس نے انھیں بڑا آسرا دیا جو ان دنوں صحافت کی دنیا میں تھے۔ لیکن کچھ عرصے کی جدوجہد کے بعد ہی ساحر مایوس ہوکر واپس پاکستان چلے گئے۔ ان ہی دنوں خواجہ احمد عباس نے اپنے مشہور کالم میں ساحر کے نام ایک کھلا خط لکھا جس میں ساحر کے حوالے سے انھوں نے ان تمام ترقی پسند ادیبوں کے ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کی جو مذہب کی بنیاد پر بنائے گئے پاکستان میں بسنے کے لیے چلے گئے تھے۔ اس خط نے ساحر کو بہت متاثر کیا اور انھوں نے پاکستان چھوڑ دیا۔ 1949 میں دہلی میں چند ماہ گزار کر انھوں نے ممبئی کا رخ کیا اور اس بار وہ اس شہر کو فتح کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کی پہلی فلم 'آزادی کی راہ پر' تھی جس کے لیے انھوں نے چار گانے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا:

بدل رہی ہے زندگی بدل رہی ہے زندگی
یہ اجڑی اجڑی بستیاں یہ لوٹ کی نشانیاں
یہ اجنبی پہ اجنبی کے ظلم کی کہانیاں
اب ان دکھوں کے بوجھ سے نکل رہی ہے زندگی
زمیں پہ سرسراہٹیں فلک پہ تھرتھراہٹیں
فضا میں گونجتی ہیں اک نئے جہاں کی آہٹیں
سنور رہی ہے زندگی مچل رہی ہے زندگی
بدل رہی ہے زندگی بدل رہی ہے زندگی

ان کی اہم فلمیں ہیں۔ آج ہمالہ کی چوٹی سے، کتنا بدل گیا انسان، آؤ بچو تمھیں دکھائیں، چل اکیلا چل اکیلا اور اے میرے وطن کے لوگو ان کے مشہور ترین گیت ہیں۔ 11 دسمبر 1998 کو ان کا انتقال ہوا اور اس سے ایک سال پہلے انھیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

شکیل بدایونی

ہندوستانی فلمی نغموں میں اردو شعریت و تغزل کی چاشنی اور اس کے مخصوص نیم کلاسیکی و رومانی لب و لہجے کو فروغ دینے میں سب سے بڑا کردار شکیل بدایونی نے ادا کیا جنھوں نے اپنی پہلی فلم 'درد' کے نغمے 'افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا' سے ہی پورے ملک میں دھوم مچا دی تھی۔ موسیقار اعظم نوشاد علی کے وہ پسندیدہ نغمہ نگار تھے لیکن انھوں نے موسیقار غلام محمد، روی، ہیمنت کمار اور کلیان جی آنند جی کے لیے بھی نغمے لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ ان کی پیدائش 3 اپریل 1916 کو بدایوں، یوپی میں اور وفات: 20 اپریل، 1970 کو ممبئی میں ہوئی۔ محمد جمیل احمد سوختہ قادری ان کے والد تھے۔ عربی، اردو، فارسی اور ہندی کی تعلیم انھوں نے گھر پر ہی حاصل کی تھی اور 1936 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ ان کی اہم فلمیں، درد، بیجو باورا، مدر انڈیا، مغل اعظم، دلاری، شباب، گنگا جمنا، میرے محبوب، چودھویں کا چاند، صاحب بیوی اور غلام، گھرانہ، گھونگھٹ وغیرہ ہیں۔ 1961، 1962 اور 1963 میں انھیں فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا اور گیت کار اعظم کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

کیفی اعظمی

فلمی نغمہ نگاری میں بڑی حد تک ساحر لدھیانوی کی پیروی کرنے والے کیفی اعظمی کا سب سے منفرد کارنامہ یہ ہے کہ ہندوستانی سنیما کی واحد منظوم فلم 'ہیر رانجھا' کا پورا منظر نامہ اور منظوم مکالمے ان کے ہی لکھے ہوئے تھے۔ فلم 'گرم ہوا' اور 'منتھن' سمیت کئی فلموں کے مکالمے بھی انھوں نے لکھے تھے۔ ان کی پیدائش 14 جنوری 1919 گاؤں مزواں ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی اور وفات 10 مئی 2002 کو ممبئی میں پائی۔ اہم فلمیں یہودی کی بیٹی، پروین، عید کا چاند، چالیس دن، ہیر رانجھا، کاغذ کے پھول، حقیقت، کوہرا، انوپما، سات ہندستانی، شعلہ اور شبنم، پروانہ، پاکیزہ، ارتھ، رضیہ سلطان۔ انھیں پدم شری، اردو اکادمی ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، مہاراشٹر ساہتیہ اکادمی، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، لوٹس ایوارڈ، صدر جمہوریہ ایوارڈ برائے قومی یکجہتی، دہلی اردو اکادمی اور حکومت دہلی کی جانب سے فرسٹ ملینیم ایوارڈ کے علاوہ فلم فیئر کے اسکرین پلے ایوارڈ، کہانی ایوارڈ اور گیتوں کے لیے قومی یک جہتی ایوارڈ بھی دیے گئے۔

راجندر کرشن

آزادی سے پہلے اور بعد کے تقریباً تمام میوزک ڈائریکٹروں کے لیے لگاتار بے حد دل کش نغمے لکھنے اور گیتوں کی زبان پر مکمل عبور رکھنے والے راجندر کرشن فلمی دنیا میں آنے سے پہلے شعلہ تخلص کرتے تھے اور شملہ میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ممبئی آکر وہ شعلہ شملوی سے پھر راجندر کرشن بن گئے۔ ان کے والد پنجاب کے ضلع گجرات کے رہنے والے تھے لیکن شملہ آبسے تھے۔ راجندر کرشن 6 جون 1919 کو پیدا ہوئے۔ شملہ میونسپل آفس کی نوکری چھوڑ کر وہ 1940 میں ممبئی آگئے۔ اور نغمہ نگاری سے پہلے فلموں میں اسکرپٹ لکھنا شروع کیا۔ پہلی بار 1947 میں ایک اسکرین پلے 'جنتا' کے نام سے لکھی۔ پہلی مرتبہ فلم 'زنجیر' 1947 کے لیے نغمہ لکھا۔ بطور نغمہ نگار، عدالت، بھروسہ، میں چپ رہوں گی، پوجا کے پھول، شرابی، جہاں آرا، پڑوسن، بابی ٹو گوا، نئی روشنی، پیار کیے جا، گوپی، خاندان، مہربان، ڈولی ان کی چند مشہور فلمیں ہیں۔ ساٹھ کے عشرے میں انھوں گھوڑ دوڑ میں 46 لاکھ روپے کا جیک پاٹ جیتا تھا اور اس طرح وہ اپنے وقت کے سب سے دولت مند نغمہ نگار تھے۔ انھیں کئی بار فلم فیئر ایوارڈ ملا۔

مجروح سلطان پوری

فلمی نغموں کو خالص اردو لب و لہجہ دینے اور سے اردو کی شعری لفظیات سے ہندوستانی فلموں کے گیتوں

لیکن کسی بھی گانے کو مقبولیت نہیں ملی۔ شاید اس لیے بھی کہ موسیقار (جی ڈی کپور) اور گلوکار (بی ایس نن جی) غیر معروف لوگ تھے۔ بعد میں سچن دیو برمن جیسے بڑے موسیقار کے ساتھ ان کی جوڑی بن گئی۔ ان کے لیے انھوں نے فلم 'نوجوان' اور گرودت کی پہلی فلم 'بازی' کے گیت لکھے۔ ان میں بازی پہلے ریلیز ہوئی اور ان کے لکھے ہوئے سبھی گیت پسند کیے گئے۔ اس کے بعد ساحر نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ٹیکسی اسٹینڈ، فنٹوش، ہاؤس نمبر 44، منیم جی وغیرہ میں ان کے گیتوں نے دھوم مچادی۔ پیاسا کے گیتوں نے مقبولیت کی بلندیوں کو چھولیا۔ مگر بدقسمتی سے یہی اس جوڑی کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ لتا منگیشکر اور ایس ڈی برمن دونوں سے وہ ناراض ہو گئے۔ یہیں سے انھوں نے اپنے ہر گانے کے لیے لتا منگیشکر سے ایک روپیہ زیادہ فیس وصول کرنے اور موسیقار سے بھی زیادہ معاوضہ لینے کی شرط کا اعلان کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ شنکر جے کشن اور نوشاد کے لیے انھوں نے کبھی گیت نہیں لکھے۔ تاہم بہت سے نسبتاً غیر مقبول موسیقار فائدے میں بھی رہے۔ ان میں خیام، این دتہ، روشن اور روی کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ یہی نہیں ساحر نے آل انڈیا ریڈیو کو بھی مجبور کیا کہ وہ فلمی گانے بجاتے وقت موسیقار اور گلوکار کے ساتھ نغمہ نگار کا نام بھی اناؤنس کرے گا۔ اپنے لیے ایک اصول انھوں نے یہ وضع کر لیا تھا کہ کسی بھی موسیقار کو گیت سنانے کے لیے اس کے گھر پر جانا چھوڑ دیا۔ ساحر کے اس انانیت بھرے رویّے کی نکتہ چینی کی جاسکتی ہے اور اسے فلمی دنیا کا ایک نقصان بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس رویّے کی وجہ سے نہ جانے کتنے اچھے اچھے گیت وجود میں آنے سے رہ گئے ہوں گے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس سے فلمی دنیا میں گیت کار کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا اور ان کے بعد آنے والے کئی نغمہ نگار فائدے میں بھی رہے۔

تاہم ساحر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں فلمی نغموں کے میڈیم کو ایک نئی معنویت بخشی اور اسے ادبی وہ تہذیبی روایات کی تقویت، اور صالح جذبات ونظریات کی تبلیغ کے لیے قصداً استعمال کیا۔ ساحر کے مداح نصرت ظہیر اپنے ایک مضمون (فلمی شاعری کا محسن: ساحر 'ادب ساز' مطبوعہ 2010) میں لکھتے ہیں:

''ساحر اردو کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے فلمی گانوں کی طاقت اور توانائی کو پہچانا اور ان کے ذریعے سیکولرزم اور مارکسی فکر کی آفاقیت کو عام لوگوں کے ذہنوں تک پہنچانے کی شعوری کوشش کی۔ فلمی شاعری ان کے رشتہ جوڑے رکھنے میں مجروح صاحب کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ فلمی نغمہ نگاری کے لیے سب سے پہلا دادا صاحب پھالکے ایوارڈ بھی ان ہی کو دیا گیا۔ شکیل بدایونی کی طرح مجروح بھی مشاعروں سے فلم میں آئے تھے۔ فلمی گیتوں میں محبوب کے لیے ساجن، سجن، یا بالم اور بلم کی جگہ لفظ صنم کے استعمال کا رواج مجروح نے ہی ڈالا تھا۔ محبوبہ کے لیے 'قبلہ محترمہ کبھی شعلہ کبھی نغمہ' جیسے تخاطب، اور 'زبان یار من ترکی، و من ترکی نمی دانم' جیسے فارسی محاوروں کے استعمال سے انھوں نے اردو کو ہندوستانی فلمی شاعری کی مادری زبان بنا دیا تھا۔ ان کا اصل نام اسرار الحسن خان تھا۔ 1 اکتوبر 1919 کو وہ سلطانپور یوپی میں پیدا ہوئے اور 24 مئی 2000 کو ممبئی میں 80 سال کی عمر میں وفات پائی۔ مدرسہ کے درس نظامیہ کے تحت انھوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور 'عالم' کی سند کے ساتھ فراغت پائی تھی، بعد ازاں لکھنو میں طبِ یونانی کی تعلیم کے لیے تکمیل الطب کالج میں داخلہ لیا اور حکمت میں فراغت حاصل کی۔ ان کی اہم فلموں میں شاہجہاں، سی آئی ڈی، تم سا نہیں دیکھا، چھوٹے نواب، دوستی، پھر وہی دل لایا ہوں، ساتھی، دستک، تیسری منزل، بہاروں کے سپنے، بہاروں کی منزل، پیار کا موسم، یادوں کی بارات، قیامت سے قیامت تک، ہم کسی سے کم نہیں شامل ہیں۔ انھیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ 1993 میں دیا گیا۔ فلم دوستی کے لیے انھیں فلم فیئر ایوارڈ ملا تھا

حسرت جے پوری

مشہور موسیقار جوڑی شنکر جے کشن نے اپنی پہلی فلم 'برسات' سے شیلندر کے ساتھ حسرت جے پوری کو بھی فلمی دنیا سے متعارف کرایا، جس کے بعد حسرت نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انھوں نے ہر طرح کے گیت لکھے جن میں شعری لوازمات کے مقابلے میں انھوں نے موسیقی اور فلم کے منظرنامے کا زیادہ خیال رکھا۔ ہلکا پھلکا رومانی لہجہ ان کے گیتوں کا خاصہ تھا۔ حسرت جے پوری نے اپنے عہد کے لگ بھگ سبھی موسیقاروں کے لیے گیت لکھے۔ ان کی پیدائش 15 اپریل 1922 کو جے پور میں ہوئی اور 17 ستمبر 1999 کو ممبئی میں وفات پائی۔ ان کا اصل نام اقبال حسین تھا۔ ثانوی سطح تک انگریزی پڑھی۔ پھر اپنے دادا فدا حسین سے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ برسات، انداز، سسرال، سہرا، گیت گایا پتھروں نے، جنگل، لو اِن ٹوکیو، تیسری قسم، رام تیری گنگا میلی، لال پتھر، سنگم وغیرہ۔ 1972,1966، میں انھیں فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ اس کے علاوہ، ڈاکٹر امبیڈکر ایوارڈ اور ورلڈ یونیورسٹی راؤنڈ ٹیبل سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

ایس ایچ بہاری

آناً فاناً کسی بھی دھن پر ایسا نغمہ تخلیق کر دینا جو کسی قدر وزن اور بحر میں بھی ہو اور جس کا ہر لفظ دھن کے زیر و بم کے ساتھ پیوست محسوس ہو ایسے نغمے لکھنے میں ایس ایچ بہاری کو ملکہ حاصل تھا۔ بہار میں پیدا ہونے والے اس شاعر کا پورا نام تھا شمس الہدیٰ لیکن فلموں میں وہ ایس ایچ بہاری کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے کلکتہ میں بی اے تک تعلیم حاصل کی، اور شروع میں موہن بگان ٹیم کے لیے فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ ان کے بھائی ہدا بہاری فلمی ہدایت کار اور پروڈیوسر تھے۔ 1947 میں ایس ایچ بہاری ممبئی چلے آئے۔ 25 فروری 1987 کو دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے روی، او پی نیر، ہیمنت کمار سمیت بہت سے موسیقاروں کے لیے گیت لکھے لیکن بقول روی مرحوم وہ اپنے کیریئر کے سلسلے میں سنجیدہ نہیں تھے۔ تعریف کروں کیا اس کی جس نے تمھیں بنایا، نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے، تمھارا چاہنے والا خدا کی دنیا میں، ان کے مقبول نغموں میں شامل ہیں۔ شرط، ساون کی گھٹا، کشمیر کی کلی، ایک مسافر ایک حسینہ، قسمت، یہ رات پھر نہ آئے گی وغیرہ ان کی خاص فلمیں ہیں۔

اندیور

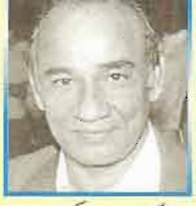

نیرج، بھرت ویاس اور انجان کی طرح اندیور بھی ہندی بیک گراؤنڈ سے آنے کے باوجود ہندوستانی سینما میں اردو زبان کی شیرینی کو اپنے گیتوں سے بکھیرتے رہے۔ ان کا نام شیام لال بابو

لیے صرف تفریحی مشغلہ اور دولت کمانے کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک مشن تھی۔ جب بھی موقع ملا انھوں نے مارکسی عقلیت پسندی کو عام کرنے کے لیے سیدھے سادے لفظوں کے ذریعے وہ لاجواب نغمے لکھے جن کا اس ملک کے نوجوان طبقے کی صحت مند ذہن سازی میں اتنا ہی بڑا ہاتھ ہے جتنا کبیر اور اس کی قبیل کے دوسرے انسان دوست عوامی شاعروں کا رہا ہوگا۔ ان عظیم شاعروں کے دوہوں کی طرح ساحر کے گیتوں نے بھی سچائی، حق پرستی، انصاف و مساوات، مذہبی یگانگت، انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے جذبات کو ہندوستانی سائیکی کا حصہ بنانے اور ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کے لیے اکسانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔''

ساحر لدھیانوی محمد رفیع کے ساتھ

ساحر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے بیشتر گیتوں میں فلموں کی بجائے ادب کی چھاپ ملتی ہے بہت سے گیتوں کے سلسلے میں تو یہ ادب اور فلم کا امتیاز بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ساحر نے اپنی کئی نظمیں جو اُن کے ادبی مجموعوں 'تلخیاں' اور 'آؤ کہ کوئی خواب بُنیں' میں شامل ہیں فلموں میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً، چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں، پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی/ یہ بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں، میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے، کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے، میں پل دو پل کا شاعر ہوں وغیرہ۔ مشہور نظم 'چکلے' کا ٹیپ کا ادق مصرع 'ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں' بدل کر انھوں نے 'جنھیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں' کر دیا اور پوری نظم فلم 'پیاسا' میں استعمال کی جس کی کہانی کا ابتدائی حصہ بہت کچھ ساحر کی اپنی زندگی سے مطابقت رکھتا تھا۔ لیکن ان نظموں کے برعکس ان کے کئی فلمی نغمے ایسے

رائے تھا اور وہ 1924 کو موضع برواساگر، ضلع جھانسی یوپی میں پیدا ہوئے۔ 1949 میں موسیقار روشن کی ہدایت میں 'بڑے ارمانوں سے رکھا ہے بلم تیری قسم، پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم' لکھتے ہی وہ مشہور ہو گئے جس کے بعد تقریباً 300 فلموں کے لیے انھوں نے ایک ہزار سے زائد گیت لکھے۔ 27 فروری 1997 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ملہار پہلی فلم تھی۔ دیگر خاص فلموں میں اپکار، سرسوتی چندر، جانی میرا نام، سفر، ڈان، ساجن بنا سہاگن، کوئلہ، یہ ہے بامبے میری جان، پورب اور پچھم، امانش شامل ہیں۔ کلیان جی آنند جی کے وہ پسندیدہ گیت کار تھے۔ انھیں کئی فلم فیئر ایوارڈ ملے۔

راجہ مہدی علی خان

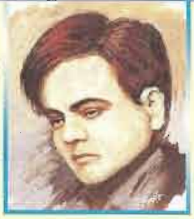

فلمی نغموں میں اردو شاعری اور جذبات نگاری کے حسن کو اس کی تمام تر شیرینی کے ساتھ برقرار رکھنے والوں میں ایک نام راجہ مہدی علی خاں کا بھی ہے جنھوں نے بہت کم عمر پائی پھر بھی لاجواب گیتوں کا ایک خزانہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ ان کی پیدائش موجودہ پاکستان کے کریم آباد میں 1928 میں ہوئی۔ 29 جولائی 1966 کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے یوں تو کئی موسیقاروں کے ساتھ کام کیا لیکن مدن موہن اور ان کی جوڑی بہت کامیاب رہی۔ ان کی اہم فلموں میں شہید، میرا سایہ، وہ کون تھی، پوجا کے پھول، ایک مسافر ایک حسینہ، نیلا آکاش، دلہن اک رات کی، نواب سراج الدولہ شامل ہیں۔

آنند بخشی

اردو کا کوئی ادبی پس منظر نہ رکھنے کے باوجود اردو کا شعری ذائقہ فلموں میں بھرپور انداز سے پیش کرنے والوں میں آنند بخشی کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔ 21 جولائی 1930 کو راولپنڈی میں پیدا ہونے والے آنند پرکاش بخشی نے ہر طرح کے فلمی نغمے تحریر کیے، بول چال کی زبان کو گیتوں کا حصہ بنایا اور اچھا تو ہم چلتے ہیں، اور، یہ کیا ہوا کیسے ہوا کیوں ہوا کب ہوا چھوڑو یہ نہ سوچو، جیسے گیت لکھے، زندگی کا کوئی ایسا مرحلہ یا پہلو ایسا نہیں جس کو موضوع بنا کر انھوں نے نغمے تحریر نہ کیے ہوں۔ قافیہ پیمائی پر انھیں عبور حاصل تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ فوج میں چلے گئے تھے، وہاں سے ممبئی کا رخ کیا، سخت جدوجہد کے دور سے گزرے اور بالآخر ہندوستانی سنیما کے سب سے بڑے گیت کار بن گئے۔ انھیں سانگ انجینئر بھی کہا جاتا تھا۔ 30 مارچ 2002 کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔ سینک سماچار، اردو 1950 میں پہلی بار ان کی کوئی غزل شائع ہوئی تھی۔ ان کی ایک دلچسپ نظم 'مری تصویر لے کر کیا کرو گی' ماہنامہ شمع میں شائع ہوئی جس پر بعد میں فلم کالا سمندر کے لیے قوالی تیار ہوئی۔ انھوں نے 650 فلموں کے لیے تقریباً 3500 نغمے لکھے۔ جب جب پھول کھلے پہلی فلم تھی جس کے تمام گیت انھوں نے لکھے اور سبھی ہٹ ہوئے۔ امر اکبر انتھونی، دھرم ویر، اپنا پن، کٹی پتنگ، ایک دوجے کے لیے، وغیرہ ان کی خاص فلموں میں شامل ہیں۔ چار مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ سے نوازے گئے۔

شہر یار

فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کی طرح شہر یار بھی اردو کے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے باقاعدہ فلمی دنیا میں رہ کر فلموں کی سچویشن کے مطابق نغمہ نگاری تو نہیں کی لیکن ان کی شعری تخلیقات کو فلموں میں نمایاں جگہ اور عوامی مقبولیت ملی۔ مظفر علی کی فلم 'امراؤ جان' کی چاروں غزلیں شہر یار کی تخلیق کردہ تھیں اور اسی ایک فلم نے انھیں ہندوستان میں گھر گھر پہنچا دیا۔ شہر یار نے کچھ وقت فلم نگری میں گزارا ضرور مگر جلد ہی انھیں اس میں اپنے 'مس فٹ' ہونے کا احساس ہو گیا اور انھوں نے آزادانہ طور پر کسی فلم یا موسیقار کے لیے نغمہ نگاری نہیں کی۔ گمن پہلی فلم تھی جس میں ان کی دو غزلیں 'عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو' اور 'سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے' تھیں اور یہ دونوں کافی مشہور ہوئیں۔ ان کا اصل نام کنور اخلاق محمد خان تھا۔ پیدائش 16 جون 1936 کو بریلی میں ہوئی، اور 13 فروری 2012 کو وفات پائی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بلند شہر اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پائی تھی۔ گمن، امراؤ جان، انجمن میں ان کی خاص

ہیں جو پوری ادبی شان رکھتے ہوئے بھی ان کے ادبی مجموعوں میں نہیں ملیں گے۔ مثلاً، میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، سب میں شامل ہو مگر سب سے جدا لگتی ہو، آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے، شعر کا حسن ہو نغموں کی جوانی ہو تم، تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو، میں ہر اک پل کا شاعر ہوں، وہ صبح کبھی تو آئے گی، پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ، تم مجھے بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو، مایوس تو ہوں وعدے سے ترے کچھ آس نہیں کچھ آس بھی ہے، خدائے برتر تری زمیں پر زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے، تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں، محفل سے اٹھ جانے والو تم لوگوں پر کیا الزام، آپ

ساحر لدھیانوی جاں نثار اختر کے ساتھ

آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا، مجھے گلے سے لگالو بہت اداس ہوں میں، جیو تو ایسے جیو جیسے سب تمھارا ہے، اپنے اندر ذرا جھانک میرے وطن، تم چلی جاؤ گی پرچھائیاں رہ جائیں گی، میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں تم چپکے سے آجاتے ہو، لوگ کہتے ہیں کہ ہم تم سے کنارا کرلیں، ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک، میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی، مرے ندیم مرے ہم سفر اداس نہ ہو وغیرہ۔ فلم 'پیاسا' کی ایک نظم، 'یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا' سن کر تو سخت حیرت ہوتی ہے کہ اسے ساحر نے اپنے ادبی مجموعے میں کیوں شامل نہیں کیا۔

ساحر نے اپنے فلمی گیتوں میں زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے کو چھو کر دیکھا اور دکھایا ہے۔ فقیروں، مالشیے، حجام، تانگے والے، راج مزدور اور کباڑی جیسے پیشوں میں لگے سماج کے سب سے نچلے طبقے کے لوگوں کا دکھ درد علی الترتیب تجھ کو رکھے رام تجھ کو اللہ رکھے، سر جو ترا چکرائے، میں ہوں اک حجام پیارے، گھوڑا پشوری میرا، بوجھ اٹھالے ساتھی بوجھ اٹھالے اور خالی ڈبّا خالی بوتل لے لے میرے یار جیسے طنزیہ گیتوں میں بیان کیا ہے۔ وہ صبح کبھی تو آئے گی، ساتھی ہاتھ بڑھانا، قدم قدم سے دل سے دل ملا رہے ہیں ہم، جاگے گا انسان زمانہ دیکھے گا، جیسے گیتوں سے محنت کشوں کی حکومت کے سپنے بُنے ہیں۔ وطن کا کیا ہوگا انجام، اپنے عیبوں کو مت ڈھانک میرے وطن، یہ دنیا سورنگی ہے، جیسے گیتوں سے قومی مسئلوں کی نشان دہی کی ہے۔ یہ دیش ہے ویر جوانوں کا جیسے گیت لکھ کر اپنی مٹّی سے انسانی لگاؤ کی اہمیت کو انڈر لائن کیا ہے۔ عورت نے جنم دیا مردوں کو، لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں، اے میرے ننھے گل فام، جیسے گیتوں سے عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو سامنے رکھا ہے۔ تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا اور یہ مسجد ہے وہ بت خانہ چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو جیسے گیتوں سے مذہبی تعصب کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ بچے من کے سچے، بچو تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی، بھارت ماں کی آنکھ کے تارو جیسے گیت لکھ کر انسان کا مستقبل بننے والوں کی رہنمائی کی ہے، من رے تو کاہے نہ دھیر دھرے، تورا من درپن کہلائے، آج سجن موہے انگ لگالو جیسے گیت رچ کر فلم بینوں کو ہندی زبان کی سندرتا اور بھکتی رس کی جمالیات سے متعارف کرایا ہے اور یہ سب کچھ ساحر نے جس منطقی اور سائنسی انداز فکر و نہج پر تخلیق کیا ہے اس طرح نہ پہلے کسی نے سوچا نہ تخلیق کیا۔

■

Miss Sameena Parveen, Dar-us-salam International (DPS) Riyadh (KSA)

فلمیں ہیں۔ انھیں 2008 کا گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، فراق سمان اور بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے بھی سرفراز ہوئے۔

ندا فاضلی

ندا فاضلی ساحر اور شکیل بدایونی کے بعد کے ان فلمی شاعروں میں ہیں جنھوں کم گیت لکھے لیکن اپنی الگ چھاپ چھوڑنے میں کامیاب رہے۔ مقتدا حسن ندا فاضلی کی پیدائش 12 اکتوبر 1938 کو گوالیار میں ہوئی۔ بطور صحافی دھرم یگ اور بلٹز میں کالم نویسی اور تبصرہ نگاری کی۔ ٹی وی سیریل، نیم کا پیڑ اور جیوتی کے لیے ٹائٹل سانگ لکھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد والدین اور دوسرے عزیز و اقارب پاکستان ہجرت کر گئے لیکن ندا نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ لفظوں کے پھول، مور ناچ، آنکھ اور خواب کے درمیان، سفر میں دھوپ تو ہوگی، کھویا سا کچھ، دنیا ایک کھلونا ہے، ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے شاعری (1998) اسٹار اسکرین ایوارڈ برائے بہترین نغمہ نگاری فلم 'سُر' (2003) اور اسی فلم کے لیے ہندوستانی سنیما مووی ایوارڈ سے نوازے جاچکے ہیں۔ رضیہ سلطان، تمنا، اس رات کی صبح نہیں، آپ تو ایسے نہ تھے، یاترا، سُر، سرفروش ان کی خاص فلمیں ہیں۔

جاوید اختر

عصر حاضر کے کامیاب فلمی نغمہ نگاروں میں ایک اہم نام جاوید اختر کا ہے، جنھوں نے ابھی تک بہت کم مگر بہت کامیاب فلمی نغمے تحریر کیے ہیں، جن میں اردو ادب اور لوک گیتوں کی چاشنی موجود ہے۔ سلیم جاوید کی جوڑی والے جاوید اختر، جان نثار اختر کے فرزند، کیفی اعظمی کے داماد، شبانہ اعظمی کے شوہر، مجاز کی بہن صفیہ اختر کے بیٹے اور ان دنوں راجیہ سبھا کے رکن ہیں اور ساحر و کیفی کے بعد کی نسل کے اہم ترقی پسند شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش 17 جنوری 1945 کو گوالیار میں ہوئی۔ فلمی دنیا میں پہلے انھوں نے اسکرپٹ رائٹر اور مکالمہ نویس کے طور پر نام کمایا اور پھر آنند بخشی کی مشورے پر فلموں کے لیے گیت بھی لکھنے لگے۔ 'یقین' پہلی فلم تھی جس کے لیے انھوں نے اسکرپٹ لکھا۔ یہ فلم ناکام رہی۔ بعدازاں اپنے دوست سلیم خان کے ساتھ مل کر کامیاب اسکرپٹ نگار بن گئے۔ اس جوڑی کی پہلی فلم 'ادھیکار' تھی جو کامیاب رہی۔ اس کے ساتھ انداز، ہاتھ کی صفائی، ہاتھی میرے ساتھی بھی 1971 میں آئیں جو ہٹ ہوگئیں۔ مجبور، دیوار، زنجیر اور شعلے اس جوڑی کی وہ تاریخ ساز فلمیں تھیں جنھوں نے کمرشیل سنیما کا رخ ہی بدل دیا۔ جاوید اختر نے اس جوڑی کے ٹوٹنے کے بعد آزادانہ طور پر کچھ فلموں کے اسکرپٹ اور مکالمے لکھے مگر انھیں پہلے جیسی کامیابی نہیں ملی۔ البتہ فلمی نغمہ نگاری نے انھیں آٹھ مرتبہ 'فلم فیئر ایوارڈ' دلائے۔ انھیں پدم شری، پدم بھوشن اور اودھ رتن جیسے اعزازات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ ساز، بارڈر، گاڈ مدر، ریفیوجی، لگان، ان کی اہم فلمیں ہیں۔

اس مضمون کے ساتھ دیے گئے مختلف شخصیتوں کے سوانحی کوائف 'اردو دنیا' کے ادارتی شعبے کی ٹیم نے مختلف ذرائع سے ملنے والے حوالوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ ادارہ

■ محمد نثار

فلمی موسیقی کا گاڈ فادر

نوشاد علی

شہنشاہ موسیقی نوشاد علی ہندوستانی فلمی موسیقی میں ایک 'مسیحا' اور گاڈ فادر کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ میں مشرقی تہذیب وتمدن کا حسین امتزاج تھے۔ ان کی موسیقی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہ دوسرے موسیقاروں سے بالکل منفرد اور لازوال ہے۔ انھوں نے جو دھنیں بنائیں وہ ہماری تہذیبی وراثت کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ وہ بیک وقت متنوع شخصیت کے حامل انسان تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ غیر معمولی صلاحیت کے مالک اور تاریخ ساز (لیجنڈری) موسیقار تھے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایسا لگتا ہے جیسے علامہ سر محمد اقبال نے یہ شعر شہنشاہ موسیقی نوشاد کے لیے کہا تھا کیونکہ یہ شعر ان کی زندگی کے نشیب وفراز کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

ہندوستانی سنیما میں پہلی مرتبہ اتر پردیش کے لوک گیتوں کی خوشبو ڈالنے والے نوشاد صاحب ایک ایسے موسیقار تھے جنھوں نے نت نئے تجربات اور مشاہدات کے ذریعے موسیقی کو نئے نئے ڈائمنشن دیے۔ کلاسیکی موسیقی کو لوک گیتوں کے سریلے اور الھڑ انداز سے جوڑنے والے نوشاد صاحب نے جدت اور ندرت کے لیے موسیقی کے ہر کونے کو چھونے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں انھوں نے فلمی موسیقی کو انمول وراثت سے مالا مال کیا۔

تہذیب وتمدن کے عظیم گہوارہ اور شام اودھ کے لیے مشہور شہر لکھنؤ میں 25 دسمبر 1919 کو پیدا ہوئے۔ نوشاد صاحب نے اتر پردیش کے مختلف حصوں میں گائے جانے والے لوک گیتوں کو فلمی نغموں میں پرو کر انھیں ایک علاقے کے بندھن سے نہ صرف آزاد کیا بلکہ نئی بلندی عطا کی۔ اتر پردیش کے لوک گیتوں کو شامل کیے جانے سے قبل فلموں میں پنجابی لوک گیت کا خاصا اثر تھا۔

اپنے کیریئر میں آسمان کی بلندی کو چھونے والے اور نئے نئے باب جوڑنے والے نوشاد کا سفر آسان نہیں تھا۔ ان کے والدین سخت مذہبی تھے اور ان کا گانے بجانے سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ایسے میں انھیں کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہوگا اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ دوسرے اس بلندی پر پہنچنے میں وہ نہ صرف ممبئی کی سڑکوں کی برسوں تک خاک چھانتے رہے بلکہ

سچن دیو برمن

شمال مشرقی ہندوستان کے لوک سنگیت، خاص طور سے بنگلہ سنگیت کو ہندوستانی سنیما کا اہم حصہ بنادینے والے سچن دیو برمن تری پورا کے شاہی گھرانے کو چھوڑ کر پہلے کولکاتا اور پھر ممبئی آئے اور اپنی ذات میں ہندوستانی فلمی موسیقی کا ایک اسکول بن کر زندہ رہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور کرکٹ کھلاڑی سچن تینڈولکر کے والد نے ان کے ہی نام پر اپنے بیٹے کا نام سچن رکھا تھا جن کے وہ بے حد شیدائی تھے۔ سچن دیو برمن کی پیدائش 1 اکتوبر 1906 کو کوملا میں ہوئی جو اب بنگلہ دیش میں ہے۔ ان کی والدہ راجکماری نرملا دیوی منی پور کی شہزادی تھیں اور والد نو دیپ چندر برمن تری پورہ کے راجہ تھے۔ لیکن موسیقی کے لیے انھوں نے راج گھرانہ چھوڑ دیا۔ انھوں نے بنگالی فلموں سمیت تقریباً 100 فلموں کے لیے موسیقی دی۔ یہ کلکتہ ریڈیو سے موسیقی کے کیریئر کی شروعات کی اور 1944 میں ممبئی آگئے۔ انھوں نے فلم 'یہودی کی لڑکی' میں پہلی دفعہ گانا گایا۔ بازی ان کی پہلی فلم تھی۔ شبنم، بزدل، کاغذ کے پھول، پیاسا، ایک کے بعد ایک، بات ایک رات کی، ٹیکسی ڈرائیور، فنٹوش، گیمبلر، تلاش، جویل تھیف، تیرے گھر کے سامنے، بے نظیر، آرادھنا، ملی، عشق پر زور نہیں، پریم پجاری، وغیرہ ان کی اہم فلمیں ہیں۔ ان کے بیٹے راہل دیو برمن تھے جنھوں فلمی موسیقی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ ابتدائی دور میں آشا بھونسلے کو فلمی دنیا میں کامیابی دلانے میں ایس ڈی برمن کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ایس ڈی برمن کی وفات 31 اکتوبر 1975 کو ممبئی میں ہوئی۔

سی رام چندر

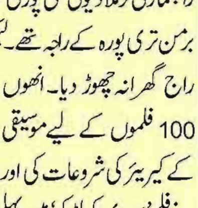

رام چندر نرہر چتلکر، جنھیں ممبئی کی فلمی دنیا انا صاحب کے نام سے اور ساری دنیا سی رام چندر کے نام سے جانتی ہے، وہ عظیم المرتبت موسیقار ہیں جنھوں نے مغربی موسیقی کو اس کے تمام لوازمات اور روایات کے ساتھ ہندوستانی فلموں کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے انا صاحب اور آر این چتلکر کے نام سے بھی فلموں میں موسیقی دی، اور چتلکر کے نام سے 'کتنا حسیں ہے موسم'، 'دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام' اور 'شعلہ جو بھڑکے' جیسے گانے گائے۔ ان کی پیدائش 12 جنوری 1918 کو مہاراشٹر کے شہر احمد نگر میں ہوئی اور 5 جنوری 1982 کو ممبئی میں السر سے موت ہوئی۔ انارکلی،

انھیں فٹ پاتھ پر راتیں گزارنی پڑیں۔ اتنا ہی نہیں فاقے سے بھی دوچار ہونا پڑا لیکن دھن کے پکے تھے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بالآخر دیکھتے دیکھتے مصیبت کے بادل چھٹتے گئے اور منزل جیسے بڑھ کر ان کے استقبال کے لیے تیار ہو۔

موسیقی میں ان کی دلچسپی بارہ بنکی میں واقع حاجی وارث علی شاہ کی درگاہ پر سالانہ عرس میں گائی جانے والی قوالیاں سن کر پیدا ہوئی۔ حاجی بابا کی نگری میں ملک کے معروف قوالوں کی تان اور معروف موسیقاروں کی دھنوں سے نوشاد صاحب نے موسیقی کی بنیادی تعلیم حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس ماحول نے ان کے اندر ایک ایسا

> نوشاد صاحب کی تخلیق کردہ شاہکار موسیقی سے متاثر ہوکر کے آصف نے اپنی بے حد مقبول فلم 'مغل اعظم' میں موسیقی دینے کے لیے انہیں منتخب کیا تو ایسے میں ڈائریکٹر کے آصف کی اس دور اندیشی کی داد دینی ہوگی کہ ایک ایسی تاریخی فلم جس کا تعلق مغل شہنشاہ اکبر اور سلیم سے تھا اس کے لیے نوشاد کا انتخاب کیا کیونکہ مغلیہ عہد کی موسیقی کو ترتیب دینا تو نوشاد صاحب کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی اور پھر ہوا وہی جب فلم ریلیز ہوئی تو چاروں طرف ان ہی کا نظارہ تھا۔

جنون پیدا کیا کہ موصوف نے موسیقار بننے کی ٹھان لی۔

دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا...، نین لڑ جئی ہیں...، موہے پنگھٹ پہ نندلال جیسے ایک سے بڑھ کر ایک سریلے گیت دینے والے موسیقار نوشاد صاحب نے اپنے گیتوں میں موسیقی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

نوشاد صاحب کا تعلق لکھنؤ اسکول آف میوزک سے تھا۔ موسیقی کی تعلیم آپ نے باضابطہ طور پر استاد یوسف علی خاں، استاد ببن خاں، استاد بندے علی خاں اور استاد غربت علی خاں سے حاصل کی۔ شروع کے دنوں میں آپ نے ایک پیانو بجانے والے کی حیثیت سے ملک کے مشہور موسیقار استاد جھنڈے خاں کے یہاں ملازمت کی، کافی دنوں تک جنرل فلم سٹی، رنجیت مووی ٹون اور بنات والا ریکارڈنگ کمپنی سے وابستہ رہے۔ رنجیت فلمز میں ملازمت کے دوران انھیں اس وقت کے معروف میوزک ڈائریکٹر چندر پرکاش کی نگرانی میں اسسٹنٹ میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔

نوشاد صاحب کی صلاحیت کو سب سے پہلے وجے بھٹ نے پہچانا اور انھیں پرکاش پکچرز میں موسیقی دینے کی پیش کش کی۔ ان ہی دنوں ہدایت کار اے آر کاردار نے ممبئی میں اپنی نئی فلم کمپنی کی بنیاد رکھی تھی۔ انھیں اپنی فلم کے لیے ایک مستقل میوزک ڈائریکٹر کی ضرورت تھی، ان کی نگاہ نوشاد صاحب پر پڑی اور انھوں نے اپنی کمپنی کے لیے نوشاد صاحب کا انتخاب کرلیا۔ اے آر کاردار کی بیشتر فلموں میں انھوں نے موسیقی دی جن میں شاردا، جادو، جیون، سنجوگ، قانون، قیمت، گیت، ناٹک، شاہجہاں اور دل لگی اور دلاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان فلموں نے سلور و گولڈن جوبلی منائیں۔ بلاشبہ مذکورہ فلمیں نوشاد صاحب کی بنائی ہوئی دھنوں کے سبب کامیاب ہوئیں۔

ان فلموں کی کامیابی کے بعد فلمی دنیا کے تمام دروازے کھل گئے اور ایک موسیقار کی حیثیت سے آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ کلکتہ کے سنیما ہال پیراڈائز میں پہلی بار جب ان کی فلم 'رتن' دکھائی گئی تو یہ فلم چند ہفتوں میں اتر گئی لیکن یہی فلم کلکتہ کے پیراماؤنٹ ہال میں دوبارہ لگی تو اس کی مقبولیت کے چرچے ان کے گیتوں کے سبب آسمان کی بلندی کو چھونے لگے اور ہر شخص کی زبان پر نوشاد صاحب کی بنائی ہوئی دھنوں سے لبریز گیت سنے جانے لگے۔ اس نے گولڈن جوبلی منائی۔ فلم کی کامیابی کا راز اس کے سحر انگیز نغموں میں پوشیدہ ہے۔ جنھیں آج بھی لوگ گنگناتے ہیں۔ اس فلم کی کامیابی نے نوشاد کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔

نوشاد صاحب کے فن سے متاثر ہوکر ڈائریکٹر محبوب خاں نے انھیں محبوب پروڈکشن میں مستقل میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے شامل کرلیا۔ پھر ایک دور ایسا آیا جب محبوب خاں اور نوشاد کی جوڑی نے ہندوستان میں دھوم مچا دی محبوب خاں نے اپنی بیشتر فلموں جیسے امر، انداز، آن، انمول گھڑی، انوکھی ادا، مدر انڈیا، سن آف انڈیا وغیرہ میں نوشاد کو ہی میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے شامل کیا۔ اس طرح نوشاد نے بھی ان فلموں میں روحانی موسیقی سے جان ڈال دی اور یہ تمام فلمیں یادگار بن گئیں۔ محبوب کے ڈائریکشن اور نوشاد کی موسیقی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھی گئی۔ اگر ان فلموں میں نوشاد کی موسیقی نہ ہوتی تو شاید یہ فلمیں اتنی کامیاب نہ ہوتیں۔

چونکہ نوشاد صاحب نہ صرف موسیقی کے جذبات سے کما حقہ واقف تھے بلکہ فن موسیقی میں نت نئے تجربات کرتے رہتے تھے۔ نتیجے کے طور پر طرز اور موسیقی میں وہ

البیلا، آزاد، یاسمین، سگائی، شہنائی، پتنگ، زبان، پیغام، نورنگ وغیرہ ان کی خاص فلمیں ہیں۔ وہ امریکی جاز موسیقار بینی گڈ مین کے شیدائی تھے اور مغربی دھنوں کو ہندوستانی انداز میں ترتیب دینے کا رواج انھوں نے ہی شروع کیا۔ لیکن کلاسیکی موسیقی کی بھی انھیں گہری جانکاری تھی۔ انھوں نے فلم انارکلی کے ایک درجن گانوں کی دھنیں صرف ایک مہینے میں تیار کرلی تھیں۔ حب الوطنی کا مشہور گانا 'اے میرے وطن کے لوگو، ذرا آنکھ میں بھر لو پانی' ان ہی کا کمپوز کیا ہوا ہے۔

ہیمنت کمار

کانوں میں رس گھولنے والی میٹھی میٹھی، سیدھی سادی، اور گنگنانے میں آسان دھنیں بنانے میں مہارت رکھنے والے موسیقار بہترین گلوکار ہیمنت کمار کی پیدائش 6 جون 1920 کو وارانسی (بنارس) میں ہوئی تھی۔ ان کا پورا نام ہیمنت کمار مکھوپادھیائے تھا۔ انھوں نے 1933 میں آل انڈیا ریڈیو سے اپنے کیریئر کی شروعات کی۔ 1941 میں بنگالی فلم نیمئے سنیاس سے انھوں نے فلموں میں گانا شروع کیا۔ پہلی دفعہ ہندی میں فلم ارادہ کے لیے گانا گایا۔ آنند مٹھ ان کی پہلی ہندی فلم تھی لیکن موسیقار کے طور پر ملک گیر شہرت انھیں فلم ناگن سے حاصل ہوئی۔ اس کے تمام گیتوں کی دھنیں خود بنائیں لیکن فلم میں بین کی جو دھن ان کے اسسٹنٹ موسیقار روی نے بنائی تھی اور اسے بجایا تھا۔ کلیان جی ویر جی شاہ نے۔ بطور موسیقار شرط، صاحب بیوی اور غلام، بیس سال بعد، کہرا، دودل، راہگیر، بیوی اور مکان، دو دونی چار، بن بادل برسات ان کی خاص فلمیں ہیں۔ آب حیات، جال، ہاؤس نمبر 44، پیاسا، مہندی، سٹہ بازار، کابلی والا، بادشاہ، سولہواں سال، وغیرہ فلموں میں ان کے گائے ہوئے گانے بہت مقبول ہوئے۔ انھوں نے خود بھی فلمیں بنائیں جن میں بیس سال بعد، کہرا، بیوی اور مکان خاص ہیں۔ 26 ستمبر 1989 کو کولکاتا میں ان کا انتقال ہوا۔ رانو مکرجی ان کی بیٹی ہیں جنھوں بہت چھوٹی عمر میں ان ہی کی ہدایت میں فلم 'معصوم' کے لیے 'نانی تیری مورنی کو مور لے گئے' والا مشہور گیت گایا تھا۔

شنکر جے کشن

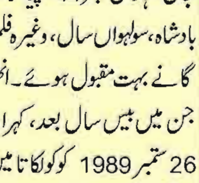

حسن لال بھگت رام کے بعد فلمی موسیقی کا رنگ ڈھنگ بدلنے والی ہندوستانی سنیما کی سب سے مقبول موسیقار

جدت پیدا کی جس کے زیر اثر ہلکے پھلکے گیت بھی عوامی توجہ کا مرکز بن گئے۔ مثلاً اتر پردیش کی فوک دھنوں کو کلاسیکی موسیقی کے مزاج سے ہم آہنگ کر کے 'چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا' جس طرح پیش کیا ہے اس کی مثال او پی نیر کے علاوہ شاید ہی کہیں ملے جنھوں نے پنجاب کی خوشبو کو اپنے نغموں میں بسا کر ہندوستانی موسیقی کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ حالانکہ انل بسواس، سلیل چودھری اور ایس ڈی برمن کے بنگلہ لوک دھنوں پر مبنی نغمے آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں لیکن نوشاد کے یہاں گنگا جمنا کا دیسی پن فلم کی موسیقی اور نغموں کی دھنیں مشرقی اتر پردیش کے لوک سنگیت کی بہترین مثال ہے۔ ان کے علاوہ میں جو جانت، ہمارے دل سے نہ جانا، موہے پنگھٹ پہ نند لال، نگری نگری دوارے دوارے، بالم تیرے پیار کی ٹھنڈی اور اجھوں نہ آئے بالما ایسے بیشمار گیت جو اپنی طرز کے اعتبار سے اتر پردیش کی علاقائی دھنوں کا نشان امتیاز ہیں نوشاد نے اپنی فن کاری سے زندہ جاوید کر دیا ہے۔

نوشاد صاحب کی تخلیق کردہ شاہکار موسیقی سے متاثر ہو کر کے آصف نے اپنی بے حد مقبول فلم 'مغل اعظم' میں موسیقی دینے کے لیے انھیں منتخب کیا تو ایسے میں ڈائریکٹر کے آصف کی اس دور اندیشی کی داد دینی ہوگی کہ ایک ایسی تاریخی فلم جس کا تعلق مغل شہنشاہ اکبر اور سلیم سے تھا اس کے لیے نوشاد کا انتخاب کیا کیونکہ مغلیہ عہد کی موسیقی کو ترتیب دینا تو نوشاد صاحب کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی اور پھر ہوا وہی جب فلم ریلیز ہوئی تو چاروں طرف ان ہی کا نظارہ تھا۔ دنیا نے دیکھا کہ نوشاد صاحب نے اس فلم کے لیے جو دھنیں تیار کی اور بیک گراؤنڈ موسیقی دی وہ اپنے آپ میں مثال ہے۔ فلم دیکھنے والے جب مغلیہ دربار میں تان سین کے راگ کو یا موہے پنگھٹ پہ نند لال چھوڑ گئیو رے یا پھر پیار کیا تو ڈرنا کیا جیسے پرکیف مناظر کو دیکھتے اور سنتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے خود کو مغلیہ دور کے دربار میں پاتے ہیں دوسرے ڈائریکٹر کے آصف بھی قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے ان حسین مناظر کو اس خوبصورتی سے پیش کیا جیسے سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔

فلم 'مغل اعظم' ہر اعتبار سے ایک شاہکار فلم ہے اور اس کا کوئی بھی کردار ایسا نہیں جسے ہم نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائیں خاص طور سے اکبر اعظم کے کردار کو پرتھوی راج کپور نے بڑی خوبصورتی سے ادا کر کے لافانی بنا دیا جب کہ فلم کے ڈائیلاگ رائٹر وجاہت مرزا، کمال امروہی، امان اللہ خاں امان اور احسن رضوی نے اپنے مکالموں کے ذریعے فلم کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ فلم کی تاریخ میں ایسے مکالمے اب تک تخلیق نہیں کیے جا سکے۔ اسی طرح موسیقار نوشاد صاحب نے اپنی دلفریب اور سحر انگیز موسیقی سے فلم کو امر بنا دیا ہے۔

محمد رفیع، نوشاد کی تال پر سُر ملاتے ہوئے

نوشاد صاحب کا ذکر ہو اور بیجو باورا کی بات نہ ہو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہتے ہیں کہ نامور فلم ساز وجے بھٹ نے جب پرکاش پکچرز کے بینر تلے اپنی شاہکار فلم بیجو باورا بنانے کا ارادہ کیا تو ان کی نگاہ انتخاب موسیقار نوشاد پر ہی جا کر ٹکی کیونکہ ان کی نگاہ میں ہندوستانی اور کلاسیکی موسیقی دینے والا فلمی دنیا میں کوئی دوسرا موسیقار موجود نہیں تھا جو پورے اعتماد کے ساتھ یہ ذمے داری نبھا سکے جب فلم کے تمام گانے مکمل ہو گئے اور فلم ریلیز ہوگئی تو بیجو باورا کے گیت نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے موسیقی میں تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ یہ فلم موسیقی کے اعتبار سے نوشاد صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کا عظیم شاہکار ہے۔ کہتے ہیں کہ اس فلم کی کلاسیکی دھنوں کو ترتیب دینے کے لیے نوشاد نے ملک کے ماہر کلاسیکی گلوکاروں کی خدمات بھی حاصل کیں جن میں استاد ڈی جی پلسکر، پنڈت اوم کارناتھ اور استاد امیر خاں نے ان کی موسیقی میں اپنے فن کا بے پناہ مظاہرہ کیا۔ اس فلم کے تقریباً بیشتر گانے آج بھی بے حد مقبول ہیں۔ اس فلم میں نوشاد صاحب نے محمد رفیع سے ایک بھجن 'من تڑپت ہری درشن کو آج' اور 'او دنیا کے رکھوالے سن درد بھرے میرے نالے' جیسے گیت گوا کر محمد رفیع کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ فلم کے بھجن کو سننے کے بعد چند لمحوں کے لیے انسان کے دل میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا

جوڑی شنکر سنگھ رگھوونشی اور جے کشن دیا بھائی پنچال کی جوڑی تھی۔ شنکر کی پیدائش 15 اکتوبر 1922 کو پنجاب میں ہوئی اور 26 اپریل 1987 کو ممبئی میں انتقال کیا۔ جے کشن 4 نومبر 1927 کو ونسدا، گجرات میں پیدا ہوئے اور صرف چوالیس برس کی عمر میں 12 ستمبر 1971 کو وفات پا گئے۔ شنکر اور جے کشن راج کپور کی پہلی فلم 'آگ' کے موسیقار رام گانگولی کے اسسٹنٹ تھے جن کے ساتھ دوسری فلم 'برسات' میں راج کپور کے شدید اختلافات ہو گئے اور انھوں نے شنکر سے موسیقی دینے کو کہا۔ شنکر نے راج کپور سے جے کشن کو اپنا پارٹنر بنانے کی خواہش ظاہر کی اور اس طرح یہ عظیم جوڑی وجود میں آئی۔ شنکر جے کشن کی اہم فلموں میں آوارہ، شری 420، چوری چوری، بوٹ پالش، سنگم، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، میرا نام جوکر، میرے حضور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شنکر جے کشن کو مشترکہ طور پر پدم شری کا اعزاز دیا گیا۔ 9 دفعہ انھوں نے فلم فیئر ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

مدن موہن

کلاسیکی موسیقی کی بہت گہری جانکاری نہ ہونے کے باوجود بہترین کلاسیکی دھنیں ترتیب دینے والے مدن موہن کا پہلا پیار موسیقی تھا، جس کی خاطر انھوں نے فوج بھی چھوڑ دی، اور فلمی دنیا میں خاص طور سے غزلوں کی بندش میں انھوں خاص نقوش چھوڑے۔ مدن موہن کی پیدائش 25 جون 1924 کو عراق میں کردستان کے علاقہ عربیل میں ہوئی جہاں ان کے والد رائے بہادر چونی لال کوہلی مقامی پولیس میں اکاؤنٹینٹ جنرل تھے۔ اس طرح ان کا پورا نام مدن موہن کوہلی تھا۔ بچپن سے ہی گراموفون ریکارڈوں پر گانے سننے کے شوقین تھے۔ ہندوستان واپسی کے بعد ممبئی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد فوج میں شمولیت اختیار کی لیکن چند سال بعد ہی فوج سے مستعفی ہو کر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کر لی جہاں استاد فیاض احمد خاں، استاد علی اکبر خاں، بیگم اختر اور طلعت محمود جیسے موسیقی کے بڑے لوگوں سے واقفیت ہوگئی۔ وہاں سے ممبئی واپسی کے بعد وہ سچن دیو برمن کے اسسٹنٹ بن گئے اور کچھ عرصے بعد آنکھیں اور ادا جیسی فلموں سے انھوں نے آزادانہ طور پر میوزک ڈائریکٹر کا کام کیا۔ لتا، طلعت محمود اور رفیع کی آوازوں کا استعمال کرتے ہوئے انھوں نے متعدد پر اثر نغمے فلم بینوں کو دیے۔ 14 جولائی 1975 کو اپنی وفات کے وقت بھی وہ تقریباً ڈھائی سو دھنیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے جن میں سے

ہو جاتی ہے۔ دانشوران موسیقی کی نگاہ میں اور دنیائے فلم میں اس بھجن کو اولیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس شاہکار بھجن کو فلمی دنیا کے تین عظیم مسلم فنکاروں نے خون جگر دیا۔ لکھا شکیل بدایونی نے، محمد رفیع نے اپنی درد بھری آواز سے سحر پیدا کیا اور نوشاد صاحب نے موسیقی سے سجایا:

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

نوشاد صاحب کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے مروجہ روایت سے انحراف کرتے ہوئے سازوں کی تعداد پر خصوصی توجہ دی بسا اوقات محض دو ایک ساز کے استعمال سے ہی نغموں میں زندگی کی لہر دوڑا دی اور جہاں سازوں کی مختلف اقسام کو یکجا کرنے کی ضرورت ہوئی انھوں نے بیک گراؤنڈ ہو یا پلے بیک ہر دو موسیقی کے لیے حسب ضرورت سازوں کا استعمال کیا، میرے محبوب تجھے میری محبت کی قسم (میرے محبوب)، سہانی رات ڈھل چکی (دلاری)، کوئی ساغر دل کو بہلاتا نہیں (دل دیا درد لیا) کے برعکس جواں ہے محبت (انمول گھڑی)، ترے صدقے بلم نہ کر کوئی غم (امر)، تیرے پیار میں دلدار (میرے محبوب)، دکھ بھرے دن بیتے رے بھیا (مدر انڈیا)، پیار کیا تو ڈرنا کیا (مغل اعظم)، ملتے ہی آنکھیں دل ہوا دیوانہ (بابل)، ایسے نغموں میں مختلف سازوں کا استعمال بطرز دیگر فنی اسلوب کا موجب ہوا ہے۔ اسی طرح زندہ باد اے محبت زندہ باد (مغل اعظم) میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کم و بیش سو کورس گلوکاروں کو شامل کیا لیکن اتنی خوبصورت موسیقی اور اتنے بے مثالی سدا بہار نغموں کے باوجود اس سال کا فلم فیئر ایوارڈ 'ٹیکسی ڈرائیور' کو دیا گیا جب کہ یہ حقیقت بھی ہے کہ نوشاد 75 فلمیں نہ دے کر صرف دو فلمیں 'بیجو باورا' اور 'مغل اعظم' دے جاتے تو بھی ان کی عظمت میں چار چاند لگا رہتا کیونکہ فن موسیقی میں ان کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔

نوشاد صاحب کی سرپرستی میں نہ جانے کتنے موسیقاروں، نغمہ نگاروں اور گلوکاروں کو پرموٹ کیا۔ ان کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی کی لیکن آنکھوں میں کبھی تکبر و غرور کی چمک نہیں آئی۔

گلوکارہ ثریا کو شاردا (1942) میں بریک دیا اور انمول گھڑی (1946)، درد (1947) اور دل لگی (1949) کے ذریعے جاوداں کیا۔ محمد رفیع کو (1942) کی فلم پہلے آپ کے ذریعے متعارف کیا لیکن اٹھان ہوئی فلم میلہ (1948) سے۔ میلہ کے نغموں نے ہندوستانی عوام پر دیرپا اثرات مرتب کیے اور محمد رفیع اپنی خوبصورت اور ہمہ جہت آواز کے ساتھ عوام کے ذہن و دل کا حصہ بن گئے۔

اسی طرح لتا منگیشکر کو چاندنی رات (1949) میں پیش کیا اور دلاری اور انداز (1949) اور جادو (1951) سے ان کی آواز کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ گو کہ چوتھی دہائی کا یہ زمانہ سہگل اور نور جہاں، شیام مستانہ اور سریندر کا زمانہ تھا اور زہرہ بائی امبالے والی اور راج کماری کا دور تھا اور ان کے رہتے اپنی شخصیت کو ابھارنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا اور اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہوگا کہ محمد رفیع اور لتا منگیشکر کو ان کے ہم پلہ بنانے بلکہ بام عروج تک پہنچانے میں نوشاد صاحب کا کردار سب سے اہم رہا ہے، بلکہ میرا استدلال تو یہ ہے کہ ان کی آوازوں کے صحیح اور بھرپور استعمال کی ابتدا نوشاد نے کی ہے۔ آگے چل کر شنکر جے کشن، ایس ڈی برمن، مدن موہن روشن، این دتا، رولی، اوشا کھنہ اور لکشمی کانت پیارے لال نے ان آوازوں سے استفادہ کیا لیکن جس طرح او پی نیر کا تصور محمد رفیع اور آشا بھونسلے کے بغیر نہیں ہو سکتا اسی طرح محمد رفیع اور لتا منگیشکر کا تصور نوشاد کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ اوما دیوی اور مہندر کپور بھی نوشاد کی ہی دریافت ہیں۔

اوما دیوی، افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا (درد 1947)، کے ساتھ ابھریں اور سپرہٹ ہوگئیں۔ اس ضمن میں نوشاد صاحب کا کنٹری بیوشن بھی غیر معمولی ہے کہ اوما دیوی کو ٹن ٹن بنا کر بطور اداکارہ فلموں کا حصہ بنانے کا سہرا بھی نوشاد کے ہی سر ہے۔ مہندر کپور کو رات غضب کی آئی (سوہنی مہیوال) (1958) کے ذریعے روشناس کیا۔ نوشاد صاحب آواز کے زیر و بم کے بہتر استعمال کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ 'بیجو باورا' کے مثالی

کچھ چند برس قبل یش چوپڑا کی فلم 'ویر زارا' میں استعمال ہوئیں۔ انھیں 1971 میں بہترین موسیقار کا نیشنل فلم ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ ان کی اہم فلموں میں، ان پڑھ، ہیر رانجھا، حقیقت، دلہن ایک رات کی، وہ کون تھی وغیرہ ہیں۔

خیام

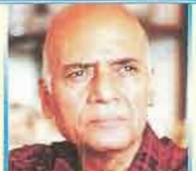

موسیقی میں پنجابیت کے ساتھ نزاکت اور رمزیت کی آمیزش سے فلم شائقین کا دل موہ لینے والے خیام نے ہندوستانی سینما کو بہت کم فلمیں دیں لیکن ان کے مقبول گیتوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ ان کا اصل نام محمد ظہور ہاشمی ہے۔ ان کی پیدائش 18 فروری 1927 کو ضلع نواں شہر پنجاب (پاکستان) کے گاؤں راہون میں ہوئی۔ والد سعادت حسین نے انھیں تعلیم دلانا چاہا لیکن ان کا پڑھائی میں جی نہیں لگتا تھا اور بچپن سے فلمی موسیقی کے شیدائی تھے۔ ممبئی آکر 1953 میں دلیپ کمار کی فلم فٹ پاتھ سے اپنا کیریئر شروع کیا لیکن مقبولیت راج کپور کی فلم 'پھر صبح ہوگی' سے ملی۔ انھیں پدم بھوشن سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ سے فلم فیئر ایوارڈ وغیرہ مل چکے ہیں۔ ان کی دیگر اہم فلموں میں شگون، آخری خط، کبھی کبھی، امراؤ جان، ترشول، شعلہ اور شبنم، بازار، نوری شامل ہیں۔

کلیان جی آنند جی

کلیان جی آنند جی کی موسیقار جوڑی بھی ہندوستانی سینما کی مقبول جوڑیوں میں سے ایک رہی ہے۔ کلیان جی (پیدائش 30 جون 1928) کا پورا نام کلیان جی ویر جی شاہ تھا اور انھوں نے اکیلے ہی فلم سمراٹ چندر گپت سے اپنا کیریئر اسی نام سے شروع کیا تھا۔ پوسٹ باکس 999 میں چھوٹے بھائی آنند جی ویر جی شاہ (پیدائش 2 مارچ 1933) ان کے اسسٹنٹ تھے، جس کے بعد فلم 'ستہ بازار' سے دونوں نے کلیان جی آنند جی کے نام سے موسیقی دینا شروع کیا۔ چھلیا، جوہر محمود ان گوآ، جب جب پھول کھلے، محل، ڈان، بیراگ، قربانی، سفر، لاوارث، زنجیر وغیرہ ان کی مشہور فلمیں ہیں۔ انھیں 1975 میں کورا کاغذ کے لیے بہترین موسیقار کا فلم فیئر ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے۔ انھیں پدم شری، آئیفا ایوارڈ، میوزک ڈائریکٹرز ایوارڈ بھی دیے جا چکے ہیں۔ کلیان جی کا 3 نومبر 2000 کو ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ آنند جی ابھی حیات ہیں اور میوزک ڈائریکشن میں اب ان کی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

گیت آج بھی موسیقاروں کے لیے مشعل ہدایت ہیں۔ اس فلم میں محمد رفیع کی آواز کی رینج کو انھوں نے پوری طرح ابھارا اور اس بلند مقام تک لے گئے جو اچھے اچھوں کی پہنچ سے باہر تھا اور آج بھی ہے۔

دراصل نوشاد صاحب کا اخلاق اور دلوں میں گھر کر جانے کی ان کی غیر معمولی صلاحیت ان کے کردار کے اہم عناصر تھے۔ خوش گفتاری ان کی شخصیت کا جزو اور جذبہ ہمدردی اصول زندگی، انھیں خصوصیات کی بدولت غلام علی خاں کو وہ راضی کر سکے اور پریم جوگن بن کے (مغل اعظم 1960) صدا بند ہوا اسی طرح استاد امیر خاں اور پنڈت ڈی وی پلسکر کی آوازیں بیجو باورا کی زینت بنیں۔ مجروح اور نوشاد صاحب کا ساتھ صرف تین فلموں (شاہ جہاں 1945)، انداز (1949) اور ساتھی (1968) میں ہی رہا لیکن یہ تینوں فلمیں اپنی بے مثل موسیقی اور فکر انگیز نغموں کی بدولت آج بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ لہٰذا میرا استدلال ہے کہ نوشاد وہ سرچشمہ ہیں جن کے ذریعے شائقین و سامعین اپنی تشنہ کامیوں کا مداوا ڈھونڈ تے ہیں، اپنی روحانی پیاس بجھاتے ہیں کیونکہ ان کے صدا بند کیے گئے نغمے آج بھی جذبہ و احساس کو چھو کر گزرتے ہیں تو ذہن و دل میں زندگی کی لہر دوڑا دیتے ہیں۔

نوشاد صاحب سے فیض یاب ہونے والے اور ان کی بدولت پروان چڑھنے والے فن کاروں میں صرف گلوکار اور نغمہ نگار نہیں ہیں موسیقار بھی ہیں جن میں پیارے لال (لکشمی کانت) اور اتم سنگھ اہم ہیں۔

پیارے لال اور نوشاد صاحب کا رشتہ محض ایک شاگرد اور استاذ کا نہیں تھا بلکہ وہ نوشاد صاحب کے شریک کار بھی تھے۔ انھوں نے اپنی موسیقی کا آغاز نوشاد صاحب کے آرکسٹرا میں ایک سازندے کے بطور کی اتم کی ایک وائلنسٹ کی حیثیت سے نوشاد صاحب سے وابستہ ہوئے، موسیقی کے گر سیکھے اور آداب موسیقی سے بہرہ ور ہوئے۔ اس ضمن میں شمشاد بیگم کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ شمشاد کے گائے ہوئے بہترین نغموں کی فہرست نوشاد صاحب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ شمشاد لاہور کی نامور گلوکارہ تھیں۔ ممبئی آئیں تو نوشاد صاحب سے وابستہ ہوئیں۔ شریف الطبع خاتون تھیں اور مشرقی تہذیبی اقدار کی پاسدار۔ ہر چند کہ لتا منگیشکر جیسا نسائی پن ان کی آواز میں قدرے کم تھا لیکن زبان کا حسن آواز کا حصہ بن گیا۔ ان کی آواز کا رینج معاصر اور مابعد مغنیوں کی آوازوں سے کہیں بلند اور بہتر تھا۔ لہٰذا ان کے گائے ہوئے نغمے اپنی تہہ داریوں کے سبب آج بھی دلوں کی دھڑکن ہیں۔ نوشاد صاحب سچے فن کار کے پارکھی اور مہارتی تھے لہٰذا ان کی آواز کا بھی صحیح اور مکمل استعمال نوشاد صاحب کے سوا کسی نے نہیں کیا۔ موسیقار غلام محمد بجائے خود عظیم موسیقار تھے لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ بھی نوشاد صاحب کے ہی تربیت یافتہ تھے۔ آگے چل کر بطور معاون نوشاد صاحب کے شریک کار بھی رہے۔ مشہور زمانہ فلم 'پاکیزہ' کے نغمے انھیں کے کمپوز کیے ہوئے ہیں۔ ایسی کتنی شخصیتیں ہیں جو اس اسکول سے وابستہ رہی ہیں اور تربیت پا کر قبول عام ہوئیں اور عظمت و شہرت کے اعلیٰ مقام تک پہنچیں۔

لتا منگیشکر، نوشاد کی نئی دھن کو ذہن نشیں کرتے ہوئے

بلاشبہ نوشاد صاحب کو نہ صرف سازوں پر پورا عبور حاصل تھا بلکہ ساتوں سر ان کے سامنے گویا ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے لیکن یہ جوہر بھی بغیر ریاضت و عبادت کے نہیں کھلتے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ موسیقی نوشاد صاحب کی شریعت میں عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ کے ایل سہگل کو نشہ کے بغیر گانے پر آمادہ کرنا اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ کوئی نغمہ ہو سہگل بغیر شراب کے صدا بند کرنے پر راضی نہیں ہوتے تھے یہ ان کی خام خیالی تھی کہ نشہ کے بغیر نغمگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور نوشاد صاحب کا استدلال تھا کہ اس سے نغمہ سرائی کیا ڈھنگ کا کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا اور انھوں نے ہر دو حالت میں ریکارڈنگ کر کے پیش کیا۔ یہ دلیل

لکشمی کانت پیارے لال

ہندوستانی سنیما کو سب سے زیادہ فلمیں دینے والی موسیقار جوڑی لکشمی کانت پیارے لال کی تھی۔ اس جوڑی کے سینئر رکن لکشمی کانت شانتا رام کوڈالکر کی پیدائش 3 نومبر 1937 کو ہوئی۔ پیارے لال رام پرساد شرما 3 ستمبر 1940 کو گورکھپور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ لکشمی اور پیارے دونوں کا بچپن بہت غربت میں گزرا۔ پیارے لال نے صرف 11 برس کی عمر میں موسیقار نوشاد کے آرکسٹرا میں ساز بجانا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے لکشمی کانت نے (جب وہ دس برس کے تھے) ایک روز ریڈیو کلب کولابہ میں لتا منگیشکر کے کنسرٹ میں مینڈولن بجایا جس سے لتا بہت متاثر ہوئیں۔ لکشمی کانت اور پیارے لال کی ملاقات سریل کلا کیندر میں ہوئی اور زندگی بھر کے لیے وہ دوست بن گئے۔ دونوں نے کچھ عرصہ تک کلیان جی آنند جی کے اسسٹنٹ بھی رہے۔ ہم تم اور وہ ان کی پہلی فلم تھی جو مکمل نہیں ہو سکی۔ پھر ہریش چندر تارامتی آئی لیکن شہرت انھیں پارس منی سے ملی جس کے گانوں نے ہر طرف دھوم مچا دی۔ فلم دوستی کے گیتوں نے انھیں پہلا قومی ایوارڈ دلایا۔ اس کے بعد آیا طوفان، ملن، شاگرد، دوراستے، نام، تیزاب، رام لکھن، کھلونا، امر اکبر انتھونی، سہاگ، جیسی بے شمار فلموں نے ہندوستانی سنیما کی سب سے کامیاب موسیقار جوڑی بنا دیا اور انھوں نے متعدد فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیے۔ لکشمی کانت نے 25 مئی 1998 کو ممبئی میں وفات پائی اور یہ جوڑی ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔

راہل دیو برمن

جس شخص نے تن تنہا ہندوستانی فلمی موسیقی کا رواج اور مزاج بہت مختصر عرصے میں بدل کر رکھ دیا اس کا نام راہل دیو برمن ہے، جسے اس کے چاہنے والے پنچم دا کے نام سے اور دنیا بھر کے لوگ 'آرڈی' کے مخفف سے یاد رکھتے ہیں۔ ان کے والد سچن دیو برمن تھے۔ ان کی پیدائش 27 جون 1939 کو کولکاتا میں ہوئی۔ انھوں نے آشا بھونسلے سے 1980 میں دوسری شادی کی تھی۔ انھیں بہترین میوزک ڈائرکٹر کے علاوہ تین دفعہ فلم فیئرس ایوارڈس بھی دیے گئے ہیں۔ پنچم نے علی اکبر خاں اور سمتا پرساد سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ 'چلتی کا نام گاڑی'، 'کاغذ کے پھول'،

سہگل کی شرمساری کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ نشہ کے بغیر ان کا واحد نغمہ جب دل ہی ٹوٹ گیا (شاہجہاں، مجروح)، صدا بند ہوا، یہ نغمہ آج بھی اتنا ہی دلکش اور روح پرور ہے جتنا (1945) میں تھا۔ سہگل اسے اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے شاید اسی لیے ان کی وصیت کے مطابق یہ نغمہ ان کی ارتھی کے ساتھ بھی بجایا گیا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ نوشاد صاحب مشرقی تہذیبی اقدار کے پاسدار اور فن شاعری و موسیقی کے کلاسیکی رنگ و آہنگ کے دلدادہ تھے۔ اسی لیے نغمہ نگاری کے لیے بھی انھوں نے ایسے شعرائے کرام کا انتخاب کیا جو کلاسیکی شاعری خصوصاً غزلیہ شاعری میں درک رکھتے تھے۔ تنویر نقوی، خمار بارہ بنکوی، عزم بازید پوری، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، اور راجندر کرشن ایسے شعرا تھے جنھوں نے نوشاد صاحب کی دھنوں پر لفظوں کے ذریعے نغمگی بکھیری۔ البتہ اپنی موسیقی کے آخری ایام میں انھوں نے حبہ خاتون کے لیے علی سردار جعفری سے نغمے لکھوائے ''جس رات کے خواب آئے ان خوابوں کی رات آئی' راگ مدھومتی پر مبنی یہ نغمہ محمد رفیع کی آواز میں ریکارڈ ہوا اس فہرست میں ڈی این مدھوک کا نام سرفہرست آئے گا کیونکہ نوشاد صاحب کے ابتدائی ایام میں مدھوک نے نہ صرف ان کی Tunes (دھن/طرز) کو سراہا بلکہ ان کے ہارمونیم کی مشق پر اپنی مثبت رائے بھی دی۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر انھوں نے نوشاد کو فلم پریم نگر (نوشاد صاحب کی اولین فلم) کے کنٹریکٹ دلانے میں مدد دی۔ دوسرے یہ کہ نغمہ نگاری کی فہرست میں مدھوک سرفہرست تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ان دنوں انھیں کا سکہ چلتا تھا (یہ وہی مدھوک ہیں جنھوں نے ساحر لدھیانوی کو ادبی تخلیق کے بجائے چیک بک دکھائی تھی اور اپنا بینک بیلنس بتایا تھا) تیسرے یہ کہ نوشاد کے اولین نغمہ نگاروں میں مدھوک کا کنٹری بیوشن سب سے زیادہ تھا۔ نوشاد صاحب کی اٹھان شہرہ آفاق فلم 'رتن' سے ہوئی اور رتن کے نغمے مدھوک کے فکر و خیال کا حصہ تھے یا پھر لفظوں کی ترتیب کا افسانہ، جو بھی ہو لیکن نوشاد صاحب کی دھنوں نے دھوم ضرور مچا دی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے فن کی خوبیاں خصوصاً فوک اور کلاسیکی موسیقی کے امتزاج سے ایک نیا اسلوب قائم کرنے اور خالص کلاسیکی دھنوں کو عوام پسند بنانے میں نکھری ہیں۔ اس لحاظ سے بھی وہ فلمی موسیقی میں یگانہ و یکتا قرار دیے جائیں گے۔ نوشاد صاحب کا کمال یہ بھی ہے کہ ان کی بیشتر فلموں کی موسیقی خواہ پلے بیک ہو یا بیک گراؤنڈ نہ صرف موسیقی کے فنی نکات سے ہموار رہی اور اپنی خصوصیات کے سبب عوامی محسوسات کا حصہ بھی بن گئی۔ بلکہ رتن (1944) سے سنگھرش (1968) کے سفر میں نوشاد صاحب کی حیثیت میر کارواں کی رہی ہے۔

رتن، انمول گھڑی، شاہ جہاں، دار، میلہ، دلاری، انداز، دل لگی، بابل، شباب، بیجو باورا، امر، اڑن کھٹولہ، مدر انڈیا، مغل اعظم، کوہ نور، گنگا جمنا، سن آف انڈیا، میرے محبوب، لیڈر، پالکی، دل دیا درد لیا، ساز اور آواز، رام اور شیام، آدمی، سنگھرش اور پاکیزہ کی موسیقی کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔

نوشاد صاحب کے اعلیٰ فن کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ وہ نہ صرف فلم انڈسٹری کا عظیم ترین سرمایہ ہیں بلکہ ہر عہد میں مشعل ہدایت بننے والے تنہا موسیقار ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ موسیقار اعظم کے تنہا حق دار ہیں۔

حکومت ہند نے نوشاد صاحب کے عظیم کارناموں اور لازوال فنی خدمات سے متاثر ہو کر پدم شری، پدم بھوشن، اور دادا صاحب پھالکے ایوارڈ کے علاوہ بہت سارے بلند پایہ اور پروقار اعزازات سے نوازکر ان کے فن اور موسیقی کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے نام سے لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں نوشاد سنگیت اکادمیاں بھی قائم ہوئیں ایسی شہرت اور مقبولیت ہندوستانی فلم انڈسٹری کی بہت کم شخصیتوں کو نصیب ہوئی ہے۔

گزشتہ 65 سال سے ہندوستانی فلمی صنعت پر حکومت کرنے والے نوشاد صاحب کے زمانے میں کتنے ہی موسیقار آئے اور چلے گئے لیکن نوشاد صاحب بے مثال فنی صلاحیتوں کے سہارے آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ نوشاد صاحب ایک اچھے اور عظیم موسیقار ہی نہیں بلکہ اچھے کہانی کار اور بلند پائے کے شاعر بھی تھے۔ آپ کا ایک شعری مجموعہ 'آٹھواں سر' کے نام سے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے — فلم شباب، اڑن کھٹولہ، میلہ، بابل، دیدار، پالکی اور ساز اور آواز جیسی فلموں کی کہانیاں ان کے ہی زور قلم کا نتیجہ ہیں لیکن نوشاد صاحب ایک کہانی کار و نغمہ نگار کی بہ نسبت اپنی سحر انگیز موسیقی کی بدولت شہنشاہ موسیقی کہلاتے ہیں۔

■

Dr. Mohd Nisar,602-D/8, Ward No-3, Rose Apartment D-1, Mehrauli, New Delhi - 110030

'تیرے گھر کے سامنے'، 'گائیڈ'، 'بندنی' میں انھوں اپنے والد کے میوزک اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا تھا۔ اس دوران مشہور کامیڈین محمود نے اپنی پہلی فلم چھوٹے نواب میں اور پھر بھوت بنگلہ میں انھیں آزادانہ طور پر موسیقی دینے کا موقع دیا تھا اور ان فلموں کے گانے کافی پسند بھی کیے گئے تھے۔ ناصر حسین کی فلم تیسری منزل، میں بطور موسیقار اپنا جدید، بلکہ مابعد جدید اسٹائل تبدیل کیے بغیر انھوں نے بالآخر اپنے فن کا لوہا منوالیا۔ اس کے بعد آر ڈی برمن نے لگاتار بہترین اور دلکش موسیقی دی۔ اُن کی اہم فلموں میں بہاروں کے سپنے، کارواں، یادوں کی بارات، ہم کسی سے کم نہیں، پڑوسن، بامبے ٹو گوا، شعلے، لو اسٹوری، شان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وہ اپنے وقت سے آگے کے موسیقار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 4 جنوری 1994 کو صرف 55 سال کی عمر میں انتقال کے بعد آج تقریباً بیس برس بعد بھی ان کا سنگیت آج کا ہی سنگیت معلوم ہوتا ہے۔

اے آر رحمن

ہندوستانی سینما کی موسیقی کو آسکر ایوارڈ کی بلندی تک لے جانے والے اللہ رکھا رحمٰن کا اصل نام اے ایس دلیپ کمار تھا۔ وہ 6 جنوری 1967 کو چنئی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آر کے شیکھر تمل فلموں کے میوزک کمپوزر تھے۔ لیکن جب وہ 9 سال کے تھے تو والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کریما نے جن کا پیدائشی نام کستوری تھا بڑی مصیبتوں سے ان کی پرورش کی اور پھر ایک دن وہ بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میوزک ڈائریکٹر بن گئے۔ انھیں گریمی ایوارڈ، اکادمی ایوارڈ، بافٹا ایوارڈ، گولڈن گلوب، 4 نیشنل فلم ایوارڈ اور 15 فلم فیئر ایوارڈ دیے جا چکے ہیں۔ تمل ناڈو کے نومسلم خاندان میں پیدا ہونے والے اے آر رحمٰن نے اپنی منفرد آواز موسیقی سے پوری دنیا میں اپنا ایک اہم مقام حاصل کیا ہے، روجا فلم سے شروعات کرنے والے رحمٰن نے دل سے، رنگیلا، تال، سودیس، رنگ دے بسنتی، گرو، جودھا اکبر، جیسی فلموں میں موسیقی دی۔ انھوں نے ہالی ووڈ کی فلم لارڈز آف دی رنگز، کا میوزک بھی دیا۔ کلاسیکی موسیقی اور مغربی موسیقی کے دلکش اور خوبصورت امتزاج سے رحمٰن نے ایسی شیریں دھنیں اپنی فلموں میں پیش کی ہیں کہ پوری دنیا ان کی دیوانی ہو گئی۔ آرکسٹرا کی انھیں خاص مہارت حاصل ہے اور صوفی سنگیت میں بھی ان کی گہری دل چسپی ہے۔

اس مضمون کے ساتھ دیے گئے مختلف شخصیتوں کے سوانحی کوائف 'اردو دنیا' کے ادارتی شعبے کی ٹیم نے مختلف ذرائع سے ملنے والے حوالوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ ادارہ

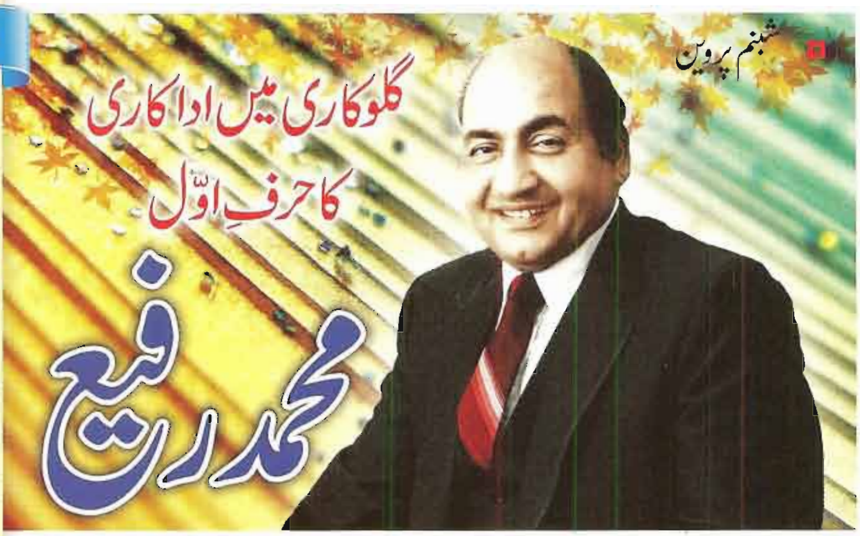

گلوکاری میں اداکاری کا حرفِ اوّل
محمد رفیع

شبنم پروین

ہندوستانی سینما کی پہلی صدی نے کے سی ڈے اور کے ایل سہگل کے زمانے سے لے کر آج تک کئی ایسے منفرد و عظیم فلمی گلوکار ہمیں دیے ہیں جنھوں نے اس فن کو جلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جنھیں آج بھی فلمی موسیقی کے شائقین شوق سے سنتے اور سر دھنتے ہیں۔ ان میں خاص طور سے مردانہ آوازوں میں جس شخصیت کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا اور جس کی کمی کو آج سبھی محسوس کرتے ہیں، وہ محمد رفیع تھے۔ دراصل سینما کے ان سو برسوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا جائے تو پہلا دور کے ایل سہگل کا تھا اور دوسرا دور محمد رفیع کا ہے۔

یہ بات کہتے ہوئے 1946 کی فلم 'شاہجہاں' کا ایک منظر یاد آجاتا ہے۔ اس فلم کے میوزک ڈائریکٹر نوشاد تھے اور ہیرو کے ایل سہگل جنھوں نے تاج محل کا ڈیزائن بنانے والے ایرانی عمارت ساز کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ شخص ایک شہزادی (نسیم بیگم) سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے ایک گانا گاتا ہے، جس کے بول تھے 'روحی روحی، میرے سپنوں کی رانی'۔ ظاہر ہے یہ گیت خود کے ایل سہگل نے گایا تھا۔ ڈائریکٹر گیت کو اس طرح فلمایا کہ پہلے سہگل گارہے ہیں، اس کے بعد ہونٹوں اور کانوں پر چڑھتا ہوا یہ گیت پورے شہر کے لوگوں میں پہنچتا ہے، جو نہیں بھی جانتا وہ اس گیت کو سن کر ہی روحی کے حسن پر فدا ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ فقیر فقرا بھی روحی روحی پکار اٹھتے ہیں، آخر میں کیمرہ ایک تنہا فقیر کو روحی کو پکارتا اور گیت کا مکھڑا گاتے ہوئے دکھاتا ہے، یہ فقیر صرف مکھڑا گاتا ہے اور اسی پر گیت تمام ہوجاتا ہے۔ فقیر کے لیے نوشاد نے محمد رفیع کی آواز استعمال کی تھی۔ اس گانے کا ریکارڈ اپنے آپ میں آنے والے وقت کی پیشین گوئی تھا کیونکہ یہ سہگل کی آواز سے شروع ہوتا تھا اور رفیع کی آواز پر ختم ہوجاتا تھا۔ یعنی یہ وہ مرحلہ تھا جہاں سہگل کا دور ختم ہورہا تھا اور رفیع کا دور شروع ہونے والا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ سہگل کی یہ آخری فلم ثابت ہوئی اور ان کی وصیت کے مطابق ان کے انتقال پر اسی فلم کا وہ گیت بجایا گیا جس کے بول تھے 'جب دل ہی ٹوٹ گیا، ہم جی کے کیا کریں گے' اور جسے سن کر آج بھی پلکیں نم ہوجاتی ہیں۔

ایک اور اتفاق یہ بھی ہے کہ، محمد رفیع کو گانے کا شوق ایک فقیر کے گانے کی نقل کرتے کرتے ہوا تھا اور پھر ایک فقیر پر فلمائی گئی ان کی آواز سے ہی ان کا فلمی سفر بھی شروع ہوا۔ ویسے فقیروں کے گانے انھوں نے گائے بھی بڑے دل سے۔ او بابو اک پیسہ دے دے، غریبوں کی سنو وہ تمھاری سنے گا، اللہ کی نظروں میں برابر ہیں سب انسان، اولاد والو پھولو پھلو جیسے فقیری گانے سن کر کس کا دل ہوگا جو درد سے نہ بھر جائے۔

محمد رفیع کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے گلے سے گلوکاری نہیں اداکاری کرتے تھے۔ فلمی نغموں میں اداکاری ان ہی سے شروع ہوئی۔ اس فن کی موہوم سی شروعات کے ایل سہگل نے دیوداس اور شاہجہاں کے گانوں سے کردی تھی لیکن محمد رفیع نے اسے بہت سنجیدگی سے لیا۔ شروعاتی نغموں، مثلاً یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے، میں سہگل کا اثر ان کے انداز پر حاوی ہوا مگر اس کے بعد انھوں نے فلمی کیمرے کے سامنے ہی نہیں گانوں میں بھی اداکاری شروع کردی اور بعد میں تو اس فن کو اتنا آگے تک لے گئے کہ مختلف اداکاروں کے لیے مختلف انداز اور لہجے میں گانے لگے۔ ان کے گیتوں سے صاف پتہ چل جاتا تھا کہ یہ دلیپ کمار کے لیے ہے، یہ دیوانند کے لیے اور یہ شمی کپور پر فلمایا گیا ہوگا۔ محمد رفیع ایک ہی تھے لیکن ان کی آواز کے روپ انیک تھے۔

منا ڈے

ہندوستانی سینما میں منا ڈے اکیلے گلوکار ہیں جنھیں کلاسیکی نیم کلاسیکی، سنجیدہ مزاحیہ، رومانٹک اور جوشیلے نغموں اور غزل، قوالی، بھجن وغیرہ ہر طرح کے گیت گانے پر عبور حاصل رہا ہے اور جن کا تلفظ بھی لتا منگیشکر کے تلفظ کی طرح پاک صاف ہے۔

اصل نام پربودھ چندر ڈے تھا اور منا عرفیت۔ اس مناسبت سے وہ منا ڈے کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔ وہ یکم مئی 1919 کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ہندوستانی سینما کی ابتدائی بولتی فلموں کے نابینا ایکٹر، موسیقار اور گلوکار کے سی ڈے (کرشن چندر ڈے) ان کے ماموں تھے، جن سے سچن دیو برمن نے بھی شروع میں تعلیم پائی تھی۔ وہی منا ڈے کو ممبئی لے آئے۔ 1943 میں انھوں نے فلم تمنا کے لیے ثریا کے ساتھ ایک ڈوئٹ گایا جو بہت مشہور ہوا۔ فلم مشعل کے گانے 'اوپر گگن وشال' نے انھیں ملک گیر شہرت دلائی۔ منا ڈے نے اردو ہندی میں دوسرے مرد گلوکاروں کے مقابلے میں کم گیت گائے لیکن احترام انھیں سب سے زیادہ ملا۔ وہ خود محمد رفیع کے بے حد شیدائی ہیں۔ انھیں پدم شری اور پدما بھوشن کے علاوہ، نیشنل فلم ایوارڈ برائے گلوکار ہندی اور بنگالی میں ملے۔ میرا نام جوکر کے لیے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ اس کے علاوہ لتا منگیشکر ایوارڈ شیام مترا ایوارڈ آنندلوک لائف، ٹائم ایوارڈ، کیرالہ حکومت کی جانب سے نیشنل ایوارڈ، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ کے علاوہ ریاستی سطح کے کئی اعزازات سے انھیں نوازا گیا۔ زندگی کے 50 سال سے بھی زیادہ ممبئی میں ایک گلوکار کی حیثیت سے گزارنے کے بعد اب منا ڈے بنگلور میں رہتے ہیں۔ چار سو بیس، چوری چوری، کابلی والا، برسات کی رات، دوج کا چاند، بات ایک رات کی، میرے حضور، دل ہی تو ہے، میرا نام جوکر، ضدی (رنگین) ان کی اہم فلموں میں شامل ہیں۔

مکیش

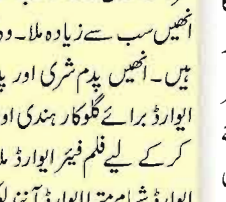

محمد رفیع، طلعت محمود، منا ڈے اور کشور کمار کے زریں عہد میں مکیش بھی سنہری آوازوں کے اس محل کے ایک ستون تھے۔ مکیش چند ماتھر 22 جولائی 1923 کو ایک کائستھ گھرانے میں لدھیانہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد زورآور چند

رفیع کی آواز کا قوس بھی بہت بڑا تھا۔ موسیقار اپنی زبان میں اس قوس کو کینڈا کہتے ہیں۔ نوشاد صاحب کہا کرتے تھے کہ رفیع کی آواز جیسا کینڈا فلموں میں کسی کا نہیں تھا۔ نیچے یا اونچے سروں میں جا کر اکثر گلوکاروں کی آواز بگڑ جاتی ہے۔ جن سروں کے بیچ وہ سہولت سے گا سکتے ہیں وہ ان کا کینڈا ہوتا ہے۔ مکیش اور طلعت محمود سروں کی خاص اونچائی یا نیچائی میں ہی اپنی آواز کا حسن برقرار رکھ پاتے تھے۔ لیکن محمد رفیع چاہے 'او دنیا کے رکھوالے' گائیں یا 'من تڑپت ہری درشن کو آج' گائیں، ان کا سر تو خیر بگڑتا ہی نہیں تھا آواز کا قدرتی حسن بھی قائم رہتا تھا۔ مکیش نے بہت نچلے سروں میں 'نین دوار سے من میں وہ آکر تن میں آگ لگائے' گایا اور طلعت محمود نے 'سنو بھائی ہم نے پی لی ہے تھوڑی' میں ہلا گلا مچانے کی کوشش کی تو دونوں ناکام رہے۔ گلوکاری میں اداکاری اور آواز کے کینڈے نے محمد رفیع کو فلمی گلوکاری کا ایک لجنڈ بنا دیا جس کی آواز کے سائے تو انور، شبیر کمار اور عزیز احمد

محمد رفیع اپنے گھر والوں کے ساتھ

کی شکل میں کئی آئے لیکن چلے بھی گئے۔

نغموں کا کوئی روپ ایسا نہیں جس کا رفیع صاحب نے حق نہ ادا کر دیا ہو۔ کھویا کھویا چاند، اور میرے محبوب تجھے میری محبت کی قسم جیسے رومانی گیت ہوں، یہ جھکی جھکی نگاہیں تیری، اور سبحان اللہ حسیں چہرہ یہ مستانہ ادائیں جیسے چلبلے گانے ہوں۔ گھوڑا پشوری میرا تانگہ لاہوری میرا، اور میں رکشہ والا یا سر جو ترا چکرائے جیسے پیشہ ور لوگوں کے گیت ہوں۔ اس بھری دنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ ہوا، اور بابل کی دعائیں لیتی جا جیسے درد انگیز نغمے ہوں۔ چاہے کوئی مجھے جنگلی کہے، اور اپریل فول بنایا تو ان کو غصہ آیا جیسے چیخ پکار والے گانے ہوں۔ یہ دیش ہے ویر جوانوں کا، اور اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں جیسے حب الوطنی کے ترانے ہوں۔ میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا، اور میری دوستی میرا پیار جیسے مسرت آگیں نغمے ہوں۔ رفیع نے زندگی کے جس موڈ کو گایا اسے زندگی بخش دی۔

ہندوستانی سینما کو نغمہ بار کرنے والے محمد رفیع

ماتھر ایک انجینئر تھے۔ انھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی دہلی میں کچھ عرصہ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ میں ملازم رہے۔ مشہور اداکار موتی لال ان کے دور کے رشتے دار تھے جنھوں نے اپنی بہن کی شادی میں مکیش کو گاتے ہوئے سنا تو ان کی آواز سے متاثر ہو کر انھیں ممبئی لے آئے۔ کے ایل سہگل کی آواز سے مکیش بڑے متاثر تھے اوقر ان کے ہی انداز میں گایا کرتے تھے۔ تاہم بعد میں انھوں نے یہ انداز چھوڑ دیا اور اپنی الگ پہچان بنائی۔ فلم نردوش میں انھوں نے پلے بیک سنگر اور ایکٹر کے طور پر پہلا گانا گایا، جب دل ہی بجھ چکا ہو تو فصل بہار کیا۔ انل بسواس اور روشن کی موسیقی میں انھوں نے جو گیت گائے وہ ملک بھر میں مشہور ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے نوشاد کے لیے بھی گلوکاری کی۔ راج کپور کے ساتھ جڑنے کے بعد تو جیسے وہ ان کی آواز ہی بن گئے۔ شنکر جے کشن کے ساتھ متعدد ہٹ گانے دینے والے مکیش کو اناڑی فلم کے لیے فلم فیئر ایوارڈ اور سلیل چودھری کے لیے فلم 'رجنی گندھا' کا گیت 'کئی باریوں بھی دیکھا ہے' گانے پر نیشنل فلم ایوارڈ ملا۔ تقریباً ایک ہزار سے بھی زائد گانے والے مکیش کا انتقال 27 اگست 1986 کو امریکی ریاست مشیگن کے شہر ڈیٹرائٹ میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوا جہاں وہ اسٹیج شو کرنے گئے تھے۔ آگ، بانورے نین، ملہار، انداز، میلہ، دھرتی کہے پکار کے، ملن، پہچان، بے ایمان، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، سنگم وغیرہ ان کی اہم فلمیں تھیں۔ مکیش نے اداکاری بھی کی اور کئی فلمیں بھی بنائیں، جن میں معشوقہ اور ملہار شامل ہیں۔

طلعت محمود

غزل گانے میں محمد رفیع مکیش اور منا ڈے سے کہیں زیادہ شہرت پانے والے نرم تھرتھراتی ہوئی سی مخملی آواز کے مالک طلعت محمود 24 فروری 1924 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت بڑی وجیہہ تھی چنانچہ اداکاری میں بھی انھوں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے اور متعدد فلموں کے ہیرو رہے۔ انھوں نے 16 برس کی عمر میں 1939 میں اپنے کیریئر کی شروعات آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں غزل سرا کے طور پر کی۔ 1941 میں HMV نے انھیں ریکارڈ کیا اور 1944 میں پہلا ہٹ البم دیا۔ انھوں نے کلکتہ اور ممبئی کی فلم صنعت کے لیے تقریباً 16 فلموں میں پردے پہ آکر غزلیں گائیں۔ بنگالی میں وہ 'تپن کمار' کے نام سے مشہور

ہوئے۔ 1949 میں ممبئی میں 'اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو' (فلم آرزو) نے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ ہندوستانی سینما کو ان گنت مغموم اور مخمور نغمات دینے والے طلعت محمود نے 9 مئی 1988، کو 74 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کی خاص فلموں میں، دیکھ کبیرا رویا، ٹیکسی ڈرائیور، بارہ دری، مرزا غالب، جہاں آرا، داغ، سجاتا، چاندی کی دیوار شامل ہیں۔

کشور کمار

ہندوستانی سینما میں کسی شخصیت کو درحقیقت ایک لیجنڈ کہا جا سکتا ہے تو وہ کشور کمار تھے۔ 4 اگست 1929 کو ہندوستان کی فلمی دنیا کے مایہ ناز پلے بیک سنگر، اداکار، نغمہ نگار، موسیقار، ہدایت کار، کہانی کار اسکرپٹ رائٹر، اور فوٹو گرافر کی پیدائش، بنگالی برہمن گانگولی خاندان میں ہوئی۔ ان کی جائے پیدائش کھانڈوا (مدھیہ پردیش) ہے۔ انھوں نے ہندی کے علاوہ بہت سی ہندوستانی زبانوں مثلاً مراٹھی، آسامی، گجراتی، کنڑا، بھوجپوری، ملیالم اور اُڑیہ، میں بھی گانے گائے۔ انھوں نے اپنے فن میں 8 فلم فیئر ایوارڈ اور مدھیہ پردیش حکومت کی جانب سے لتا منگیشکر ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ ہندی سینما میں کشور کمار کے نام سے بھی ایک ایوارڈ حال ہی میں شروع کیا گیا ہے۔ کشور کمار اپنے خاندان میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے بھائی اشوک کمار ایک مشہور فلمی اداکار تھے۔ گلوکاری میں ان کے استاد کندن لال سہگل تھے۔ انھوں نے اپنے فلمی کیریئر کی شروعات 'بامبے ٹاکیز' سے کورس سنگر کے طور پر کی۔ ان کی بطور اداکار پہلی فلم 'شکاری' (1946) تھی اور ان کا پہلا موقع فلم ضدی میں 'مرنے کی دعائیں کیوں مانگو' لیکن وہ فلمی کیریئر کو لے کر سنجیدہ نہیں تھے۔ 1949 میں ممبئی settle ہو جانے کے بعد انھوں نے فلم آندولن میں ہیرو کا رول نبھایا۔ ایس ڈی برمن نے کشور کمار کے ساتھ بہت سے ایسے گانے ریکارڈ کیے جو ہندی سینما میں ان کی آواز میں لافانی ہو گئے۔ مثلاً منیم جی (1954)، ٹیکسی ڈرائیور (1954)، ہاؤس نمبر 44، فنٹوش، نو دو گیارہ، پیئنگ گیسٹ، گائڈ جویل تھیف، پجاری، تیرے میرے سپنے، چلتی کا نام گاڑی اور ایسے نہ جانے کتنے ان گنت نغمے اور اداکاری کے نمونے ان کی شخصیت کی ان مٹ چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے 13 اکتوبر 1987

24 دسمبر 1924 کو کوٹلہ سلطان سنگھ پنجاب (اب پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی علی محمد پیشے سے حجام تھے۔ چھ بھائیوں میں دوسرے نمبر کے محمد رفیع کا لاڈ پیار کا نام پھیکو تھا۔ ان کے گاؤں میں ایک فقیر آتا تھا جس کی نقل میں گاتے گاتے وہ گھر سے دور نکل جاتے تھے۔ رفیع کے والد بعد میں لاہور منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے نور محلّہ بھٹّی گیٹ میں مردانہ سیلون کھول لیا۔ ان کے بڑے بھائی عبدالحمید نے رفیع کے ٹیلنٹ کو بھانپ لیا اور انھیں باقاعدہ گانے کا مشورہ دیا اور ان کے کنبے کو انھیں ممبئی بھیجنے کے لیے منالیا۔ رفیع نے استاد بڑے غلام علی خاں، استاد عبدالوحید خاں، پنڈت جیون لال مٹّو اور فیروز نظامی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ لاہور میں ہی فلم گل بلوچ کے لیے انھوں نے 1941 میں پہلا گانا گایا جو پنجابی میں تھا اور جس کے بول تھے 'سونیے نی ہیریے نی'۔ اسی سال انھیں لاہور ریڈیو اسٹیشن نے گانے کے لیے بلا لیا۔

لتا منگیشکر محمد رفیع کو پھول دیتے ہوئے

1944 میں انھوں نے ممبئی کا رخ کیا اور حمید صاحب کے ساتھ بھنڈی بازار میں دس بائی دس فٹ کے ایک کمرے میں رہنے لگے۔ شاعر تنویر نقوی نے انھیں فلمی ہستیوں سے متعارف کرایا۔ جی ایم درانی کے ساتھ انھوں نے فلم گاؤں کی گوری کے لیے ایک دوگانا، 'اجی دل ہو جو قابو میں تو دل دار کی ایسی تیسی'۔ اس کے بعد نوشاد صاحب نے ہندوستان کے 'ہم ہیں' فلم کے لیے انھیں گانے کا موقع دیا۔ پھر 'پہلے آپ' آئی اور رفیع چل نکلے۔ رفیع صاحب اپنے وقتوں کے سبھی چھوٹے بڑے موسیقاروں کے لیے گیت گائے۔ کئی موسیقاروں کا کیریئر ہی ان کی بدولت بنا جن میں روی بھی شامل تھے۔

رفیع کو پدم شری اور فلم فیئر ایوارڈ کے علاوہ بہت سے اعزاز ملے جن کا شمار مشکل ہے۔ دراصل ان کی زندگی ہی ہندوستانی سنیما کے لیے ایک اعزاز اور اعجاز تھی، جس کا بدل آج تک پیدا نہیں ہوا ہے۔

◘

Miss Shabnam Parveen, C-280, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

کو 58 سال کی عمر میں اس جہانِ فانی کو خیرآباد کہہ دیا۔

مہندر کپور

ہندوستانی فلمی گلوکاروں کی دنیا کے چار درویشوں (رفیع، طلعت، مکیش اور مناڈے) کے سائے میں تھوڑی بہت الگ پہچان بنانے والے مہندر کپور کو نوشاد کے کمپوز کیے ہوئے فلم سوہنی مہیوال کے ایک ہی گیت نے راتوں رات گلوکار بنا دیا تھا۔ نوشاد کو اس فلم کے آخر میں پس منظر کے ایک گانے کے لیے مردانہ آواز کی ضرورت تھی جو بہت اونچے سروں پر بھی اپنا حسن برقرار رکھ سکے۔ اس کے لیے محمد رفیع بہت مناسب تھے لیکن وہ پہلے ہی فلم کے ہیرو کے لیے استعمال ہو چکے تھے۔ ان کی نگاہ انتخاب ان دنوں جدوجہد میں مصروف مہندر کپور پر ٹھہری اور 'حسن چلا ہے عشق سے ملنے رات غضب کی آئی' گا کر مہندر کپور نے سب کو چونکا دیا۔ اس کے بعد وی شانتا رام نے 1958 میں انھیں نورنگ میں ایک بڑا بریک دیا اور پھر بی آر چوپڑہ کے لیے بھی انھوں نے گیتا گائے۔ ان کی پیدائش، امرت سر میں 9 جنوری 1934 کو ہوئی اور انھوں نے ہزار سے بھی زائد نغمے گائے۔ انھیں پدم بھوشن کے علاوہ فلم گمراہ میں 'چلو اک بار'، فلم ہمراز میں 'نیلے گگن کے تلے'، فلم 'اپکار' میں 'میرے دیش کی دھرتی'، فلم 'روٹی کپڑا اور مکان' میں 'اور نہیں بس اور نہیں'، فلم فقیرہ میں 'سن کے تیری پکار' کے لیے قومی ایوارڈ ملے۔ انھوں نے محمد رفیع اور طلعت محمود کے ساتھ بھی گایا۔ دل کا دورہ پڑنے سے 27 ستمبر 2009 میں 74 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اُدت نرائن

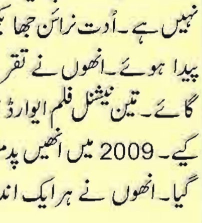

محمد رفیع کے بعد کے دور میں، سب سے زیادہ گیت گانے والے اور سب سے مقبول ہونے والے گلوکار اُدت نرائن ہیں، جن کی آواز یا انداز پر رفیع یا کشور کی کوئی واضح چھاپ نہیں ہے۔ اُدت نرائن جھا یکم دسمبر 1955 کو نیپال میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تقریباً 32 زبانوں میں نغمے گائے۔ تین نیشنل فلم ایوارڈ اور پانچ فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیے۔ 2009 میں انھیں پدم شری کے خطاب سے نوازا گیا۔ انھوں نے ہر ایک انداز کے نغمے گائے، 1981 میں فلم سناٹا سے اپنے فلمی کیریئر کی شروعات کی اور پھر کبھی مڑ کے دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آج بھی وہ اس فن کو جلا بخش رہے ہیں۔ قیامت سے قیامت تک، دل والے دلہنیا لے جائیں گے، راجہ ہندوستانی، اکیلے ہم اکیلے تم، سناٹا، لگان، ڈر، مہرہ، غدر وغیرہ ان کی اہم فلمیں ہیں۔

ابھجیت بھٹا چاریہ

محمد رفیع اور کشور کمار کے بعد کے دور میں اپنی پہچان بنانے والے مشہور گلوکاروں میں ابھجیت بھٹاچاریہ بھی شامل ہیں جن کے گائے ہوئے 'چاندنی رات ہے، ہر قسم سے بڑی ہے، جاتا ہے تو کہاں'، جیسے نغمے بہت مشہور ہوئے ہیں۔ اور ایک فلم 'یس باس' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ابھجیت، ایک بنگالی خاندان میں 30 اکتوبر 1958 کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کئی مشہور فلموں مثلاً بادشاہ، دل والے دلہنیا لے جائیں گی، جوش، دھڑکن، چلتے چلتے، میں ہوں نا، دل سے پوچھ کدھر جانا ہے کے لیے گانے گائے ہیں۔ انھوں نے 1970 سے گانا شروع کیا تھا۔ آج کل وہ فلموں میں کم گا رہے ہیں۔ 2006 میں ان کا غیر فلمی البم 'لمحے' ریلیز ہوا۔

سونو نگم

سونو نگم صرف موسیقی میں ہی اپنی آواز کا جادو نہیں جگا رہے ہیں بلکہ اداکاری، موسیقی ہدایت کار، ٹی وی پریزینٹر، ریڈیو جوکی کے رول کو بھی بخوبی نبھا رہے ہیں۔ ان کی پیدائش 30 جولائی 1973 میں ہریانہ میں ہوئی۔ انھوں نے ہندی، اردو، کنڑا، اُڑیہ، تمل، آسامی، پنجابی، بنگالی، ملیالم، مراٹھی، تیلگو اور نیپالی میں بھی نغمے گائے۔ انھوں نے India-Pop البم ریلیز کیا اور کچھ فلموں میں اداکاری بھی۔ دراصل اپنے والد کے ساتھ انھوں نے 4 سال کی عمر میں نغمہ سرائی کی پہلی سیڑھی پہ پاؤں رکھ دیا تھا اور 19 سال کی عمر میں ممبئی میں استاد غلام مصطفیٰ خان سے باقاعدہ کلاسیکی ادب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ 2004 میں انھوں نے 'کل ہو نہ ہو' کے لیے نیشنل ایوارڈ حاصل کیا۔

اس مضمون کے ساتھ دیے گئے مختلف شخصیتوں کے سوانحی کوائف 'اردو دنیا' کے ادارتی شعبے کی ٹیم نے مختلف ذرائع سے ملنے والے حوالوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ ادارہ

قاسم انصاری

ہندوستانی سینما
لتا منگیشکر
اور اردو

ہندوستانی سینما کی عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر کا فلمی تقریباً ساڑھے چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ اس پورے سفر میں انھوں نے ہزاروں اردو نغمات کو اپنی آواز دے کر لازوال بنا دیا ہے۔ آج وہ عزت وشہرت کے جس مقام پر ہیں ہندی سینما کی تاریخ میں یہ شہرت اور عزت کسی اور گلوکارہ کے حصے میں نہیں آئی اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کے آثار ہیں۔ فن گلوکاری میں لتا منگیشکر خود میں ایک انجمن، دبستان اور ایک ایسا ادارہ ہیں جہاں سے فن گلوکاری کے بہت سے چشمے پھوٹے ہیں اور آج کی نئی نسل ان چشموں سے فیضیاب اور میراب ہورہی ہے اور مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس عظیم گلوکارہ میں یہ مثالی صفت آئی کیسے؟ جواب یہی ہے کہ یہ صفت خدا داد ہے اور قدرت نے ہی انھیں یہ سحرانگیز آواز عطا کی ہے لیکن دوسری وجہ ان کی محنت، لگن کے ساتھ ان کی اردو زبان بھی ہے۔ ایک مراٹھی گھرانے میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی لتا نے آخر کیسے اردو الفاظ کی ادائیگی، بہترین تلفظ اور اردو زبان کی روانی کا فن سیکھا۔ کسی بھی مراٹھی، یا دیگر زبان کے فنکار کے لیے یہ مشکل ترین مسئلہ ہے کہ وہ اردو الفاظ کی ادائیگی، روانی، مٹھاس اور لب ولہجے میں اس طرح اتر جائے کہ اس کا فن اس زبان میں ڈھل جائے جس کی ضرورت عوام الناس کو ہے۔ زبان سیکھنے کا یہ ہنر بھی کوئی لتا جی سے سیکھے کہ کیسے ایک مراٹھی فنکار اپنے گلے کی مٹھاس کو اردو زبان کی مٹھاس میں ڈھالتی ہے۔ لتا کی آواز اسی لیے اتنی اچھی اور میٹھی ہے کیونکہ ان کی فنکاری میں دونوں کا حسین امتزاج ہے۔ سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک مراٹھی طرز معاشرت میں پلی بڑھی لتا نے اردو زبان کیسے سیکھی؟

کتاب 'لتا منگیشکر' کی مصنفہ نسرین منی کبیر نے لتا جی کی گلوکاری اور اردو زبان کی طرف میلان کے متعلق اظہار کرتے ہوئے کچھ اس طرح لکھا ہے:

''بات 1948 کی ہے جب لتا منگیشکر انل بسواس کے ساتھ ایک ٹرین میں سفر کررہی تھیں اس ٹرین میں شہنشاہ جذبات دلیپ کمار صاحب بھی سفر کررہے تھے۔ اِس سفر کے دوران انل بسواس نے لتا کا تعارف دلیپ صاحب سے کرایا اور کہا کہ یہ نئی لڑکی ہے یقیناً آپ کو اس کی آواز پسند آئے گی۔ دلیپ صاحب نے لتا کے نغمے کو سنا۔ اِس دوران انل بسواس نے کہا کہ یہ مراٹھی لڑکی ہے۔ لتا کی آواز اور نغمہ سننے کے بعد دلیپ صاحب نے لتا کو تلقین کی کہ آپ اردو زبان سیکھیں۔ کیونکہ آپ کا تلفظ کہیں کہیں درست نہیں ہے۔ اسی لیے آپ کے گانے میں دال بھات کی بو آتی ہے۔ لتا کو دلیپ صاحب کے اِس جواب وسخت ردعمل سے تکلیف تو پہنچی لیکن انھوں نے اِس سخت لہجے میں چھپی دلیپ صاحب کی اردو زبان سیکھنے کی نصیحت کو ترک نہیں کیا، نلنی کہتی ہیں کہ انھوں نے یہ پورا واقعہ محمد شفیع نامی شخص کو بتایا محمد شفیع اردو زبان سے بخوبی واقف تھے اور وہ نوشاد اور انل دا کے معاون بھی تھے۔ لتا کے کہنے پر محمد شفیع نے ایک اردو ٹیچر کا نظم لتا کے لیے کیا تا کہ لتا اردو زبان اور اس کا تلفظ سیکھ سکیں۔ چنانچہ محبوب نامی شخص لتا کے اردو استاد مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ تک لتا نے اردو زبان محبوب نامی شخص سے سیکھی۔

شمشاد بیگم

شمشاد بیگم ہندوستانی گلوکاراؤں میں ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں جو لتا منگیشکر سے پہلے کے دور کی سب سے مقبول گلوکارہ تھیں۔ ان کی پیدائش 14 اپریل 1919 امرتسر پنجاب میں ہوئی۔ بیگم شمشاد، کے ایل سہگل کی بہت بڑی مداح ہیں۔ انھوں نے ان کی مشہور زمانہ فلم 'دیوداس' کو 14 مرتبہ دیکھا ہے۔ ان کی شادی گنپت لال بٹو سے ہوئی تھی۔ فی الوقت اپنی بیٹی اوشا رترا اور داماد کے ساتھ بمبئی کے 'ہیرا نندنی گارڈن' پوائی میں رہ رہی ہیں۔ انھیں 2009 میں پدم بھوشن کے انعام سے نوازا گیا۔ گلوکاری کا آغاز ریڈیو پشاور اور ریڈیو لاہور سے 16 دسمبر 1947 میں کیا۔ بیگم شمشاد آل انڈیا ریڈیو کے لیے بھی اپنے میوزیکل گروپ کے ساتھ پروگرام دیتی رہیں۔ نغمہ نگار غلام حیدر کی کمپوزنگ میں فلم 'خزانچی خاندان' جیسی فلموں کے لیے نغمے گائے۔ انھیں 2009 میں او پی نیر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

نور جہاں

نور جہاں جنھیں لتا منگیشکر اپنا گرو مانتی تھیں، غیر منقسم ہندوستان کی سب سے مشہور گلوکارہ اور اداکارہ

اس کتاب میں لتا آگے کہتی ہے کہ وہ اردو زبان بہت اچھے طریقے سے نہیں بول پاتی ہیں، لیکن نغموں میں اردو الفاظ کی ادائیگی وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کرتی ہیں۔ لتا کی اردو زبان سے اس وابستگی کی تعریف اس عہد میں نرگس کی ماں جدن بائی نے بھی کی۔ لتا کہتی ہیں کہ ایک بار وہ فلم 'محل' کے نغمہ 'آئے گا آنے والا' کی ریکارڈنگ کے لیے اسٹوڈیو گئی تھیں ساتھ والے کمرے میں نرگس اور ان کی ماں جدن بائی بھی موجود تھیں۔ ریکارڈنگ کے دوران جدن بائی نے لتا کی آواز میں پورا نغمہ سنا۔ ریکارڈنگ ختم ہونے کے بعد جدن بائی نے لتا کو اپنے پاس بلایا اور لتا سے ان کا نام پتہ پوچھا۔ جدن بائی نے ان کی آواز اور اردو الفاظ کی ادائیگی کے لیے لتا کی خوب تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔ لتا نے جدن بائی سے کہا کہ میں ابھی اردو زبان سیکھ رہی ہوں۔

کتاب میں لتا اردو زبان سیکھنے سے متعلق مزید کہتی ہیں کہ جو بھی نغمہ انھیں گانے کے لیے دیا جاتا تو وہ بہت غور سے نغمہ کے الفاظ اور اس کے تلفظ کو سنتی تھی اور ان کی ادائیگی پر بھرپور توجہ دیتی تھی، ایک مرتبہ جب وہ کسی نغمہ کے بول کو سنتی تو اس کے تلفظ اور صوتی آہنگ کو دیوناگری میں لکھ لیا کرتی تھیں اور پھر خوب پریکٹس کے بعد اسے گاتی تھی۔''

لتا کی اردو زبان سے اس حد تک دلچسپی اور اردو سیکھنے کے جذبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1949 میں جب فلم 'محل' میں لتا کی آواز میں 'آئے گا آنے والا آئے گا' جیسا دلکش اور خوبصورت نغمہ گونجا تو اس نغمے نے لتا کی عظمت اور مستقبل دونوں کا ثبوت پیش کیا۔ ثبوت اِس بات کا بھی کہ ایک دن لتا منگیشکر اپنی جادوئی آواز اور بہتر اردو الفاظ کی ادائیگی کی بنا پر ملک کی سب سے عظیم گلوکارہ بنے گی اور انھیں بلبل ہند یا ملکۂ ترنم کے خطاب سے نوازہ جائے گا۔ لتا کو خطاب بھلے ہی کچھ بھی دیے گئے ہوں لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ لتا آج خود اپنے آپ میں ایک خطاب ہیں اور ان کے کروڑوں شیدائی دنیا بھر میں موجود ہیں، لتا کو بھلے ہی اپنی عظمت پر فخر ہو یا نہ ہو لیکن سرزمین ہند کو اِس بات کا فخر ضرور ہے کہ اس نے اِس مٹی سے لتا جیسی عظیم انمول اور شہرہ آفاق گلوکارہ کو جنم دیا ہے۔ اسی لیے حکومت ہند نے سال 2001 میں لتا کو بھارت رتن جیسے سب سے بڑے ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

لتا کی اردو زبان سے محبت اور وابستگی کی داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ انھوں نے اردو کی مقبول ترین صنف 'غزل' میں بھی اپنی آواز اور اپنے فن کی جلوہ گری دکھائی ہے۔ اردو کے شہرہ آفاق شاعر مرزا اسداللہ خاں کو غالب کی غزلوں کو گا کر لتا منگیشکر نے اردو زبان سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے جو ان کے غیر فلمی ریکارڈس میں موجود ہے:

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
کوئی امید بر نہیں آتی

'بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے گے' اور 'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے' جیسی غزلوں کو بھی انھوں نے سراور ترنم بخشا ہے۔ اس حیثیت سے لتا منگیشکر غزل گلوکارہ بھی ہیں۔

لتا چھوٹی بہن آشا بھونسلے کے ساتھ

28 ستمبر 1929 میں ایک مراٹھی گھرانے میں پیدا ہوئی لتا منگیشکر نے اپنے کیریئر کا آغاز 1942 میں کیا۔ اور فن موسیقی کی تعلیم گویا انھیں گھر میں ہی ملی۔ لتا کے والد پنڈت دینانا تھ منگیشکر خود بھی ایک گلوکار اور اداکار رتھے۔ اور لتا نے خود کو بچپن سے ہی اس فن میں ڈھال لیا تھا۔ لتا اپنے گھر میں سب سے بڑی تھی، آشا بھونسلے اور لتا منگیشکر اور مینا منگیشکر لتا کی چھوٹی بہنیں اور ہردے ناتھ منگیشکر، لتا کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آج صرف لتا ہی نہیں بلکہ ان کی دو چھوٹی بہنیں آشا بھونسلے اور اوشا منگیشکر بھی فن موسیقی اور فن گلوکاری میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ گھر کے علاوہ لتا نے کلاسیکی موسیقی اور گلوکاری کی تعلیم اور اس کی باریکیاں استاد امانت علی خاں سے سیکھی۔ استاد کے پاکستان ہجرت کر جانے کی وجہ سے لتا نے کلاسیکی موسیقی کی تعلیم کو ترک نہیں کیا بلکہ استاد بڑے غلام علی خاں کے شاگرد پنڈت تلسی داس شرما سے وہ تعلیم لیتی رہیں۔ لتا ابتدائی دور میں مراٹھی فلموں کے لیے گاتی تھیں اور اپنے پورے کیریئر میں انھوں نے ہندی/اردو فلموں کے علاوہ علاقائی وغیر ملکی زبانوں کے تقریباً 30 ہزار نغمات کو آواز بخشی ہے۔

تھیں۔ پاکستان میں انھیں ملکہ ترنم کے خطاب سے نوازا گیا۔ نور جہاں کی پیدائش 21 ستمبر 1926 کو برٹش انڈیا عہد میں پنجاب کے قصور میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مدد علی اور والدہ فتح بی بی کے نام سے مشہور تھیں۔ گھریلو نام اللہ وسائی تھا۔ استاد بابا غلام محمد سے موسیقی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد گلوکاری اور اداکاری کی دنیا میں اپنا منفرد مقام بنایا۔ نور جہاں نے پہلی اردو فلم خاندان (1942) میں بطور ہیروئن کا کردار ادا کیا اور نغمے بھی گائے۔ نور جہاں کی شادی سید شوکت حسین رضوی سے ہوئی جن سے تین اولاد ہیں۔ ان کی دوسری شادی اعجاز درانی سے ہوئی۔ انھوں نے فلموں کے لیے 127 نغمے گائے۔ نور جہاں کی وفات 23 دسمبر 2000 میں ہوئی۔

ثریا

ثریا جمال شیخ ہندوستانی فلمی دنیا کی ایک معروف ومشہور اداکارہ وگلوکارہ کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ انھوں نے اپنی دلکش اداؤں اور نغمہ سرائی سے نہ صرف ہندوستان بلکہ برصغیر کے شیدائیوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئیں۔ ثریا کو ہی سب سے پہلے ملکۂ ترنم کے خطاب سے نوازا گیا۔ بعدازاں نور جہاں کو یہ خطاب عطا کیا گیا۔ ان کی پیدائش 15 جون 1929 گجرانوالہ پنجاب برٹش انڈیا میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم جے بی پیٹیٹ گرلس ہائی اسکول ممبئی سے ہوئی۔ انھوں نے مذہبی تعلیم بذریعہ فارسی گھر پر حاصل کی۔ ان کی پہلی مقبول فلم 'تاج محل' میں بحیثیت ممتاز محل کا رول ادا کیا۔ انھوں نے کئی فلموں کے لیے نغمے گائے مثلاً انمول گھڑی (1946)، درد (1947)، دل لگی (1949) اور داستاں (1950)۔ بیشتر نغموں کے لیے کمپوزنگ نوشاد، حسن لال بھاگترم نے کیا۔ خواجہ خورشید انور ان کے پسندیدہ نغمہ نگار تھے جنھوں نے 13 گیت کمپوز کیے۔ 1954 میں فلم 'مرزا غالب' میں رول ادا کیا۔ اس فلم پر ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت نہرو نے تبصرہ کیا تھا۔'' آپ نے فلم کے ذریعے مرزا غالب کو زندہ کر دیا۔'' ثریا کی وفات 31 جنوری 2004، ممبئی میں 74 سال کی عمر میں ہوئی۔

آیئے ایک نظر ڈالتے ہیں لتا کے تقریباً ساڑھے چھ دہائی پر محیط ہندی فلموں کے سفر پر جس سے آپ اس بات کا بخوبی اندازہ کرسکیں گے کہ لتا نے اس طویل سفر کے دوران کس طرح اردو زبان کو ایک نئی جہت بخشی ہے۔ 1948 میں لتا اپنے فلمی سفر کا آغاز کرتی ہیں۔ 1948 میں انھوں نے فلم ساز غلام حیدر کی فلم مجبور کے لیے نغمہ گائے۔ اِس فلم میں 'دل میرا توڑا' جیسا نغمہ بے حد مقبول ہوا۔

1949 میں فلم 'محل' اور 'انداز' منظر عام پر آئیں اور وہ اپنے ہمعصروں بالخصوص شمشاد بیگم اور امیر بائی کرناٹکی جیسی صف اوّل کی گلوکاراؤں میں شمار ہونے لگیں۔

1950-60 بلبل ہند لتا منگیشکر کے کیریئر کا یہ اہم موڑ ہے اس دہائی میں انھوں نے ہندی سنیما میں ایک منفرد مقام بنایا۔ یہ مقام ایسا تھا کہ ہر بڑے سے بڑا ڈائریکٹر اور فلم ساز لتا کو ہی اپنی فلموں کے لیے ترجیح دیتا۔ اس عہد میں انھوں نے راگ پر مبنی گانے گائے بیجو باورا، مغل اعظم اس سلسلے کی اہم ترین فلمیں ہیں اور ان فلموں کو شاہکار بنانے میں لتا کی آواز کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اس عہد میں لتا کو متعدد فلم فیئر اور قومی ایوارڈز سے سرفراز کیا گیا۔

80 کی دہائی آتے آتے شنکر جے کشن، نوشاد، ایس ڈی برمن، مدن موہن، سی رام چندر، ہیمنت کمار، سلیل چودھری، خیام، روی، اور سجاد حسین کے ساتھ موسیقی کے میدان میں دوسری نسل میدان میں آچکی تھی۔ اب لکشمی کانت پیارے لال، آر ڈی برمن، کلیان جی آنند جی، جیسے موسیقار آچکے تھے اور لتا نے ان بڑے موسیقاروں کے ساتھ بھی اپنی آواز کے جادو کو برقرار رکھا۔

کہتے ہیں 1962 میں ہند چین جنگ کے دوران لتا نے جب 'اے میرے وطن کے لوگو ذرا آنکھ میں بھر لو پانی' جیسا حب الوطنی اور قوم کو بیدار کردینے والا نغمہ گایا تو نہرو جی نے ان کے اس نغمے پر کہا تھا کہ بیٹی تو نے مجھے رلا دیا۔

90 کی دہائی میں لتا کی عمر بڑھ رہی تھی لیکن آواز کی جادوگری برقرار تھی اور ان کی آواز نئے گلوکاروں اور گلوکاراؤں کے سامنے مدھم نہ پڑی بلکہ سب نے انھیں فن گلوکاری کی ملکہ تسلیم کیا۔ مینا کماری سے لے کر ہیما مالنی، سری دیوی، مادھوری دیکشت سے لے کر آج کی مقبول ترین اداکاراؤں کو لتا نے آواز دی اور انھیں مقبول بنا دیا۔ لتا نے ایک ہزار سے زائد فلموں میں گانے گائے اور سب سے زیادہ انھوں نے محمد رفیع کے ساتھ گائے، گویا رفیع اور لتا کی جوڑی نے فلم انڈسٹری میں ایک تاریخ رقم کی ہے۔ رفیع کے بعد لتا نے کشور کمار کے ساتھ سب سے زیادہ 327 نغمے گائے، جب کہ مکیش کے ساتھ 161 گانے گائے، اسی طرح منا ڈے، مہندر کپور، طلعت محمود، ہیمنت کمار، سی رام چندر، سریش واڈیکر، امت کمار، نتن مکیش، شبیر کمار، محمد عزیز کے علاوہ درجنوں گلوکار کے ساتھ انھوں نے گانے گائے۔ گائیکی کے اِس لمبے سفر میں انھوں نے اردو زبان وادب کو بھی ایک نئی جہت اور جلا بخشی۔ لتا کا یہ طویل سفر اردو دوستی کی بہترین مثال ہے۔ مثال اس بات کی بھی کہ اردو کسی مخصوص فرقے کی زبان نہیں اس لیے لتا کی شخصیت غیر اردو داں کے لیے باعث تحریک بھی ہے، لتا کی اردو دوستی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ ہر مذہب کو ہر زبان کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے اردو زبان کو کسی مذہب سے جوڑ کر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔

■

Qasim Ansari,F-105, 2nd Flr. Street4, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

> 90 کی دھائی میں لتا کی عمر بڑھ رہی تھی لیکن آواز کی جادوگری برقرار تھی اور ان کی آواز نئے گلوکاروں اور گلوکاراؤں کے سامنے مدھم نہ پڑی بلکه سب نے انھیں فن گلوکاری کی ملکه تسلیم کیا۔ میناکماری سے لے کر ہیما مالنی، سری دیوی، مادھوری دیکشت سے لے کر آج کی مقبول ترین اداکاراؤں کو لتا نے آواز دی اور انھیں مقبول بنا دیا۔ لتا نے ایک ہزار سے زائد فلموں میں گانے گائے اور سب سے زیادہ انھوں نے محمد رفیع کے ساتھ گائے، گویا رفیع اور لتا کی جوڑی نے فلم انڈسٹری میں ایک تاریخ رقم کی ھے۔

آشا بھونسلے

لتا منگیشکر کی چھوٹی بہن آشا بھونسلے 8 ستمبر 1933 کو سانگلی، مہاراشٹر میں پیدا ہوئیں۔ ان کا پیدائشی نام آشا منگیشکر تھا۔ ان کے والد دینا ناتھ منگیشکر اداکار کے ساتھ گلوکار بھی تھے۔ ان کو اپنے والد کے ذریعے سنگیت کی تعلیم حاصل ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد یہ لوگ پہلے پونے کولہاپور اور بعد میں ممبئی آ گئے اور 1943 میں مراٹھی فلم ماجھا بال میں نغمے گائے۔ 1948 میں انھوں نے ہندی فلم چنریا کے لیے نغمہ ساون آیا، گایا۔ پوپ میوزک، لوک سنگیت، اور ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں انھیں دسترس حاصل ہے۔ انھوں نے گیت، غزل، بھجن، قوالی، علاقائی گیت تقریباً 14 زبانوں میں گائے جن کی تعداد بارہ ہزار سے زائد ہے۔ ان کی کامیاب فلموں میں نیا دور، تیسری منزل، امراؤ جان، رنگیلا جیسی سیکڑوں فلمیں شامل ہیں۔ انھوں نے تقریباً سبھی موسیقاروں کے لیے گانے گائے ہیں جن میں او پی نیئر، خیام، سچن دیو برمن، اے آر رحمن اور آر ڈی برمن بطور خاص شامل ہیں۔ آر ڈی برمن سے ان کی دوسری شادی بھی ہوئی جو انھیں بطور گلوکارہ بے حد پسند کرتے تھے۔ انھیں بہت سے انعامات واعزازت دیے گئے جن میں فلم فیئر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، نیشنل فلم ایوارڈ، دی فریڈی مرکری ایوارڈ، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ، گریمی ایوارڈ اور پدم وبھوشن شامل ہیں۔

الکا یاگنک

لتا منگیشکر کے بعد فلمی نغموں میں خاص جگہ بنانے والی الکا یاگنک 20 مارچ 1966 کو کولکاتا میں ایک گجراتی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ شوبھا یاگنک بھی گلوکارہ تھیں۔ الکا نے 6 سال کی عمر میں ہی کلکتہ ریڈیو کے لیے گانا شروع کر دیا تھا۔ 10 سال کی عمر میں وہ ممبئی منتقل ہوگئیں اور وہیں سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوئیں۔ الکا زیادہ تر ہندوستانی سنیما کی فلموں کے لیے گاتی ہیں۔ وہ اب تک سات مرتبہ فلم فیئر اعزاز برائے پس پردہ گلوکارہ جیت چکی ہیں۔ اب تک تقریباً 700 فلموں کے لیے انھوں نے گیت گائے ہیں۔

اس مضمون کے ساتھ دیے گئے مختلف شخصیتوں کے سوانحی کوائف 'اردو دنیا' کے ادارتی شعبے کی ٹیم نے مختلف ذرائع سے ملنے والے حوالوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ ادارہ

ہندوستانی سنیما کا شہنشاہ

زبیر رضوی

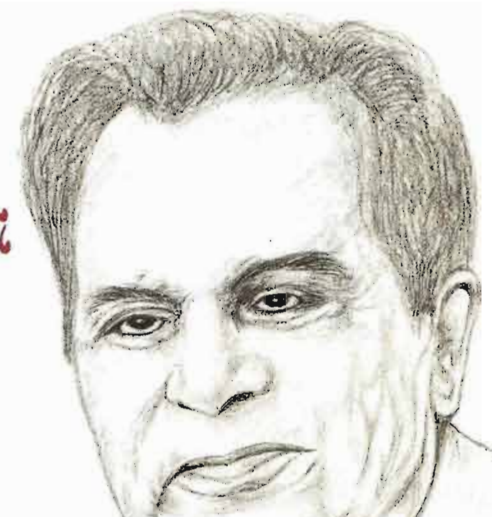

آزادی کے بعد کی تین دہائیوں میں بننے والی کامیاب فلموں کی فہرست پر نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ اِس عہد کو ہندوستانی فلم سازی کا 'سنہرا دور' کیوں کہا جاتا ہے تو اِس عہد پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ تاثر مل جاتا ہے کہ فلم سازی کی مذکورہ تین دہائیوں میں نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ کامیاب فلمیں بنیں بلکہ یہ دور ہدایت کاروں، اداکاروں اور سنگیت کاروں کے اعتبار سے ان لوگوں اور فنکاروں کا دور تھا جو اپنی ذہانتوں اور صلاحیتوں کی بنا پر فلمی صنعت کی آبرو تھے۔ اس عہد میں اگر ہدایت کاروں میں کے آصف، محبوب خاں، گرودت، وی شانتا رام، بمل رائے، نیتن بوس کامیاب ترین فلمیں بنا رہے تھے تو اِس دور میں دلیپ کمار، راج کپور اور دیوآنند جیسے اداکار، مینا کماری، نرگس، وحیدہ رحمٰن، نوتن، مدھوبالا، وجینتی مالا، گیتا بالی، نمی، نلنی جیونت جیسی اداکاراؤں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ دور دلیپ، راج اور دیو کے عروج اور ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کا انتہائی زرخیز اور شاداب دور تھا تو انھی کے متوازی راجندر کمار، سنیل دت، راجیش کھنہ، دھرمیندر، شمی اور ششی کپور، بھارت بھوشن اور جوئے مکرجی اور امیتابھ جیسے نئے اداکار بھی تھے (امیتابھ نے 1969 میں خواجہ احمد عباس کی فلم سات ہندوستانی سے فلمی دنیا میں اپنی آمد درج کرائی تھی) نوشاد، ایس ڈی برمن اور روی فلموں کی خوبصورت دھنیں بنا رہے تھے اور فلمی موسیقی ایک نئی انگڑائی لے کر فلموں کے آئینوں سے جھانک رہی تھی اسی سنہرے دور کی تیسری دہائی کے ختم پر پہلے سپر اسٹار کا گلیمر بھی بالی ووڈ میں دَر آیا تھا اور راجیش کھنہ پہلے سپر اسٹار کے طور پر فلم بینوں کے بے حد ہردلعزیز ہیرو بنے ہوئے تھے۔

اگر سنہری دور میں کلاسک کا درجہ پانے والی فلموں کی بات کی جائے تو فلموں کے ناموں کے ساتھ ساتھ ان اداکاروں کے نام بھی حافظے میں چمک اٹھتے ہیں جن کی غیر معمولی اداکاری نے دو درجن سے زائد فلموں کو ہماری فلمی تاریخ کا ایک اٹوٹ حصہ بنا دیا تھا ایسے اداکاروں میں پھر ایک بار ہمیں دلیپ کمار، دیوآنند اور راج کپور کا نام لینا ہوگا یہاں چونکہ ہماری نگاہیں دلیپ کمار پر مرکوز ہیں اس لیے ہم انھی کے پچاس سالہ فلمی کیریئر کے بارے میں 'اردو دنیا' کے پڑھنے والوں کو باخبر کرنا ضروری سمجھتے ہیں فلمی تاریخ کا وہ سنہری دور کہ جس کے ذکر سے ہم نے اِس مضمون کا آغاز کیا ہے دراصل دلیپ، راج اور دیوآنند کا ہی دور تھا اُن کی فلمیں، اپنی مقبولیت کے نئے نئے ریکارڈ بنا رہی تھیں ان تین دہوں میں سب سے زیادہ جس اداکار کی فلمیں ریلیز ہوئیں اور فلم تبصرہ نگاروں کی توجہ کا مرکز بنیں وہ اداکار دیوآنند ہے۔ مگر دلیپ کمار کی 'مغل اعظم' اور راج کپور کی فلم 'آوارہ' جیسی کلاسک کا درجہ پانے والی فلم دیوآنند کے نگارخانے میں آویزاں نظر آتی ہے تو ان کی فلم 'گائیڈ' ہے دلیپ کمار نے نصف صدی پہ محیط اپنے فلمی کیریئر میں کوئی 57 فلمیں کیں جب کہ دیوآنند اپنے نصف صدی سے زائد کے فلمی کیریئر میں دلیپ کمار سے کئی گنا زیادہ فلموں میں کام کرنے کا

پرتھوی راج کپور

پرتھوی راج کپور ہندوستانی سنیما کی ان معدودے چند شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے خاموش فلموں میں بھی شہرت حاصل کی اور بولتی فلموں میں اس مقبولیت کو قائم رکھا۔ 3 نومبر 1906 کو وہ لائل پور (اب فیصل آباد، پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ کئی خاموش فلموں میں کام کرنے کے بعد پرتھوی راج کپور نے برصغیر کی پہلی بولتی فلم عالم آرا میں بھی کام کیا۔ خاموش اور بولتی فلموں کے اس اداکار نے فلمی دنیا میں چند ایسے یادگار کردار ادا کیے جنھیں فلمی ناظرین کبھی بھلا ہی نہیں سکتے لیکن پرتھوی کو فلموں سے زیادہ تھیٹر سے بہت لگاؤ تھا اور اس کے لیے انھوں نے 1944 میں اپنا چلتا پھرتا تھیٹر گروپ قائم کیا۔ پرتھوی راج کپور نے اپنی فلموں میں تھیٹر کے فن کو آزمایا۔ ان کی آواز کی گھن گرج اگر ان کے تھیٹر کے فن میں کام آئی تو وہیں فلم مغل اعظم میں ان کی آواز اس فلم کا اہم حصہ بنی اور وہ کردار ان کی بھاری بھرکم شخصیت اور گرج دار آواز کی وجہ سے زندہ جاوید بن گیا۔ عالم آرا، ودیا پتی، سکندر، اشارہ، آوارہ، آنند مٹھ، پردیسی، مغل اعظم، زندگی، جانور، سکندر اعظم، ہیر رانجھا، اور کل آج اور کل ان کی اہم فلمیں۔ 29 مئی 1972 کو ان کا انتقال ہوا۔ انھیں ان کی زندگی میں سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ، پدم بھوشن اور 8 سال تک راجیہ سبھا کی رکنیت سے نوازا گیا۔ بعد از مرگ انھیں حکومت نے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دیا۔

دیوآنند

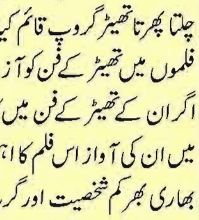

ہندوستانی سنیما کے مشہور اداکار دھرم دیو پشوری مل آنند جو پورے ملک میں دیوانند کے نام سے مشہور ہوئے، ممبئی کی فلمی دنیا کے اہم ترین خاندانوں میں شمار ہونے والے آنند خاندان کے منجھلے رکن تھے۔ ان کے بڑے بھائی چیتن آنند اور چھوٹے بھائی وجے آنند نے بطور ہدایت کار ہندوستانی سنیما کو کئی بہترین فلمیں دیں۔ 26 ستمبر 1923 کو پنجاب کے ضلع گرداس پور میں پیدا ہوئے۔ فلموں کا شوق انھیں ممبئی لے آیا۔ کافی جدوجہد کے بعد

ریکارڈ بنا چکے تھے۔ دلیپ کمار کی نصف صدی میں بننے والی فلموں میں جن فلموں کو فلم بین آج بھی نہیں بھولے وہ چاہے ان کی فلموں کے Retrospective شوز ہوں یا پھر کسی خاص موقعوں پر ان کی اسکریننگ جن فلموں کے دیکھنے کے لیے لوگ بے تاب ہو اٹھتے ہیں وہ انھی تین دہائیوں میں بنی ہیں جنھیں ہم 'سنہری دور' کا نام دیتے آرہے ہیں۔ ایسی کچھ فلمیں ہیں مغل اعظم (1960)، گنگا جمنا (1961)، رام اور شیام (1967)، لیڈر (1964)، دیدار (1951)، آن (1952)، داغ، امر (1954)، دیوداس، آدمی، شہید، گوپی وغیرہ

فلم 'بیراگ' کی نمائش ہونے کے بعد جب میں نے لگا تار تین سال کے تعاقب کے بعد دلیپ کمار کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا تھا تو میں نے ان کے پورے فلمی کیریئر کے سارے نشیب و فراز اپنے حافظے میں محفوظ کر لیے تھے۔ ایک بار اداکار موتی لال نے جنھیں دلیپ کمار، موتی بھائی پکارا کرتے تھے، دلیپ کمار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ خود پر کسی مخصوص طرز کے کردار کرنے کی چھاپ نہ لگنے دیں ان کے کردار اور اداکاری میں جتنا تنوع ہوگا وہ اتنے ہی زیادہ کامیاب اداکار تسلیم کیے جائیں گے لیکن ان کے چاہنے والے یہ چاہتے تھے کہ وہ عاشق کے روپ میں اسکرین پر جیتے رہیں میرے ساتھ اپنے ریڈیو انٹرویو میں دلیپ کمار نے کہا تھا ''ہاں، کچھ لوگ چاہتے رہے ہیں کہ میں صرف المیہ اور سنجیدہ کردار ہی کرتا رہوں لیکن دوسری طرف میرے ایسے پرستار بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ میں کوہ نور، رام اور شیام، آزاد اور شبنم، جیسی فلموں کے کردار ہی کرتا رہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ دلیپ کمار نے نہ المیہ اور سنجیدہ کردار کرنے سے گریز کیا اور نہ ہی انھوں نے کامیڈی اور دوسری طرز کے کردار کرنے سے گریز کیا انھوں نے بمل رائے کی ہدایت میں دوبار پہلے بن چکی فلم 'دیوداس' میں مرکزی کردار کرنے کی ہامی بھر لی اور فلم کو پہلی دو فلموں سے کہیں زیادہ مقبول بنایا 'دیوداس' کی مثالی مقبولیت کے کوئی تین سال بعد دلیپ نے 1958 میں بمل رائے کی ہدایت میں 'مدھومتی' جیسی رومانی فلم میں کام کیا اور اُس کا ایک گانا 'سہانا سفر اور یہ موسم حسیں' کو اس طرح اسکرین پر گایا کہ وہ نوجوان دلوں کا محبوب ترین نغمہ بن گیا تھا اسے دلیپ نے ایک ایسے سرشار موڈ میں گایا کہ وہ سچ مچ دلیپ کا گایا اپنا نغمہ بن گیا۔ فلم مدھومتی کے آس پاس کا زمانہ تھا کہ دلیپ کو ایک تاریخ اور کاسٹیوم فلم 'مغل اعظم' میں بادشاہ وقت اکبر کے بیٹے، شاہزادے سلیم کا کردار ادا کرنا پڑا جو دلیپ کی اداکارانہ صلاحیتوں کا Turning پوائنٹ بن گیا۔ اس کے مکالمے بڑی پر تکلف اور لطیف اردو میں تھے مغل اعظم کے بعد دلیپ کمار گنگا جمنا کے سیٹ پر تھے جس میں ان کا کردار ایک دیہاتی نوجوان کا تھا بقول دلیپ:

''اگر میں مغل اعظم میں شہزادہ سلیم کا پر تمکنت کردار ادا کرنے یا پھر گنگا جمنا کے دیہاتی کے سادہ سے کردار کو اطمینان بخش انداز میں ادا نہ کر پاتا تو اس کا نہ صرف دونوں فلموں پر خود میرے فلمی کیریئر پر منفی اثر پڑتا دلیپ نے پہلی بار جس فلم کے حوالے سے ہندوستانی عوام سے اپنی اداکاری کی جی بھر کے داد پائی تھی وہ ان کی فلم 'شہید' تھی آزادی کی جنگ کے پس منظر میں بنی اس فلم نے دلیپ کو ہندوستانی نوجوانوں کے لیے ایک آدرش اداکار بنا دیا۔ یہ کردار لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا نیتن بوس کی ہدایت میں بنی فلم 'ملن' دلیپ کی ایک ایسی رومانی فلم تھی جس نے انھیں نوجوانوں کا محبوب ہیرو بنا دیا محبوب کی فلم 'انداز' میں دلیپ نرگس کے ایک ایسے ناکام خاموش عاشق بنتے ہیں جو عاشق دلیپ کو دوست کا درجہ دیتی ہے مگر اس کا شوہر راج کپور اسے یہ کہہ کر عدالت میں سنگسار کرتا ہے ''یہ ہے تمھاری سوسائٹی کی وہ زندہ تصویر جو اپنے پتی کے دلاسے کے لیے اپنے پریمی کو دوست کے نام سے پکارتی ہے۔''

رومانس کی ان فلمی فضاؤں سے باہر نکلنے کی پہلی کوشش دلیپ نے فلم 'آن' سے کی تھی اُس وقت دلیپ کو سب سے بڑا ڈر یہ تھا کہ کہیں یہ پہلا اس قدر شوخ اور مزاحیہ کردار ان کے فلمی کیریئر کے لیے خطرہ نہ بن جائے لیکن دلیپ کا یہ ڈر اُس وقت دور ہو گیا جب انھوں نے لگاتار، رام اور شیام، کوہ نور، شبنم اور آزاد جیسی فلموں کو عوام میں غیر معمولی مقبول ہوتے پایا اپنی فلموں کے وہ کردار جو بالآخر فلم میں جیتے جیتے مرجاتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے دلیپ ہنس پڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کئی فلموں میں میری اتنی بار موت ہوئی ہے کہ کسی فلم میں اگر میری موت نہیں ہوتی تو ڈسٹری بیوٹر موت کے سین کے لیے اصرار کرتا ہے کیونکہ دلیپ کی موت نہ دکھائی جاتی تو فلم کی کامیابی مشکوک ہونے لگتی۔ بقول دلیپ کمار فلموں میں اتنی دفعہ میری موت ہوئی ہے کہ اب مجھے بھی نہیں پتہ کہ اگلی فلم میں میرے مرنے کا سبب کیا ہوگا۔ بنگالی ہدایت کار تپن سنہا نے فلم 'سگینہ مہاتو' میں بنگالی اسکرین کے مقبول اداکار اُتم کمار کے بجائے دلیپ کمار کو لیا تو لوگوں کا خیال تھا کہ دلیپ اس بنگلہ کہانی کے لیے صحیح انتخاب نہ ہوں گے لیکن فلم ریلیز ہوئی اور اُسے اتم کمار نے بھی

1946 میں پربھات ٹاکیز کی فلم 'ہم ایک ہیں' کے ذریعے وہ پردے پر نظر آئے۔ ان کی پہلی کامیاب فلم ضدی تھی۔ اداکارہ ثریا کے ساتھ دیوآنند نے سات فلموں میں کام کیا، ان میں ودیا، شیر، افسر، برہا کی رات، نیلی، دو ستارے اور صنم شامل ہیں، یہ ساری فلمیں باکس آفس پر کامیاب رہیں۔ 1950 میں ان کی پراسرار یا ہلکی مزاحیہ پریم کہانیاں یا معاشرہ پر مبنی فلمیں پردہ پر اتریں جن میں ایک کے بعد ایک اور فنتوش شامل ہیں۔ 1950 کی دہائی کے بقیہ حصے میں دیو نے لگاتار کئی کامیاب فلموں میں نئی اداکارہ وحیدہ رحمٰن کے ساتھ کام کیا، ان فلموں میں سی آئی ڈی اور سولہواں سال شامل ہیں۔ 1955 میں انسانیت فلم میں دیو کو دلیپ کمار کے ساتھ اداکاری کرنے کا موقع ملا۔ دیو آنند نے اپنی کمپنی نوکیتن کی شروعات کی جس نے 2011 تک 35 فلمیں پیش کیں۔ فلم 'پریم پجاری' سے دیوانند نے ہدایت کاری میں قدم رکھا اور کل ملا کر 17 فلمیں ڈائریکٹ کیں لیکن ان میں سے ہرے راما ہرے کرشنا اور دیس پردیس کے علاوہ کوئی فلم باکس آفس پر ہٹ نہیں ہوسکی۔ 1958 کی فلم کالا پانی کے لیے دیو نے اپنا پہلا فلم فیئر اعزاز برائے بہترین اداکاری حاصل کیا۔ 2011 میں انھیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ 3 دسمبر 2011 کو لندن میں ان کا انتقال ہوا۔

جانی واکر

ہندوستانی سینما کے مزاحیہ اداکاروں میں یعقوب، گوپ اور بھگوان سے لے کر محمود اور مقری تک کئی اداکاروں نے مقبولیت کے پرچم لہرائے، مگر جانی واکر ان سب میں ایک جداگانہ حیثیت اور اسلوب کے مالک تھے۔ وہ 11 نومبر 1923 کو مدھیہ پردیش کے ضلع اندور میں پیدا ہوئے۔ اصل نام بدرالدین قاضی تھا۔ پہلی مرتبہ ہندوستان کے مشہور ہدایت کار اور اداکار گرودت کی فلم 'بازی' میں بحیثیت اداکار متعارف ہوئے۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر گرودت انھیں 'بازی' میں موقع نہ دیتے تو ان کی تقدیر میں صرف بس کنڈکٹر ہی بننا لکھا ہوتا۔ 40 سال تک 300 سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ انھوں نے سی آئی ڈی، میرے محبوب، پیاسا اور نیا دور جیسی مقبول فلموں میں اداکاری کے علاوہ خود بھی کئی فلمیں بنائیں جن میں وائٹیڈ

دیکھا تو اس نے پتن سنہا سے کہا تھا ''پتن دا خدا کا شکر ہے کہ تم نے مجھے سگینہ کا رول نہ دے کر وہ رول دلیپ کمار کو دیا کیونکہ میں ویسا نہ کر پاتا اچھا ہوا تم غلط انتخاب کرنے سے بچ گئے۔''

اداکار انوپم کھیر جو بچپن میں دلیپ کمار بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے لکھتے ہیں کہ انھوں نے فلم گنگا جمنا تیرہ بار دیکھی تھی کیونکہ یہی ایک ایسی فلم تھی جس نے انوپم کھیر کو احساس کرایا کہ ایکٹنگ کیا ہوتی ہے چار فلموں، کرما، عزت دار، قانون اپنا اپنا اور سوداگر میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے والے انوپم کھیر نے سوداگر فلم کی شوٹنگ کے موقع پر اسٹوڈیو میں دلیپ کی آمد کا نقشہ، کچھ اس طرح کھینچا ہے:

''میں اُس دن سیٹ پر ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گیا تھا اور بار بار اپنی لائنیں یاد کر رہا تھا میرے ہونٹوں سے ہنسی غائب تھی مجھے بھوک کا احساس بھی ہو رہا تھا اور میری نگاہیں مسلسل مین دروازے پر لگی تھیں میں اُس وقت اپنے حافظے میں دیوداس، کوہِ نور، مدھومتی، رام اور شیام اور مغل اعظم کو جتنا کھرچتا جا رہا تھا یہ سب مجھے اتنا ہی یاد آتے جا رہے تھے پھر گیٹ کھلا اور ایک مرسیڈیز اسٹوڈیو میں داخل ہوئی سیٹ پر خاموشی چھا گئی پھر سلوموشن میں سین لیا گیا وہ بڑا آدمی مہربانی، نرمی اور گرم جوشی کا مرقع بنا ہوا تھا میں فرطِ عقیدت سے ان کے قدموں کی طرف جھک گیا میرا تاثر یہ تھا کہ دلیپ آج بھی اور کل بھی آنے والی نسلوں کے احترام کے حقدار بنے رہیں گے۔''

14 دسمبر 1924 کو پشاور میں ایک تجارت کرنے والے گھر میں پیدا ہونے والے دلیپ کمار (یوسف خاں) اب 89 برس کے ہو رہے ہیں دلیپ اپنی فلموں کے پسندیدہ ہدایت کاروں کے نام لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ امیہ چکرورتی، نتن بوس، بمل رائے، ضیا سرحدی، کے آصف اور محبوب خان ان کے حافظے میں محفوظ رہنے والے ہدایت کار ہیں انھوں نے اپنے معاصر اداکاروں راج کپور اور دیوآنند کے بارے میں کہا کہ ہم تینوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام تھا پیشہ ورانہ رقابت کے بجائے انسانی زندگی کے رموز و نکات اس کے غم اور خوشی، کامیابیوں اور ناکامیوں کو اپنی اداکاری کے ذریعے فلم بین طبقے تک پہنچانے کا جذبہ بڑا مضبوط تھا۔ دلیپ کہتے ہیں ہم نے جو کچھ بھی عزت اور شہرت پائی وہ اپنے میرٹ پر پائی کسی تشہیری gimmicks کے بل پر نہیں ان کے خیال میں راج کپور کا کام فلم گوپی ناتھ، جاگتے رہو اور تیری قسم میں ناقابل فراموش تھا۔ دیوآنند کے بارے میں اور ملزم شامل ہیں۔ ان پر فلمائے گئے بہت سے گانے آج تک مشہور ہیں جن میں 'سر جو میرا چکرائے، یہ ہے بمبے میری جان، میں بمبئی کا بابو وغیرہ شامل ہیں۔ 80 کی دہائی میں انھوں نے اس وقت کی فلموں سے اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے فلموں کو خیر باد کہہ دیا تھا لیکن 90 کے عشرے میں وہ آخری بار پھر فلم 'چچی 420' میں ایک چھوٹے سے کردار میں آئے۔ 29 جولائی 2003 کو ممبئی میں انھوں نے 80 برس کی عمر میں وفات پائی۔

راج کپور

موضوع، مقصد، تکنیک اور پیش کش کے لحاظ سے ہندی اردو سنیما کو قومی سنیما کا درجہ دلانے اور موسیقی کو ہندوستانی فلموں کا جزو لاینفک بنانے میں ہندوستانی سنیما کے پہلے 'شومین' راج کپور کا بڑا ہاتھ تھا۔ راج کپور کی پیدائش 14 دسمبر 1924 کو پشاور میں ہوئی۔ والد پرتھوی راج کپور تھے۔ راج کپور نے پہلی دفعہ اپنی فلم آگ 1948 میں بنائی۔ اس کے بعد ان کی اہم فلموں میں برسات، چوری چوری، جاگتے رہو، میرا نام جوکر، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، سنگم، ستیم شیوم سندرم، پریم روگ، بوٹ پالش، گوپی چند جاسوس وغیرہ ہیں۔ 2 مئی 1988 کو وہ فلموں کا اعلیٰ ترین دادا صاحب پھالکے ایوارڈ لینے کے لیے دہلی آئے لیکن دمے کے اچانک دورے کے سبب اسٹیج پر آ کر اپنا ایوارڈ وصول نہ کر سکے۔ 2 جون 1988 کو ہندوستانی فلموں کی یہ اہم شخصیت ہم سے رخصت ہوگئی۔ راج کپور صاحب کو نو مرتبہ فلم فیئر، ان کی فلم بوٹ پالش اور آوارہ کے لیے کان فلم فیسٹول میں پالم ڈی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ جاگتے رہو فلم کے لیے کارلووی وری انٹرنیشنل فلم فیسٹول میں کرسٹل گلوب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1971 میں راج کپور کو پدم بھوشن سے سرفراز کیا گیا۔ انھیں دادا صاحب پھالکے، اسٹار ڈسٹ ایوارڈ، اسٹار اسکرین ایوارڈ سے نوازا گیا۔

سنیل دت

ہندوستانی فلموں میں شریف آدمی کی امیج رکھنے والے سنیل دت نے جنوبی ایشیا کے سب سے قدیم ریڈیو اسٹیشن، ریڈیو سیلون کے اناؤنسر کے طور پر اپنا کیریئر شروع کیا، 1955 سے فلموں میں آئے۔ سنیل دت 6 جون 1929 کو پاکستان کے شہر جہلم میں پیدا ہوئے۔ تقسیم وطن کے ہندو مسلم فسادات میں ایک مسلمان یعقوب نے ان کے خاندان کو قتل عام سے بچایا۔ ہریانہ کے شہر یمنا نگر میں رہنے کے بعد وہ ممبئی چلے آئے اور پھر فلموں میں آ کر اپنی اداکاری کا لوہا منوایا۔ اجنتا آرٹس کے نام سے اپنی فلم کمپنی بھی کھولی اور مجھے جینے دو، یہ راستے ہیں پیار کے، ریشماں اور شیرا کے ساتھ یادیں جیسی فلم بھی بنائی جو صرف ایک اداکار (خود سنیل دت) کو لے کر فلمائی گئی۔ ان کی آخری فلم منا بھائی ایم بی بی ایس تھی۔ فلم میں کامیاب اداکار ہونے کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لیا اور اس میدان میں بھی انھوں نے مثال قائم کر دی۔ پانچ مرتبہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔ منموہن سنگھ حکومت میں کھیل کے مرکزی وزیر رہے۔ دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا۔ سنیل دت نے اپنے وقت کی معروف اداکارہ نرگس سے شادی کی تھی۔ ان کے بیٹے سنجے دت بھی ہندوستانی سنیما کے مشہور اداکار ہیں۔ سنیل دت کی اہم اور مقبول فلموں میں، غزل، چھایا، مدر انڈیا، ایک ہی راستہ، سادھنا، ہمراز، میں چپ رہوں گی، وقت، گمراہ، بیٹی بیٹے، ملن، مہربان، خاندان وغیرہ شامل ہیں۔

امیتابھ بچن

بگ بی کے نام سے مشہور امیتابھ بچن بلا شبہ ہندوستانی سنیما کے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت پانے والے اداکاروں میں سے ایک ہیں۔ بی بی سی نے انھیں اپنے سروے میں اسٹار آف ملینیم کا خطاب دیا ہے۔ امیتابھ کی پیدائش 11 اکتوبر 1942 کو الہ باد، اتر پردیش میں ہوئی۔ اصل نام امیتابھ شریواستو تھا۔ ان کے والد، ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن مشہور ہندی شاعر تھے اور والدہ تیجی بچن فیصل آباد (حالیہ پاکستان میں) کے ایک سکھ گھرانے سے تھیں۔ بچپن میں امیتابھ کا نام انقلاب تھا جو انقلاب زندہ باد کے نعرے سے متاثر ہو کر رکھا گیا تھا کیونکہ اس وقت ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی، بعد میں ان کا نام بدل کر امیتابھ رکھا گیا جس کے معنی ہمیشہ رہنے والی روشنی کے ہیں۔ بیس سال کی عمر میں کلکتہ میں نوکری کی پھر نوکری

دلیپ کمار کا کہنا تھا کہ وہ ہندوستانی سنیما اسکرین کے سب سے خوبصورت اداکار تھے، گائیڈ اور کالا پانی ان کی یادگار فلمیں ہیں اپنی پسندیدہ اداکارہ کا ذکر کرتے ہوئے دلیپ کمار نے سچترا سین، مینا کماری، نرگس، نمی، وجینتی مالا، وحیدہ رحمان کو بہترین صلاحیتوں کی مالک اداکارائیں قرار دیا۔ انھوں نے سر چارلس Laughton، پال منی، مارلن برانڈو، رچرڈ برٹن، گریٹا گاربو، انگرڈ برگمین، کیتھرین ہیبرن کے نام لیتے ہوئے ان پر اپنی پسند کی مہر لگا دی انھوں نے اشوک کمار، موتی لال، بلراج ساہنی، اُتم کمار، شیواجی گنیش کے نام لیے اور اپنے بعد کی نئی نسل میں انھوں نے امیتابھ، شاہ رخ، عامر خاں اور اداکارہ تبو کے ہنر کو سراہا۔ دلیپ کمار، پدم بھوشن، پھالکے ایوارڈ، بہترین اداکار ایوارڈ، پاکستان کے نشانِ امتیاز جیسے اعزازات کے ملنے کو اپنی محنت اور اپنے پیشہ ورانہ اخلاص کا ثمرہ مانتے ہیں۔ ان کی پہلی فلم 'جوار بھاٹا' تھی جو 1944 میں ریلیز ہوئی اس کے بعد چھ دہائیوں پر پھیلے اپنے فلمی کیریئر کے وقفے میں دلیپ نے 57 فلموں میں کام کیا۔ نیلنی جیونت، کامنی کوشل، مدھوبالا، مینا کماری، نمی، نرگس، نوتن، ریکھا، وحیدہ رحمان نے ان فلموں میں دلیپ کی ہیروئن کے طور پر کام کیا۔ دلیپ کے ساتھ سب سے زیادہ فلموں میں وجینتی مالا نے کام کیا تھا سائرہ بانو کے ساتھ چار فلموں میں کام کرنے کے بعد اس کم عمر اور خوبصورت اداکارہ کے ساتھ دلیپ کا شادی کرنے کا فیصلہ کسی دھماکے سے کم نہ تھا، دھماکہ تو اُس وقت بھی ہوا تھا جب انھوں نے اولاد کی خاطر حیدر آباد کی ایک حسینہ اسما سے شادی رچا لی تھی اور اولاد نہ ہونے پر اسما کو طلاق دے دی تھی۔ آٹھ بار بہترین اداکار فلم فیئر ایوارڈ پانے والے دلیپ کمار نے اپنے پورے فلمی کیریئر میں اپنی پیشہ ورانہ شہرت اور توقیر کو کبھی مٹ میلا نہیں ہونے دیا وہ جس سنہری دور کی یادگار تھے اور اس کے گواہ بنے تھے وہ فلم، سنیما اور فلم بین کے ساتھ ایک اٹوٹ وابستگی کا دور تھا۔ دلیپ نے اپنے ساتھی اداکار راج کپور اور دیو آنند کی طرح اپنے مصروف اور غیر مصروف زمانے میں خود کو روپیہ کمانے اور مشتہرین کے ہاتھوں بے توقیر ہونے نہیں دیا اسی لیے انھوں نے اشتہاری Incentives سے خود کو دور رکھا اور زندگی کو بے حد رکھ رکھاؤ اور ایک ایسے ایکٹر کی طرح بلند رکھا جو حقیقی فنکاروں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے ان کے بعد کی نسل میں سپر اسٹار راجیش کھنہ، امیتابھ بچن اور شاہ رخ خاں نے اپنے نام اور کام سے دھوم مچائیں لیکن یہ اداکار فنکار کے بجائے ایک تفریح فراہم کرنے

چھوڑ دی تا کہ اداکاری کے سفر کو آگے بڑھا سکیں۔ انھیں ابتدائی مقبولیت 1970 میں فلم آنند سے ملی اور آج ان کا شمار ہندوستانی فلم صنعت کی تاریخ میں معروف ترین ہستیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی مشہور فلموں میں شعلے، زنجیر، امر اکبر اینتھونی، دیوار، کبھی کبھی، شکتی، چپکے چپکے، ڈان، سلسلہ، نمک حرام، مقدر کا سکندر، ترشول، بلیک، محبتیں وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے کئی بڑے ایوارڈ حاصل کیے جن میں تین نیشنل فلم ایوارڈ اور بارہ فلم فیئر ایوارڈ شامل ہیں۔ ان کو سب سے زیادہ بہترین اداکار کا اعزاز حاصل ہے۔ اداکاری کے علاوہ بچن گلوکاری، پیش کاری اور میزبانی بھی کرتے رہے ہیں۔ 1984 سے 1987 تک وہ ہندوستانی پارلیمان کے رکن منتخب ہوئے مگر بعد میں سیاست سے الگ ہو گئے۔

نصیر الدین شاہ

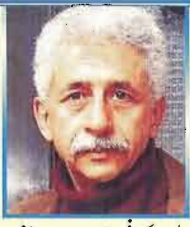

متوازی سنیما کے نام سے ابھرنے والے نئے ہندوستانی سنیما کی پہچان جن اداکاروں نے بنائی ان میں نصیرالدین شاہ صف اول کے فن کار ہیں، جنھوں نے شیام بینگل کی ابتدائی فلموں انکور، نشانت، منتھن میں مختصر رول نبھانے کے بعد 'البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے' میں پہلی بار کلیدی کردار نبھانے کے ساتھ فلمی سفر شروع کیا اور آج بھی وہ ہندوستانی سنیما کے معتبر محترم اور مصروف اداکار مانے جاتے ہیں، جنھیں ہالی ووڈ کی بھی کئی فلموں میں لیا جا چکا ہے۔ بارہ بنکی اتر پردیش میں 20 جولائی 1950 کو پیدا ہونے والے نصیرالدّین شاہ انیسویں صدی کے افغان جنگجو جان فشان خان کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ 1971 میں دہلی کے نیشنل اسکول آف ڈرامہ میں داخلہ لیا۔ نصیرالدّین شاہ کو ہندوستان کے بڑے پردے کے ساتھ ساتھ دیگر سنیما اسکرین پر بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے کئی بین الاقوامی فلموں میں بھی کام کیا جن میں لیگ آف ایکسٹرا آرڈنری جینٹلمین شامل ہے۔ ان کی مشہور فلموں میں آکروش، اسپرش، مرچ مصالحہ، البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے، تریکال، بھاونی بھوائی، جنون، موہن جوشی حاضر ہو، اردھ، ستیہ، کتھا، معصوم اور جانے بھی دو یارو شامل ہیں۔ انھوں نے کمرشیل فلموں میں بھی کام کیا جن میں غلامی، تری دیو، وشواآتما ہٹ ہوئیں۔ 1994 میں انھوں نے فلم موہرا میں منفی کردار ادا کیا، یہ ان کی سوویں فلم تھی۔ گلزار کے مشہور ٹیلی ویژن سیریل 'مرزا غالب' میں انھوں نے غالب کا رول ادا کیا تھا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ نصیرالدین کو متعدد ایوارڈ مل چکے ہیں جن میں پدم شری، پدم بھوشن، نیشنل فلم اعزازات برائے بہترین اداکار (تین مرتبہ) برائے بہترین معاون اداکار، اور فلم فیئر اعزاز برائے بہترین اداکار (تین مرتبہ) شامل ہیں۔

عرفان خان

سادگی کو فن میں تبدیل کرنے اور معمولی کو غیر معمولی بنا دینے کا ہنر جاننے والے عرفان خان نئے سنیما کے ساتھ آئے اور آج وہ کمرشیل فلموں کی بھی ضرورت بن گئے ہیں۔ عرفان خان، کا اصل نام صاحب زادہ عرفان علی خان ہے۔ جے پور کی مسلم نواب فیملی میں وہ 7 جنوری 1967 کو پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ سیدہ بیگم کا تعلق بھی ایک جاگیردار فیملی سے تھا۔ عرفان خان نے رائٹر سُتپا سکدر سے شادی کی ہے جو این ایس ڈی میں عرفان کی کلاس فیلو تھیں جہاں سے عرفان نے گریجویشن کیا ہے۔ عرفان، اسٹار ٹی وی اور دوردرشن کے کئی سیریلز میں کام کرنے کے بعد فلموں میں آئے اور داواریئر، مقبول، سلم ڈاگ ملینیئر بلو نیو یارک اور نیو یارک، آئی لو یوان کی اہم فلمیں ہیں، مختلف کمرشلز میں بھی عرفان خان نے اپنا جادو جگایا ہے، وہ فلم فیئر ایوارڈز اور ایک اسکرین ایکٹرگلڈ ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ 2003 میں عرفان نے رائٹر و ڈائریکٹر اسون کمار کی شارٹ فلم روڈ ٹو لداخ میں کام کیا اس فلم کو بھی انٹرنیشنل فیسٹیول میں پیش کیا گیا۔ اسی سال عرفان نے ایک کامیاب فلم مقبول میں بھی کام کیا اس فلم میں عرفان کا کردار مرکزی تھا اور یہ کردار شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ کے مرکزی کردار سے ماخوذ تھا۔ لیکن انھوں نے مختصر ترین کرداروں میں بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے آپ کو منوایا ہے۔ 2004 میں عرفان کو فلم حاصل کے لیے فلم فیئر بیسٹ ولن ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے۔ 2007 میں عرفان نے ایک ہٹ فلم میٹرو کے لیے فلم فیئر بیسٹ سپورٹنگ ایکٹر کا ایوارڈ بھی حاصل کیا اس کے علاوہ اسی دوران فلم دانیم سیک اور فلم پان

والے ایکٹر کے طور پر جانے گئے جب کہ دلیپ اور ان کے معاصر اداکاروں کا بنیادی کمٹمینٹ اپنے فن اور ہنر کے ساتھ تھا، رونق بازار کے ساتھ نہیں، تب ہی وہ خود اور ان کے معاصر راج کپور اور دیو آنند اپنے فنکارانہ امیج کے ساتھ اپنے اپنے فنی دائروں میں سربلند رہے۔ دلیپ کو محبوب خاں کی فلم 'مدر انڈیا' گرودت کی 'پیاسا' اور راج کپور کی فلم 'سنگم' میں کام کرنے سے انکار پر کوئی پچھتاوا نہیں رہا خاص طور سے اس لیے بھی کہ یہ فلمیں ان کے بغیر بھی بے حد کامیاب رہی تھیں۔

جب فلمی صنعت کے فطری اداکار موتی لال نے دلیپ کے 'ٹائپ' ہو جانے اور اپنے ہی بنائے حصار کے قیدی ہو جانے کے رویے پر نکتہ چینی کی تھی اور 'حصار' کو توڑنے کا مشورہ دیا تھا تو دلیپ نے موتی لال کے اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے شبنم اور آزاد جیسی فلمیں کیں گنگا جمنا میں انھوں نے ہندوستانی سینما کو پہلے سے بالکل مختلف دیہی جیون دیا اور اس کے دیہی ماحول میں رومانس کی کامیاب اور مثالی نیو رکھی۔ ان کے بارے میں یہ تجزیہ صحیح ہے کہ فلمی صنعت میں اپنے زمانے میں سب سے اوپر رہنے کے لیے دلیپ کمار اپنی فلموں کو ان گنت موضوعات دیتے رہے اور مقدور بھر ایک اداکار کے طور پر اپنے امیج کو ٹائپ ہونے کے الزام سے بچاتے رہے تھے۔

دلیپ کمار نے صفِ اول کے بنگالی ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا مگر خواہش کے باوجود وہ ستیہ جیت رے کے ساتھ کوئی فلم نہ کر سکے ستیہ جیت رے دلیپ کی بطور اداکار عزت کرتے تھے مگر وہ دلیپ کو Method Actor مانتے تھے جس سے دلیپ کمار کو اختلاف رہا۔ دلیپ کمار بنیادی طور پر متنوع ذہانتوں اور صلاحیتوں کے فنکار ہیں۔ گوونداؔ نے انھیں ہمیشہ اداکاری اور فنکاری کا ایک منفرد اسکول کہا دلیپ کمار کے بارے میں یہی سچ تھا کہ وہ ایک ایسا اسکول ہیں جس میں داخلے کی خواہش ہر آنے والے اداکار کا خواب رہا ہے۔

دلیپ کمار کے نقادوں نے اس بات کو بھی خاص ہوا دی تھی کہ وہ اپنے ہدایت کار کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں لیکن وہ ایسا ان ہدایت کاروں کے ساتھ کرتے ہیں جن کا مرتبہ محبوب خاں، کے آصف، بمل رائے جیسا نہیں ہے۔ دلیپ کے سوانح نگار اور ان کے فن کے پارکھ کہتے ہیں کہ دلیپ کے اِس رویے کو مداخلت کہنے کے بجائے اسے فلم کے ساتھ ان کی گہری وابستگی سمجھنا چاہیے دلیپ کمار کی جن دو فلموں کی ریلیز میں خاصی تاخیر ہوئی وہ سگینہ مہتو اور بیراگ ہیں مگر یہ تعجب کی حد تک ناکام فلمیں تھیں اس کی وجہ دلیپ کا اپنی فلم گنگا جمنا کی تکمیل میں غیر معمولی مصروفیت تھی ان کی ہدایت میں پہلی بار بننے والی فلم 'کالنگا' بھی نامکمل رہ گئی جس کی تکمیل کا اب کوئی امکان ہی نہیں۔ دلیپ کمار کی سوانح میں ان کے پرستاروں کی دلچسپی غیر معمولی ہے مگر ایک زمانے تک دلیپ کمار نے اپنی سوانح خود لکھنے یا پھر اس کو کسی دوسرے صاحبِ قلم سے لکھوانے میں دلچسپی نہیں لی۔ ابھی چھ سال پہلے اُن کے بارے میں سوانحی طرز کی تین کتابیں انگریزی میں شائع ہوئی ہیں ان کتابوں سے کسی حد تک ان کی زندگی کا ایک معتبر احوال ان کے پرستاروں کو پڑھنے کو مل گیا ہے لیکن ادھر سائرہ بانو نے ان کے سوانحی گوشوں کو اپنی تحریروں میں منکشف کیا ہے وہ ان کے پرستاروں کے لیے غیر معمولی دلچسپی کا سبب بنا ہے ان کے فن اور شخصیت پر حسبِ ذیل کتابیں ان لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوں گی جو دلیپ کمار کے بارے میں اس تحریر سے کچھ اور ماورا بھی جاننے کے آرزومند ہیں مذکورہ تین کتابیں اس طرح ہیں:

- Dilip Kumar : Star Legend of Indian Cinema By Bunny Renben
- Nehru's Hero : Dilip Kumar by Lord Meghnad Desai
- Dilip Kumar : The Last Emperor by San jit Narwekar

ان کتابوں کے بارے میں فلم کے مبصر گوتم بھاسکرن کا خیال ہے کہ دلیپ کا عہد 1960 یا پھر زیادہ سے زیادہ 1970 تک تھا کہ اس کے بعد جو سینما شیام بینگل، مرنال سین اور اڈور بالا کرشنن کی ہدایت اور فلم سازی کے حوالے سے سامنے آیا ہے وہ دلیپ کی فلم اور سینما دونوں سے خاصا مختلف ہے ان لوگوں سے قبل ستیہ جیت رے اور رتوک گھٹک زندگی سے بے حد قریب دکھائی دینے والے سینما کی بنیاد رکھ چکے تھے اور ستیہ جیت رے 1955 میں 'پاتھر پنچالی' کے ذریعے ہندوستانی سینما کو دنیا سے متعارف کرانے کی پہل کر چکے تھے میگھ ناتھ ڈیسائی نے دلیپ کمار کو نہرو عہد کا ہیرو قرار دینے کے لیے اپنے دلائل دیے ہیں چونکہ دلیپ کی 57 فلموں میں سے 36 فلمیں ایسی ہیں جو اسی عہد 64-1947 میں بنی تھیں اور اس عرصے میں ملک کے وزیر اعظم نہرو تھے نہرو کے انتقال کے وقت دلیپ کمار کی عمر 42 سال تھی ڈیسائی کے مطابق شہید، میلہ اور نیا دور جیسی فلموں نے دلیپ کو نہرو عہد کے مسائل اور اُس عہد کے نوجوانوں کے جذبات کا ترجمان بنا دیا تھا۔ میں نے اپنی زیرِ طبع کتاب 'ہندوستانی سینما کا سنہری دور' میں دلیپ، راج اور دیو کے فلمی مثلث کے حوالے سے اُس عہد کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔

■

Mr. Zubair Razvi, C-2, A B Complex, 179/8, Zakir Nagar, New Delhi - 110025

سنگھ تو مر بھی عرفان کی وجہ شہرت بنی۔

عامر خان

کمرشیل فلموں کو آرٹ فلموں کا انداز دینے والے اداکار عامر خان 14 مارچ 1965 کو طاہر حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ 1973 میں اپنے چچا ناصر حسین کی فلم یادوں کی بارات میں بطور چائلڈ اسٹار کے پہلی مرتبہ بڑے پردہ پر نمودار ہوئے۔ گیارہ سال بعد فلم ہولی میں کام کیا مگر انھیں فلمی دنیا میں کامیابی اور پذیرائی ان کے کزن منصور خان کی فلم قیامت سے قیامت تک سے ملی جو کہ 1988 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں انھیں بہترین نئے اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ 90 کی دہائی میں ان کی کئی مشہور فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں راجہ ہندوستانی، سرفروش، بازی اور عشق وغیرہ شامل تھیں۔ 2000 کے بعد ان کی اداکاری میں ایک بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی جب انھوں نے لگان فلم میں کام کیا۔ لگان فلم کو آسکر کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔ لگان کے بعد انھوں نے کئی سپر ہٹ فلموں میں کام کیا جن کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ان فلموں میں منگل پانڈے، تارے زمیں پر، گجنی، تھری ایڈیٹس شامل ہیں۔ عامر خان نے ان فلموں میں حقیقی زندگی کی تصویریں پیش کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر تارے زمین پر اور تھری ایڈیٹس تدریس نظام میں موجود خرابیوں کی نشاندہی کے حوالے بہترین فلمیں تصور کی جاتی ہیں۔ ان کی فلمیں عام اور کمرشیل موضوعات سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے سماجی مسئلوں کے ساتھ بھی خود کو جوڑا ہے اور ٹیلی ویژن پروگراموں کے ذریعے بنیادی نوعیت کے سماجی مسائل قوم کے سامنے رکھ رہے ہیں۔

اس مضمون کے ساتھ دیے گئے مختلف شخصیتوں کے سوانحی کوائف 'اردو دنیا' کے ادارتی شعبے کی ٹیم نے مختلف ذرائع سے ملنے والے حوالوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ ادارہ

معصوم زہرا

ہندوستانی سنیما کی زہرہ جبیں!

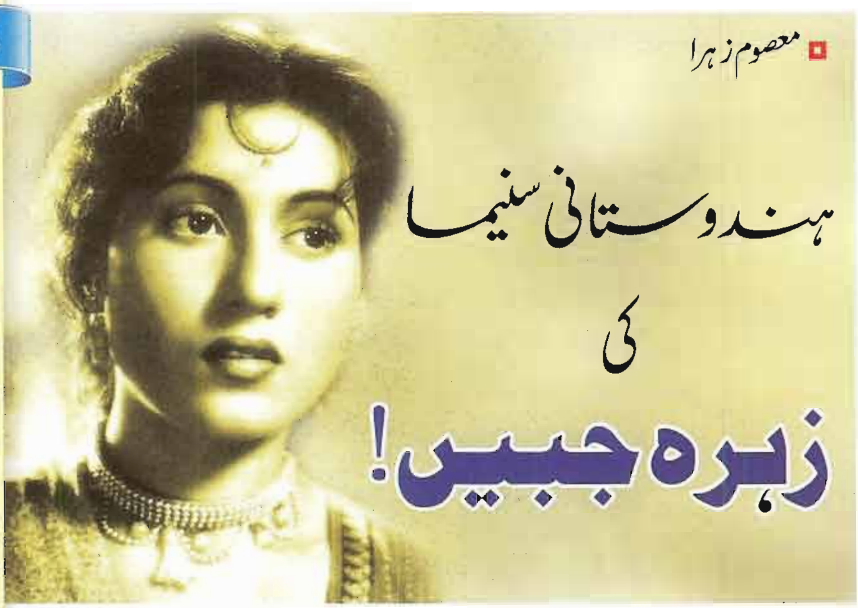

سنیمائی افق پر کچھ ایسے کردار بھی جلوہ گر ہوئے جن کی خوبصورتی اور فنکارانہ صلاحیت نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ آج بھی فنکارانہ خصوصیت کی وجہ سے انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ جن اداکاراؤں نے اپنی فنکارانہ صلاحیت کی بنا پر مقبولیت حاصل کی ان میں نرگس، ثریا، وحیدہ رحمان، مینا کماری، بینا رائے، نمی، نوتن، گیتا بالی اور وجنتی مالا کے نام آتے ہیں۔ انھیں اہم ناموں میں ایک اہم نام مدھوبالا کا ہے۔ جن کا اصلی نام ممتاز جہاں دہلوی تھا۔

14 فروری 1933 کو پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد عطا اللہ خان بہت سخت مزاج تھے۔ جنھوں نے کچھ اصول مدھوبالا کے لیے وضع کر دیے تھے۔ فلم انڈسٹری میں انھیں اصولوں کی بنیاد پر مدھوبالا کو کام کرنے کی اجازت ملی تھی۔ مدھوبالا کی والدہ ناخواندہ تھیں۔ ان کی زندگی گھر کی چہار دیواری کے حصار میں رہی اور فلمی دنیا کے کسی بھی شخص نے انھیں نہیں دیکھا۔ مدھوبالا کے بارے میں یہ بات بھی ہے کہ انھوں نے نامساعد حالات میں فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔ ان کے خاندان پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہر فرد کو اپنی بقا کے لیے سخت محنت درپیش ہوئی اور جب کفالت کی کوئی مستقل صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً اپنی تیسری بیٹی یعنی مدھوبالا کو فلموں میں کام کرانے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا آٹھ نو برس کی معصوم بچی کو امیہ چکر ورتی کی فلم بسنت (1942) میں بطور چائلڈ آرٹسٹ شامل کیا گیا۔ اس فلم میں مدھوبالا نے دو گانے بھی گائے تھے۔ اس کے بعد رنجیت اسٹوڈیو کا ان کے ساتھ معاہدہ ہوا۔ جہاں ان کی اوّلین فلم ممتاز محل 1944 میں تیار ہوئی۔ مدھوبالا کے بچپن میں کئی ایسے واقعات پیش آئے جن سے وہ بری طرح متاثر ہوئیں۔

ابھی بچپن کے دن بھی نہیں دیکھے تھے کہ خاندان کی کفالت کی ذمے داری ننھی سی جان پر آپڑی۔

1944 میں خوفناک سمندری طوفان نے ان کے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن خدا کا شکر رہا کہ کوئی جانی اتلاف نہیں ہوا۔ تمام لوگ ایک دوست کے مکان میں سکونت پذیر ہوئے۔ دوسرا واقعہ یہ کہ ان کی ماں امید سے تھی اور انھیں فوراً کسی اسپتال میں داخل کرانے کی ضرورت تھی لیکن ان لوگوں کے پاس اخراجات برداشت کرنے کی قوت نہیں تھی۔ چنانچہ رنجیت اسٹوڈیو کی رتی بائی نے ان کی بھرپور مالی مدد کی۔ یہ واقعہ ایسا تھا جس نے مدھوبالا کے دل و دماغ پر شدید اثرات مرتب کیے اور انھوں نے عہد کیا کہ اگر وہ اس لائق ہوئیں کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر سکتی ہیں تو اس میں وہ کبھی پیچھے نہیں رہیں گی اور پوری زندگی وہ اپنے اس عہد پر عمل پیرا رہیں۔

مدھوبالا کے حسن کی قصیدہ خوانی کرتے فلم شائقین نہیں تھکتے، ان کی جادوئی آنکھیں، پرکشش چہرہ، جھولتی ہوئی بالوں کی لٹیں، کسی بھی مصنوعی خوبصورتی سے پاک ایک شاہکار تھی۔ جس کی وجہ سے انھیں مختلف خطابات سے بھی نوازا گیا۔ مثلاً وینس آف ہندوستانی سنیما، ڈریم گرل، میڈونا اور ملکۂ حسن وغیرہ۔ مشہور فلم صحافی کرن جیا نے مدھوبالا کی خوبصورتی کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے: ''اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والی کسی تصویر نے اس کے حسن کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔'' موصوف

زہرہ سہگل

تھیٹر اور فلم کی مشہور شخصیت زہرہ سہگل سو سال سے اوپر کی ہو چکی ہیں اور انھیں بلا شبہ اپنی ذات میں 'ایک زندہ صدی' کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستانی سنیما کے ساتھ عالم وجود میں آنے والی زہرہ سہگل سہارن پور کے ایک بڑے زمیندار گھرانے میں 27 اپریل 1912 کو پیدا ہوئیں۔ اس گھرانے کا تعلق روہیلہ پٹھان نسل سے تھا۔ انھوں نے انگریزی اور ہندی فلموں میں بھی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ وہ انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (اپٹا) اور پرتھوی راج کپور تھیٹر سے بھی وابستہ رہیں۔ انھوں نے 1942 میں کامیشور سہگل سے شادی کی تھی، شادی کی تقریب میں جواہر لال نہرو بھی شریک ہوئے تھے۔ کامیشور بنیادی طور پر سائنسداں تھے۔ زہرہ سہگل نے تین درجن سے بھی زائد فلموں اور ڈراموں میں کام کیا۔ ان کے جو ڈرامے اور فلمیں بہت مشہور ہوئیں ان میں دھرتی کے لال، نیچا نگر، افسر، چلو عشق لڑائیں، سایہ، کل ہو نہ ہو، ویر زارا، چینی کم اور سانوریا بہت مقبول ہوئے اور ان کی اداکاری نے داد و تحسین حاصل کی۔ ٹی وی سیریل ملاّ نصر الدین میں ان کے کردار کو بے حد سراہا گیا۔ زہرہ سہگل کو فلم اور ڈرامے کی خدمات کے لیے متعدد انعامات و اعزازات سے نوازا گیا جن میں پدم شری، کالی داس سمان، سنگیت ناٹک اکیڈمی ایوارڈ اور سنگیت ناٹک فیلوشپ شامل ہیں۔ 2010 میں ہندوستان کے دوسرے سب سے بڑے شہری اعزاز پدم وبھوشن سے انھیں نوازا گیا۔

نرگس

ہندی فلم کی تاریخ میں نرگس کا نام بہت ہی ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام فاطمہ راشد تھا۔ ان کی پیدائش یکم جون 1929 میں کلکتہ میں ہوئی۔ ان کے والد رقم چند موہن چند پنجابی برہمن تھے اور والدہ جدن بائی ایک پنجابی مسلمان تھیں۔ نرگس کی پہلی فلم تلاش حق تھی۔ میلہ، برسات، انداز، ساگر، آوارہ، بے وفا، چوری چوری، مدر انڈیا ان کی خاص فلمیں ہیں۔ آخری فلم رات اور دن تھی جس کے پروڈیوسر ان کے بھائی اور مشہور اداکار انور حسین تھے۔ نرگس کی شادی مشہور اداکار سنیل دت سے ہوئی

کے ان الفاظ کی تصدیق فلم مغل اعظم کے کئی مناظر سے ہوتی ہے۔

جب مغل شہنشاہ کے بے شمار درباری مجسمہ کے بے نقاب ہونے کے لیے شدید منتظر ہوتے ہیں، شہزادہ سلیم تیر کمان کے ذریعے اس کی نقاب کشائی کرتا ہے اور مجسمے کی خوبصورتی کی تعریف میں اکبر اعظم کی زبان سے سبحان اللہ کے کلمات جاری ہوتے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے جیسے ہی مجسمہ شہنشاہ کے احترام میں جھکتا ہے اور بادشاہ کی زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے: ''ہم تمھیں انارکلی کا خطاب دیتے ہیں''۔ فلم کا یہ منظر انارکلی کی بے پناہ خوبصورتی کا عکاس ہے۔ نادرہ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ: وہ آسمان سے اتری کسی حور کی طرح نظر آتی... اس کے حسن میں ایک وقار تھا اور یہ خوبی اسے عام چہروں سے منفرد بناتی تھی۔''

بچپن میں خاندان کی کفالت کی ذمے داری آن پڑنے پر مدھوبالا تعلیم سے دور رہ گئیں لیکن انھیں اردو اور پشتو پر خاصا عبور تھا۔ انگریزی اسے کم آتی تھی۔ انھوں نے سترہ برس کی عمر میں انگریزی کے لیے ایک ٹیوٹر سوشیلا رانی سے رابطہ کیا۔ سوشیلا نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ: ''جب مدھو میرے پاس انگریزی سیکھنے آئی تو وہ اس زبان سے بے آشنا تھی لیکن مجھے فخر ہے کہ وہ بہت ذہین طالبہ ثابت ہوئی۔ اس نے تیزی سے سیکھنا شروع کر دیا اور صرف تین ماہ میں لکھنا پڑھنا اور انگریزی بولنا سیکھ چکی تھی۔''

مدھوبالا کو ماں باپ کی بھرپور محبت ملی۔ جس کا ذکر مدھوبالا نے کیا ہے:

''زندگی میں مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا یا میں تنہا ہوں۔ حالانکہ زندگی کے بہت سارے برس نامساعد حالات میں بھی گزرے۔ میں دل سے پوری ایمانداری کے ساتھ اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے ہمیشہ اپنے خاندان کا زبردست جذباتی سہارا لینا پڑا۔''

مدھوبالا کے پرستاروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جن میں مدھوبالا کے لیے اندھی عقیدت اور جنون کی کیفیت پائی جاتی تھی اور آج بھی لوگ انھیں یاد کرتے ہیں۔ دلیپ کمار اس حوالے سے کہتے ہیں:

''وہ لوگوں میں بہت مقبول تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ واحد اسٹار تھی جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ اسٹوڈیو کے گیٹ کے باہر لٹک رہے ہوتے۔ جب شوٹنگ ختم کر کے وہ اسٹوڈیو سے باہر نکلتی تو لوگوں کا ایک ہجوم اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے باہر جمع ہوتا جبکہ کسی دوسرے کے لیے ایسا نہیں ہوتا تھا۔''

مدھوبالا کے والد کا پریس والوں سے تنازعہ ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں پریس والوں نے مدھوبالا کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب فلم ڈائریکٹر پی ایل سنتوشی کی فلم نرالا کی شوٹنگ کے دوران ندی میں گھٹنوں تک پانی میں اتر کر مدھوبالا کو سین کرنا تھا۔ مدھوبالا یہ چاہتی تھی کہ یہ سین پورا ہونے کے بعد ان کے نہانے کے لیے پانی ان کے گھر سے لایا جائے لیکن جب ان کی یہ خواہش نامنظور کر دی گئی تو مدھوبالا نے فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ پی ایل سنتوشی کو مدھوبالا کا یہ برتاؤ بہت ہی ناگوار گزرا۔ انھوں نے فلم کی شوٹنگ فوراً پیک اپ کرادی اور چار دن کے لیے غائب ہو گئے۔

مدھوبالا کے اس برتاؤ کا تذکرہ انھوں نے مووی ٹاکیز کے ایڈیٹر کرن جیا سے بھی کیا۔ مووی ٹاکیز کے ارکان نے اس معاملے کو مزید ہوا دی اور پریس نے بھی اس معاملے کو اچھالنا شروع کر دیا۔ گرچہ اس کے بعد سنتوشی اور مدھوبالا کے مابین صلح صفائی ہوگئی لیکن اس تنازعے کو پریس نے بہت منفی انداز میں پیش کیا تو عطاءاللہ خان طیش میں آ گئے اور فلم سازوں سے یہ شرط رکھ لی کہ مدھوبالا کی فلم کی شوٹنگ کے دوران کوئی بھی صحافی سیٹ پر نہیں آئے۔ اس کا باقاعدہ تذکرہ کنٹریکٹ سائن کرتے وقت مدھوبالا کرتی رہیں۔ جس کے نتیجے میں مدھوبالا کا پریس سے طویل تنازعہ شروع ہوگیا اور پریس والوں نے مدھوبالا کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ مدھوبالا کو تنگ کرنے کے لیے پست ہو کر حملے کیے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے مذہب اور خاندان کا بھی مذاق بنایا جانے لگا۔ پریس والے سوقیانہ زبان استعمال کرنے لگے۔ پورے پریس نے مدھوبالا کو جھکانے کے لیے مہم جوئی کی۔ پورے بمبئی میں پوسٹر لگائے گئے جن کا عنوان 'مدھوبالا کے خلاف جنگ' تھا۔ صحافیوں اور مدھوبالا کے مابین تنازعہ تقریباً ایک سال تک چلا۔ صحافیوں کے تمام حربے ناکام ثابت ہوئے۔ کیونکہ صحافیوں کو یہ خیال خام تھا کہ وہ اگر مدھوبالا کا بائیکاٹ کر دیں گے اور ان کی خبریں نہیں شائع کریں گے تو دھیرے دھیرے ان کا فلمی کریئر بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اسی درمیان مدھوبالا کی فلم 'ہنستے آنسو' ریلیز ہوئی اور مقبولیت کو چھونے لگی۔ اس کے بعد میگزین 'فلم انڈیا' کے ایڈیٹر کے نام مدھوبالا کی حمایت میں خطوط کا ڈھیر لگ گیا۔ جس سے پریس والوں کو یہ بخوبی اندازہ ہوگیا کہ عوام اس معاملے کو کس طرح دیکھ رہی ہے۔ اس میگزین کے ایک قاری نے اس کے

تھی۔ ان کے تین اولاد ہیں۔ سنجے دت، نرمادت اور پریادت۔ نرگس کو کئی انعامات دیے گئے۔ 1957 میں مدر انڈیا کے لیے بہترین ہیروئن کا ایوارڈ ملا۔ 1958 میں پہلی ہیروئن تھیں جنھیں حکومت ہند کی جانب سے پدم شری کا ایوارڈ دیا گیا۔ 1969 میں فلم 'رات اور دن' کے لیے بہترین ہیروئن کے لیے فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی وفات 3 مئی 1981 کو خون کے کینسر سے ہوئی اور حکومت نے ان کی یاد میں فلموں کے لیے نرگس دت قومی یک جہتی ایوارڈ شروع کر رکھا ہے۔

مینا کماری

درگا کھوٹے، کامنی کوشل، نرگس، مدھوبالا، وجینتی مالا اور مینا کماری ہندوستانی فلموں کی وہ اداکارائیں ہیں جنھیں ہندوستانی سنیما کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ان میں مینا کماری کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے وہ سب بھی کہہ دیتی تھیں جس کی ترسیل کے لیے کئی صفحے درکار ہوں گے۔ بے حد حساس اور شاعرانہ مزاج رکھنے والی مینا کماری کا اصل نام مہ جبیں اور تخلص ناز تھا۔ یکم اگست 1932 کو وہ بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام علی بخش تھا۔ وہ کوئی عام اداکارہ نہیں تھیں بلکہ ان کی زندگی کی ٹریجڈی، درد اور پراسراریت کا اندازہ ان کی شاعری اور فلموں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ فلم ہدایت کار وجے بھٹ نے 1939 میں مینا کماری کو ایک چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنی فلم فرزند وطن عرف لیدر فیس میں کام کرنے کا موقع دیا۔ اس کے بعد مینا کماری نے پوجا، کسوٹی اور بہن میں بھی کم سنی کے رول کیے۔ گنیش مہیما، الہ دین اور جادوئی چراغ اور 1952 کی فلم بیجوباورا میں وہ بطور ہیروئن متعارف ہوئیں۔ 1953 میں اپنی پہلی فلم پر بہترین اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا۔ ایک سال بعد فلم 'پرینیتا' کے لیے مینا کماری کو ایک بار پھر فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ 31 مارچ 1972 کو ممبئی میں انتقال ہوا۔ انھوں نے کمال امروہی سے شادی کی تھی جو کامیاب نہیں ہو سکی۔ ان کی مقبول فلموں میں مس میری، چراغ کہاں روشنی کہاں، ستہ بازار، میں چپ رہوں گی، کوہ نور، پھول اور پتھر، غزل، دل ایک مندر، دل اپنا اور پریت پرائی، چتر لیکھا، کاجل، بے نظیر، بہو بیگم، بہاروں کی منزل، نور جہاں، دشمن، میرے اپنے وغیرہ شامل ہیں۔

متعلق لکھا ہے:

''مدھو بالا انڈیا کی دلربا ہے اور مجھے ان صحافیوں سے ہمدردی ہے جو اس کے جائز حق پر برہم ہو کر فساد کھڑا کر رہے ہیں۔ یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنے کام کے متعلق شرائط طے کرے۔ لیکن یہ لوگ بلا وجہ معاملے کو اتنا طول دے رہے ہیں۔ مدھو بالا کی فلموں سے متعلق بھی ان کا رویہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ صحافی اس کی محبت میں بری طرح مبتلا تھے اور ٹھکرائے جانے کا غم ان سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ یہ ذہنی اور اخلاقی طور سے بیمار لوگ ہیں اور ذہنی نا پختگی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ کیا یہ صحافی اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیں گے کہ وہ ایک ادیب کے سر پر سوار ہو جائیں ایسے وقت میں جبکہ وہ کتاب لکھ رہا ہو''۔

جب یہ تنازعہ تقریباً ایک سال زائد عرصہ گزار چکا تو دونوں طرف کے لوگوں کو احساس ہو گیا کہ اب بہت ہو گیا اور تنازعہ ختم ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ پریس کو بھی اشتہارات میں نقصانات در پیش تھے۔ دوسری طرف عطا اللہ خان بھی بہت پریشان تھے۔ اب معاملے کو حل کرنے کے لیے صحافی کرن جیا کے گھر میٹنگ رکھی گئی۔ جن میں عطا اللہ خان اور مدھو بالا کو بلایا گیا۔ اس کے بعد صلح صفائی کر کے معاملے کو رفع دفع کر لیا گیا۔ کرن جیا نے ان لمحوں کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے:

''خان صاحب بڑی گرم جوشی سے اٹھے اور ہمیں گلے لگا لیا۔ اس دوران مدھو بالا میری چھوٹی بیٹی کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلتی رہی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے مدھو بالا کو پردۂ اسکرین سے ہٹ کر دیکھا اور یقین کریں کہ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ خوبصورت ترین لڑکی تھی جو شاید میں نے زندگی میں کبھی دیکھی ہو۔ گہری بھوری آنکھیں ... بھورے بال، 5 فٹ 6 انچ قد، صاف رنگت، انگلش لڑکیوں کی طرح خدو خال، بغیر میک اپ اور سفید ساڑی میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ایک بہت ہی چاہے جانے والی لڑکی ... میں دل سے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس لمحہ مجھے بہت افسوس ہوا کہ اتنی پیاری لڑکی ایک سال قبل کس طرح ہمارے نشتر کی طرح چبھتے ہوئے جملوں کا نشانہ بنی رہی''۔

مدھو بالا کو اشوک کمار اور موتی لال نے آٹھ سال کی عمر میں کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس زمانے کی معصومیت کے عکس لوگوں کے دلوں پر محفوظ تھے۔ بعد میں انھیں لوگوں کے ساتھ بطور ہیروئن مدھو بالا نے کام کیا۔ راج کپور کے ساتھ مدھو بالا نے نیل کمل، چالاک، چتر وجے، دل کی رانی، امر پریم اور دو استاد، میں اور دیو آنند کے ساتھ نرالا، آرام، نادان، مدھو بالا، مدن، ارمان، کالا پانی، جعلی نوٹ اور شرابی فلموں میں کام کیا۔ شرابی ان کے انتقال کے بعد ریلیز ہوئی۔ مدھو بالا کو عارضۂ قلب (دل میں سوراخ) تھا۔ اس کا پتہ بچپن میں ہی ایک شوٹنگ کے دوران بیہوش ہو جانے کے بعد معلوم ہوا۔

مدھو بالا نے کئی ایسے کردار پردۂ سیمیں پر پیش کیے ہیں جن کی تعریف کرتے فلمی شائقین نہیں تھکتے۔

مدھو بالا کے ساتھ کام کرنے والے اداکار دیو آنند، نمی، اوم پرکاش، کیدار شرما سب کو مدھو بالا کی ایک عادت کا پتہ تھا اور اس بات کا لائیو مظاہرہ یعنی اچانک کسی پر ہنستے ہوئے وہ کئی بار دیکھ چکے تھے اس لیے وہ برا نہیں مانتے تھے اور کئی بار خود مدھو بالا کو اپنے مد مقابل سے اپنی حرکت کی وضاحت کرنی پڑتی تھی ''یقین کرو مجھے اپنی اس عادت پر بالکل قابو نہیں، میں تم پر نہیں ہنس رہی تھی بلکہ اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ میرا مطلب تمھیں دکھ دینا یا مذاق اڑانا نہیں تھا''۔

لیکن کچھ لوگ واقعی برا مان بھی جاتے تھے۔ ایک بار ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی جس میں راج مہرا کو جلتے شعلوں پر اپنا ہاتھ رکھنا تھا۔ فلم کے ڈائریکٹر کے اصرار کے باوجود راج مہرہ نے ہتھیلی کو آگ سے محفوظ رکھنے والا کیمیکل لگانے سے انکار کر دیا اور جیسے ہی آگ کے شعلوں نے ہتیلی کو چھوا، اس کی شکل پر عجیب غریب تاثرات ابھرنے لگے۔ مدھو بالا یہ دیکھ کر اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکیں اور بے اختیار ہنستی چلی گئیں۔ راج مہرا جو اس وقت سخت تکلیف میں تھا اسے مدھو بالا کی یہ حرکت بہت بری لگی اور مدھو بالا کے باپ کو بھی بیٹی کی اس حرکت پر شدید غصہ آیا۔ اس

شبانہ اعظمی

شیام بینگل کی پہلی فلم 'انکور' کے ساتھ نئے ہندوستانی سینما کو جو نئی پہچان ملی اس کی سب سے اہم اداکارہ شبانہ اعظمی مشہور اردو شاعر کیفی اعظمی کی بیٹی اور مکالمہ نگار و شاعر جاوید اختر کی اہلیہ ہیں۔ 18 ستمبر 1950 کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ پہلے تھیٹر میں اداکاری کی۔ پھر شیام بینگل نے فلم انکور میں انھیں متعارف کرایا۔ ان کی اہم فلموں میں امراؤ جان، اوم شانتی اوم، تہذیب، ہری بھری، گج گامنی، فائر، مرتیو دنڈ، جھوٹی شان، یادوں کی زنجیر، معصوم، اسپرش، جنون، جلیا والا باغ، شطرنج کے کھلاڑی، امر اکبر انتھنی، فاصلہ وغیرہ۔ کچھ آرٹ فلموں کے علاوہ چند کمرشیل فلمیں بھی انھوں نے کیں لیکن خود کو جگمگاتی دنیا تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ غربا، خصوصاً کچی آبادیوں میں رہنے والوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے ایک طویل لڑائی لڑی اور بہت سے بے گھر افراد کو گھر دلانے میں کامیابی حاصل کی۔ 1985 میں بھاونا فلم میں بہترین اداکاری کے لیے فلم فیئر ایوارڈ، 1984 میں ارتھ فلم میں عمدہ اداکاری کے لیے فلم فیئر ایوارڈ اور 1978 میں سوامی فلم میں خوبصورت اداکاری کے لیے فلم فیئر ایوارڈ دیے گئے۔ وہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جنھیں 2006 میں گاندھی انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ریکھا

کمرشیل سینما کی ہاٹ شاٹ اداکارہ سے خود کو کامیابی کے ساتھ ایک حساس طبع اداکارہ میں ڈھالنے والی ریکھا 10 اکتوبر 1954 کو مدراس میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد جیمنی گنیشن تامل فلموں کے بہت بڑے اداکار تھے جنھوں نے ہندی فلموں میں بھی کام کیا تھا۔ ریکھا نے 15 سال کی عمر میں تیلگو فلموں سے اپنا فلمی سفر شروع کیا۔ حالانکہ انھیں اپنی فلمی زندگی میں بے حد جدوجہد کرنی پڑی۔ یوں تو ریکھا نے ہندی کی متعدد کامیاب فلموں میں کام کیا۔ لیکن ان کی فلمی زندگی میں 1981 میں بڑا اموڑ آیا جب انھوں نے فلم امراؤ جان میں طوائف کا کردار ادا کیا اور اس کردار کو ناقابل فراموش بنا دیا۔ ریکھا نے اس فلم میں اداکاری کے لیے باقاعدہ اردو زبان سیکھی تھی۔ اسی لیے اشعار و مکالموں کی ادائیگی میں زبردست برجستگی ہے۔ یہ فلم ان کی زندگی میں بہت بڑا موڑ ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد ان کی کامیابی کو پر لگ گئے۔ ریکھا کی کامیاب فلموں

نے مدھوبالا سے کہا کہ وہ فوراً مہرا سے معذرت کرے۔ اگلے دن جب وہ مہرا سے معذرت کرنے کے لیے گئی اور جیسے ہی دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں تو ایک بار پھر مدھوبالا کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لیکن اس دفعہ وہ اکیلی نہیں ہنس رہی تھی بلکہ مہرا سمیت پورا یونٹ اس کے قہقہوں میں شامل تھا۔ فلم مغل اعظم میں ایسے مناظر ہیں جو فلم کی مقبولیت کے لیے بہت اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ دلیپ کمار فلم کے اپنے پسندیدہ منظر کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

''عام طور پر لوگوں کا پسندیدہ سین وہ ہے جس میں انارکلی اور سلیم شمع کی روشنی میں گفتگو کر رہے ہیں لیکن میرا پسندیدہ سین وہ ہے جہاں انارکلی ہندوستان کی ملکہ بننے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے اور شہزادے سلیم کو بیہوشی کی دوا پلا دیتی ہے''۔

مغل اعظم میں کئی ایسے رومانی مناظر ہیں جو انسانی حسیات کی بہت خوبصورت عکاسی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب تان سین کے راگ کے ساتھ انارکلی اور سلیم کو اکیلے میں ملنا ہوتا ہے اور سلیم ایک 'پر' انارکلی کے چہرے پر پھیرتا ہے۔ پرسکون فضا ہے اور ہلکی ہلکی تان سین کے راگ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ یہ رومانی منظر فلم سازوں اور اداکاروں کے دلوں پر رقم ہو گئے ہیں۔ ششی کپور اس منظر کے متعلق فرماتے ہیں: ''اس طرح کے مناظر اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتے جب تک اداکار مکمل طور پر اس میں ضم نہ ہوں۔ ایسے مناظر کرتے ہوئے ایک فنکار کو اپنی ہستی کو بالکل فراموش کر کے خود کو مکمل طور پر اس میں گم کرنا ہوتا ہے''۔

ریکھا نے اس منظر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

''ہندی فلموں میں یہ بات طے کر لی گئی ہے کہ تمام تاثرات لفظوں سے ہی ادا کرنے ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کہا رہ جاتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ پرکشش ہے۔ جو کہہ دیا جاتا ہے بالخصوص محبت کے معاملات میں۔ میرے پسندیدہ رومانوی مناظر میں 'مغل اعظم' میں دلیپ کمار اور مدھوبالا کا وہ منظر ہے جہاں شہزادہ سلیم ایک 'پر' سے اپنی محبوبہ کا چہرہ چھوتا ہے۔ یہ منظر حسن و جمال کو چھوتا ہوا ذہن سے چپک جاتا ہے۔ مدھوبالا کی آنکھوں میں پگھلتے ہوئے محبت کے جذبات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بے حد نامساعد حالات کے باوجود جو حسن اور وقار اس منظر میں ان دونوں کی محبت میں نظر آتا ہے وہ ناقابل یقین ہے''۔

مدھوبالا اور مینا کماری نے کوئی فلم ایک ساتھ نہیں کی اور ان لوگوں کی ملاقات بھی آپس میں بہت کم ہوئی ہے۔ لیکن یہ دونوں ہی اپنے عہد کی بڑی اداکارائیں تھیں۔ ان دونوں میں ایک یکسانیت یہ پائی جاتی ہے کہ دونوں کی زندگیاں دکھ و آلام سے بھری نظر آتی ہیں۔ مدھوبالا اور مینا کماری دونوں کی شادیاں بھی ناکام رہیں۔ مدھوبالا کو جس مرض نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اس کی سنگینی کا اندازہ ان کے قریبی اہل خانہ تک کو تھا لیکن کوئی بھی ان کے آرام کے بارے میں نہیں سوچتا تھا، کسی نے منع نہیں کیا کہ وہ زیادہ کام نہ کریں۔ وہ اپنے طے شدہ شیڈول پر کام کرنے کے لیے نکل جاتی تھیں۔ بیماری کے سبب وہ سنگار، امر اور مغل اعظم کے سیٹ پر بیہوش ہو گئی لیکن جیسے ہی ان کو ہوش آتا وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ دلیپ کمار اور مدھوبالا کی محبت کا بھی تذکرہ خوب کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں بھی مدھوبالا اپنے باپ کے اصولوں کی بلی چڑھ گئیں۔ ان کے والد دلیپ کمار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مدھوبالا اور دلیپ کمار کی محبت کو کچل دیا۔ ان کی شادی جب کشور کمار سے ہوئی تو وہ اپنی بیماری سے جنگ لڑ رہی تھیں۔ بیماری اور ڈپریشن کی اس صورتحال میں انھیں پیار و محبت کی ضرورت تھی جبکہ کشور کمار دوسری اداکاراؤں کے ساتھ رومانس میں مصروف تھے۔ جن کی خبریں سن کر ان کی اذیت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ مدھوبالا کی زندگی کا مطالعہ کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی پوری زندگی دکھ کی ساتھی رہی۔ کبھی اپنے محبت کرنے والے دلیپ کمار سے دکھ ملا تو کبھی اپنے ہم سفر کشور کمار سے۔ ان دکھوں کو اس جان لیوا مرض کے ساتھ کیسے برداشت کرتی۔ 9 برس کی عمر سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کرنے والی اس اداکارہ نے بسنت، ممتاز محل، پجاری، نیل کمل، دل کی رانی، خوبصورت دنیا، لال دوپٹہ، امر پریم، پرائی آگ، دولت، اپرادھی، دلاری، محل، نیکی اور بدی، ہنستے آنسو، مدھوبالا، پردیش، سنگدل، ساقی، ارمان، ریل کا ڈبہ، امر، شیریں فرہاد، یہودی کی لڑکی، گیٹ وے آف انڈیا، چلتی کا نام گاڑی، ہاوڑا برج، کالا پانی، برسات کی رات، انسان جاگ اٹھا، محلوں کے خواب، جعلی نوٹ اور مغل اعظم جیسی فلموں میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کے بعد 23 فروری 1969 کو صرف 36 سال کی عمر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

□

Masum Zehra 212-E, Mahandi Hostel, JNU, New Delhi-110067

میں ساون بھادوں، رام پور کا لکشمن، گورا کالا، کہانی قسمت کی، نمک حرام، دھرم کرم، دھرماتما، اتسو، مقدر کا سکندر، سلسلہ، پیار کی جیت، پھول بنے انگارے، زبیدہ، کوئی مل گیا اور اوم شانتی اوم کے بھی نام لیے جاتے ہیں۔ بے شمار فلمی ایوارڈز کے ساتھ ساتھ ریکھا کو 2010 میں اعلی ترین شہری اعزاز پدم شری سے نوازا گیا۔

تبو

تبو کا پورا نام تبسم ہاشمی ہے ان کی پیدائش 4 نومبر 1971 کو حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کے والد جمال ہاشمی اور والدہ رضوانہ ہیں۔ ان کی چچی شبانہ اعظمی اور بڑی بہن فرح ناز ہندوستانی سنیما میں مقبول اداکارہ کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ تبو نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد سے حاصل کی اور پھر ممبئی کے سینٹ زیویئرس کالج میں بھی پڑھائی کی۔ ان کی اہم فلموں میں وجے پتھ، جیت، ماچس، وراثت، ہوتو تو، اور چاندنی بار قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے فلم فیئر کریٹک ایوارڈ کئی دفعہ جیتا ہے اور بہترین اداکارہ کا نیشنل فلم ایوارڈ انھیں دو دفعہ دیا جا چکا ہے۔ تبو نے ہندی کے علاوہ تمل، تیلگو، ملیالم، مراٹھی، فلموں میں کام کیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ہالی ووڈ کی فلموں دی نیم سیک The Name Sake اور لائف آف پائی Life of PI میں بھی کام کیا ہے۔

ودیا بالن

پانچ زبانوں تمل، ملیالم، ہندی، مراٹھی، اور بنگالی اچھی طرح پڑھ اور سمجھ لینے والی ودیا بالن نے معروف اداکارہ شبانہ اعظمی اور مادھوری دیکشت سے متاثر ہو کر فلموں میں اداکاری کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کی پیدائش 1 جنوری 1978 کو اٹا پلم، ضلع پلکڑ، کیرلہ میں ہوئی۔ پی آر بالن ان کے والد ہیں۔ انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں زی ٹی وی کے لیے ایکتا کپور کے ٹی وی سیریل ڈرامے 'ہم پانچ' میں 'رادھیکا' کے نام سے پہلی بار اداکاری کی۔ 2001 میں بڑے پردے کے لیے تمل فلم میں اداکاری کی۔ پہلی بنگالی فلم 'بھالو دیکھو' 2003 میں ریلیز ہوئی جس میں انھوں نے 'آنندی' کا کردار ادا کیا تھا۔ ہندی اردو میں ان کی مشہور فلمیں پرینیتا، لگے رہو منا بھائی، سلام عشق، ہے بے بی، بھول بھلیاں، پا، عشقیہ، نو ون کلڈ جیسیکا، دی ڈرٹی پکچر، شادی کے سائڈ افیکٹ وغیرہ ہیں۔ انھیں کئی مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ، فلم کریٹک ایوارڈ کے علاوہ نیشنل فلم ایوارڈ برائے بہترین اداکارہ (دی ڈرٹی پکچر) بھی مل چکا ہے۔

اس مضمون کے ساتھ دیے گئے مختلف شخصیتوں کے سوانحی کوائف 'اردو دنیا' کے ادارتی شعبے کی ٹیم نے مختلف ذرائع سے ملنے والے حوالوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ ادارہ

نصرت ظہیر

مغل اعظم
فلم کے فن اور کامیابی کا اسم اعظم

ہندوستانی سنیما کے سو برس کی سب سے اہم دو چار فلمیں چنی جائیں تو ان میں 'مغلِ اعظم' ضرور شامل ہوگی اور یہ طے کرنا مشکل رہے گا کہ ہدایت کاری، کہانی کا پلاٹ، منظر نگاری، مکالمہ نویسی، موسیقی، رقص، کاسٹیوم، فوٹو گرافی، اداکاری، صدابندی، اور فلم کے تمام تکنیکی و تخلیقی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے کس شعبے میں پہلا مقام نہ دیا جائے۔ فلم سازی کے فن کو پورے اعتماد کے ساتھ کامیابی سے ہم کنار کردینے والا، اس فلم کا خالق کچھ خاص پڑھا لکھا نہیں تھا، تاہم تصور کو آرٹ میں تبدیل کردینے کی جو غیر معمولی صلاحیت اسے قدرت نے دی تھی وہ فلم کے نقادوں کو آج بھی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ہندوستان میں فلموں کے فن کی تدریس سے وابستہ کوئی ادارہ ایسا نہیں ہوگا جہاں طلبا کو مختلف فلمی شعبوں میں 'مغل اعظم' کی مثالیں دے کر سبق نہ پڑھائے جاسکتے ہوں۔

ہدایت کا ذکر آئے گا تو بتایا جائے گا کہ کے آصف نے کس طرح اکبر بادشاہ کے دربار عام، انارکلی اور سلیم کے رومان، اور ایک آزاد خیال سنگ تراش کی حق گوئی کو نمایاں کرنے والے مناظر کی فلم بندی کی۔ عمدہ کہانی اور اس کے پلاٹ کی بات ہوگی تو یہ ذکر ہوگا کہ ایک افسانے کو کس طرح تاریخی حقائق میں گھول کر، بالکل یقینی اور حقیقی معلوم ہونے والی کہانی لکھی گئی۔ منظر نامہ لکھنے کی کلاس ہوگی تو اساتذہ، طلبا کو فلم کے وہ سین دکھائیں گے جہاں فلم کے کردار ہر سین کے خاتمے سے پہلے ناظرین کے لیے ایک نیا ڈرامہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ مکالمہ نویسی کا سبق ہوگا تو طلبا کو 'مغل اعظم' کے کسی بھی منظر کے ڈائلاگ سنا کر سمجھایا جائے گا کس زبان، کس لہجے، اور کس ڈکشن سے منظر کو پراثر بنایا گیا ہے اور اسے تقویت بخشی گئی ہے۔ پس منظر موسیقی اور نغموں کی موسیقی پر بات چلے گی تب بھی اس فلم سے مثالیں اخذ کی جائیں گی اور بتایا جائے گا کہ کس طرح ناظرین کو سچویشن کی گہرائی میں اتارنے کے لیے پس منظر کی موسیقی کو استعمال کیا جاتا ہے اور نغمے کس طرح فلم کے بیانیے میں پیوست کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اداکاروں کے ملبوسات، میک اپ اور سیٹ ڈیزائننگ کو سمجھانے کے لیے بھی 'مغل اعظم' سے بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ فوٹو گرافی میں ٹرالی کے استعمال اور زومنگ، کلوز اپ اور لانگ شاٹ کے لیے کیمرے کے زاویوں کے تعین جیسے امور میں بھی اس فلم سے کئی باتیں سیکھنے کو مل جائیں گی۔

کس کردار اور شخصیت کے لیے کس اداکار کا انتخاب

کیا جائے، اس کی چال ڈھال کیسی ہو اور لہجہ کس طرح کا ہو یہ سمجھنے سمجھانے کے لیے تو 'مغل اعظم' سے بہتر کوئی فلم ہے ہی نہیں۔ بزرگوں کی بات جانے دیجیے، آج کی نسل کا بھی کوئی شخص مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کا تصور کرے گا تو اسے پرتھوی راج کی شکل ذہن کے پردے پر دکھائی دے گی۔ کے آصف نے یہ دکھانا چاہا تھا کہ پرتھوی راج، جلال الدین اکبر کا کردار ادا کر رہے ہیں، لیکن تاریخ کا کوئی طالب علم اکبر اعظم کی زندگی کا مطالعہ کرے گا یا مولانا محمد حسین آزاد کی دربار اکبری پڑھے گا تو محسوس کرے گا کہ اکبر کی بول چال، چلنے پھرنے کا انداز، آواز کی گھن گرج، دربار خاص و عام میں نشست اختیار کرنے کا ڈھنگ، سب کچھ پرتھوی راج کپور جیسا نظر آرہا ہے۔

اسی طرح قاری کو یہ بھی محسوس ہوگا کہ شہزادہ سلیم نے اکبر سے جب بھی روبرو اپنے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہوگا تو وہ دلیپ کمار کے انداز میں بولا ہوگا۔ انارکلی جیسی کوئی کنیز واقعی اکبر کے قلعہ آگرہ میں رہی ہوگی تو وہ مدھوبالا جیسی ہی خوب صورت، سہمی ہوئی لیکن باکردار اور نڈر نظر آئی ہوگی۔ اسی طرح جودھا بائی کے رول میں درگا کھوٹے، راجہ مان سنگھ کے کردار میں مراد، اس کے بیٹے کے رول میں اجیت، انارکلی کی ماں کے کردار میں جلّو بائی، خاص کنیز بہار کے کردار میں نگار سلطانہ (کے آصف کی پہلی بیوی اور اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن) اور دوسرے ایکٹر جس طرح اداکاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے حقیقی یا تصوراتی کردار ایسے ہی رہے ہوں گے۔ دراصل کے آصف اس فلم میں تاریخ کے ایک خاص دور کا خاص ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ یہ ایسا ماحول تھا جس میں ہر کردار ایک حقیقی کردار معلوم ہوتا ہے۔

یہاں تک کہ درباری گویّے میاں تان سین کے چند سیکنڈوں کے کردار کو دکھانے کے لیے انھوں نے اپنے وقتوں کے مشہور ہیرو رہ چکے سریندر کو لا بٹھایا تو لگا میاں تان سین ایسے ہی رہے ہوں گے۔ یہی نہیں تان سین کے جو دو راگ فلم میں گوائے گئے ان کے لیے بھی اس وقت کے سب سے مشہور اور محترم گائک، استاد بڑے غلام علی خاں کا پلے بیک لیا جو فلموں کے لیے گانے کو اپنی توہین سمجھتے تھے اور نوشاد صاحب کے کہنے پر انھیں منانے کے لیے کے آصف نہ صرف پنجاب میں ان کے گھر پر ملنے گئے بلکہ جب خاں صاحب نے انھیں ٹالنے کے لیے پچیس ہزار روپے ایک گانے کے لیے بطور فیس طلب کر لی تو یہ مطالبہ بھی آصف نے کسی حیل وحجت کے بغیر قبول کر لیا، جب کہ محمد رفیع اور لتا منگیشکر جیسے گلوکار بھی ان دنوں ایک گانے کا معاوضہ پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں لیتے تھے۔

کس کردار اور شخصیت کے لیے کس اداکار کا انتخاب کیا جائے، اس کی چال ڈھال کیسی ہو اور لہجہ کس طرح کا ہو یہ سمجھنے سمجھانے کے لیے تو 'مغل اعظم' سے بہتر کوئی فلم ہے ہی نہیں۔ بزرگوں کی بات جانے دیجیے، آج کی نسل کا بھی کوئی شخص مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کا تصور کرے گا تو اسے پرتھوی راج کی شکل ذہن کے پردے پر دکھائی دے گی۔

بہرکیف، خاں صاحب نے راگ سوہنی اور راگ راگیشوری پر مبنی دو نغمے 'مغل اعظم' کے لیے گائے اور کے آصف کا جنون 'شبھ دن آیو...' اور 'پریم جوگن بن جاؤں...' کی شکل میں ہمیشہ کے لیے موسیقی کی تاریخ میں درج ہو گیا۔

لیکن اس فلم کی سب سے خاص چیز تھی اس کے مکالمے۔ ہندوستانی سنیما کی یہ پہلی فلم ہے جس کے ڈائلاگ ایچ ایم وی نے ریکارڈ کی صورت میں پیش کیے اور تین لانگ پلے ریکارڈز پر مشتمل مکالموں کا یہ سیٹ فلم بینوں نے کافی پسند کیا۔ مغل اعظم کی کہانی خود کے آصف نے لکھی جو امتیاز علی تاج کے ڈرامے 'انارکلی' پر مبنی تھی اور جس کے حقوق کے آصف نے کافی پہلے خرید لیے تھے۔

لیکن اسکرپٹ اور مکالمے لکھنے کے لیے کے آصف نے ایک بورڈ تشکیل دیا جس میں امان اللہ خان (زینت امان کے والد)، وجاہت مرزا، کمال امروہی، احسن رضوی اور وہ خود شامل تھے۔ یہ سبھی اسکرپٹ اور ڈائلاگ کے میدان کے ماہر تھے۔ ان سب میں کام کس طرح تقسیم کیا گیا یہ تو کسی کے علم میں نہیں لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ آصف ان سبھی کو بلا کر یا الگ الگ مل کر منظرنامے اور مکالموں کے تمام نکات پر بحث اور مشورہ کرتے تھے جس کے بعد آخر میں خاص طور پر مکالمے ایک ایسی صورت میں سامنے آئے جن پر کہیں سے بھی انگلی رکھنا تقریباً ناممکن تھا۔ پوری طرح چست اور درست انداز میں اردو کی شوکت الفاظ کو بروئے کار لا کر لکھے گئے ان مکالموں نے پورے ملک میں اردو زبان کے حسن و دل کشی کے ڈنکے بجا دیے۔ اہل فلم ہی نہیں اہل قلم بھی ان مکالموں میں لفظوں کے دروبست سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فلم کے کچھ نغموں اور بعض مناظر میں ہندی زبان کے استعمال اور بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر مغل اعظم کے سنسر سرٹیفکیٹ میں زبان کے طور پر ہندی کا نام درج کیا گیا لیکن درحقیقت یہ خالص اردو کی فلم تھی۔ نقاب کشائی، جنبش مکن، سجدے میں نگاہ رہے، تمام ہوش و خرد پیش بادشاہ رہے، دفتر بے معنی، حد ادب، کلغی، پیوست، تخلیہ وغیرہ جیسے اردو کے ادبی متون کے درجے کے بیسیوں مشکل الفاظ پہلی مرتبہ 'مغل اعظم' میں ہی سنائی دیے اور مکالموں کا حسن ٹھہرے۔ یہ کام وہ تھا جسے سنیما کے پردے تک لانے کا حوصلہ اردو کی چند بہترین فلمیں بنانے والے سہراب مودی 'مرزا غالب' میں اور حقیقت پسند سنیما کی عظیم ترین شخصیت ستیہ جیت رے اپنی واحد اردو فلم 'شطرنج کے کھلاڑی' میں بھی نہ کر سکے۔

مغل اعظم کے مکالموں کو ہندوستانی سنیما میں مکالمہ نگاری کا سنگ میل بلکہ ٹرننگ پوائنٹ بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ مکالمے صرف اپنے لفظی یا صوتی حسن کی وجہ سے ہی غیر معمولی نہیں تھے بلکہ جذبات کی متاثر کن

ادائیگی کے لیے کس جگہ کس لفظ کا استعمال ہونا چاہیے اس کی بھی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ فلم کے کسی بھی منظر سے کسی بھی کردار کا کوئی بھی جملہ اٹھا لیجیے، آپ اسے بدل کر اس کی جگہ اس سے بہتر کوئی جملہ وضع نہیں کر پائیں گے۔

مغل اعظم کی کہانی کا خمیر تو امتیاز علی تاج کے مشہور ڈرامے 'انارکلی' سے ہی اٹھایا گیا ہے لیکن کے آصف نے کچھ اپنی طرف سے جوڑا بھی ہے۔ اس میں شاہی سنگ تراش کا کردار اور اس سے وابستہ کیے گئے واقعات خود ان کے اور وجاہت مرزا کے تخئیل کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ سنگ تراش کے ذریعے سلطنت اور انفرادی حکومت کے خلاف احتجاج کو اپنے فن کی بنیاد قرار دینا، زندہ انارکلی کو مجسمے کی شکل میں سامنے لانا فلم کے وہ حصے ہیں جنھیں فلم بین کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ منظر بھی نہیں بھلایا جا سکتا جس میں سنگ تراش، جس کا نام فلم میں نہیں دیا گیا ہے، شاہی کنیز بہار کا چیلنج قبول کرتے ہوئے کہتا ہے: ''تو پھر میں ایک ایسا مجسمہ تشکیل دوں گا، جس کے سامنے انسان اپنا دل، سپاہی اپنی تلوار اور شہنشاہ اپنا تاج قدموں میں رکھ دے گا۔'' اور یہ کہتے کہتے وہ علی الترتیب ایک نامکمل بے صورت مجسمے، ایک سپاہی کے بت اور ایک شہنشاہ کی مورت پر ہاتھ رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور کیمرے کی آنکھ کو ڈھک لیتا ہے۔ یہ منظر کردار کے جذباتی اظہار، مکالمے کے لفظی وروبست، فلم پراپرٹی کے استعمال اور فوٹوگرافی کے زاویے میں مکمل ہم آہنگی synchronisation کی بہترین مثال ہے۔

موسیقی کے لحاظ سے بھی مغل اعظم، ہندوستانی سنیما کے سو برس کی بہترین فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ فلم کا خاص نغمہ 'پیار کیا تو ڈرنا کیا' تھا جس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ آسکر ایوارڈ اور گرامی ایوارڈ تک پہنچنے والے ہندوستان کے پہلے فلمی موسیقار اے آر رحمٰن کی تو تمنا ہی یہ رہی ہے کہ کاش وہ اپنی زندگی میں اس جیسا کوئی نغمہ ترتیب دے سکیں۔ اس سے بھرپور فلمی نغمہ نہ تو مغل اعظم سے پہلے کبھی سنا گیا نہ اس کے بعد ترتیب دیا جا سکا ہے۔

لیکن اس فلم کی سب سے خاص چیز تھی اس کے مکالمے۔ هندوستانی سنیما کی یه پهلی فلم هے جس کے ڈائلاگ ایچ ایم وی نے ریکارڈ کی صورت میں پیش کیے اور تین لانگ پلے ریکارڈز پر مشتمل مکالموں کا یه سیٹ فلم بینوں نے کافی پسند کیا...
مغل اعظم کے مکالموں کو هندوستانی سنیما میں مکالمه نگاری کا سنگ میل بلکه ٹرننگ پوائنٹ بھی کها جائے تو غلط نه هو گا۔ یه مکالمے صرف اپنے لفظی یا صوتی حسن کی وجه سے هی غیر معمولی نهیں تھے بلکه جذبات کی متاثر کن ادائیگی کے لیے کس جگه کس لفظ کا استعمال هونا چاهیے اس کی بھی بهترین مثال پیش کرتے هیں۔ فلم کے کسی بھی منظر سے کسی بھی کردار کا کوئی بھی جمله اٹھا لیجیے، آپ اسے بدل کر اس کی جگه اس سے بهتر کوئی جمله وضع نهیں کر پائیں گے۔

محمد رفیع نے سنگ تراش کے بلیک میں جو احتجاجی نغمہ 'اے محبت زندہ باد' گایا تھا اس میں کورس کی صدابندی کے لیے نوشاد صاحب نے ایک سو لوگوں کا کورس استعمال کیا تھا جسے ایک ریکارڈ مانا جاتا۔

مغل اعظم اپنے وقت کی سب سے مہنگی فلم تھی، جس نے باکس آفس پر کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ کہتے ہیں کہ دہلی میں فلم کی ریلیز والے دن سے ایک روز پہلے ہی شام سے گولچہ سنیما کے باہر ٹکٹ خریدنے والوں کی قطار لگ گئی تھی اور لوگوں نے وہیں فٹ پاتھ پر بستر بچھا لیے تھے۔ بعد میں بلیک اینڈ وائٹ فلموں کو جدید تکنیک سے رنگین فلم میں تبدیل کرنے کا سلسلہ بھی مغل اعظم کی 'رنگ کاری' سے ہی شروع ہوا۔ اردو زبان کے لیے ہندوستانی سنیما کے تعلق سے یہ فخر کی بات ہے کہ ملک کی پہلی بولتی فلم، عالم آرا اسی زبان میں بنائی گئی اور پہلی سب سے کامیاب فلم مغل اعظم بھی اسی کے حصے میں آئی۔ عالم آرا کا پرنٹ تو خیر آج کسی کے پاس نہیں ہے لیکن مغل اعظم آج بھی کسی سنیما ہاؤس میں دکھائی جاتی ہے تو لوگ اسے دیکھنے نکل پڑتے ہیں۔

■

nusratzaheer@gmail.com

ستیہ جیت رے کی معنویت

قاسم خورشید

ہندوستانی سنیما کو سب سے پہلے دانشوری کا مکمل لباس عطا کرنے کا شرف ستیہ جیت رے کو حاصل ہوا۔

چونکہ سنیما عموماً تفریح سے جوڑ کر دیکھا جاتا رہا ہے اس لیے پوری دنیا میں جو فلمیں بنتی رہی ہیں ان میں تفریح کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔ ایسا نہیں کہ ستیہ جیت رے کی فلمیں اس خصوصیت کی حامل نہیں رہی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انھوں نے تفریح کے معیار کو بلند کیا اور عام اذہان کی بھی معیار سازی کی۔ اسی لیے ہندوستانی سنیما کو وقار کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ستیہ جیت رے 21 مئی 1921 کو کلکتہ میں پیدا ہوئے اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی اور جب 23 اپریل 1992 کو 70 سال کی عمر میں کلکتہ میں ہی ان کا انتقال ہوا تو ہندوستان اپنی نئی تاریخ لکھ چکا تھا۔ ایک طرح سے وہ اس تاریخ کا اہم ترین حصہ بھی تھے کیونکہ انھوں نے انگریزی دور حکومت دیکھا اور بعد میں آزاد ہندوستان کی بھی لگ بھگ آدھی صدی کا سفر طے کیا۔ بہتوں کی طرح ان کا بھی خواب تھا کہ آزادی کے بعد خصوصی طور پر ہندوستان کے غریبوں، مفلسوں کی تقدیر بدل جائے گی۔ ایک صحت مند ہندوستان کا تصور ابھرے گا۔ ایسے میں جب ان کی فلمیں منظر عام پر آنے لگیں تو اس میں ہندوستان کا دبا کچلا طبقہ ہی ایک بڑی آبادی کی پہچان تھا، ان کے کرداروں میں شامل تھا۔ اب ستیہ جیت رے پر یہ الزام عائد کیا جانے لگا کہ وہ ہندوستان کی غربت کو رومانیت عطا کرتے ہیں جس سے برٹش سوچ بھی متاثر ہوئی۔ اس طرح ان کی فلموں کو ہندوستان کے استحصال زدہ عوام کی زندگیوں کے احوال کے لیے پہچانا جانے لگا۔ بین الاقوامی سطح پر ان فلموں کو دیکھ کر ہی ہندوستان کا تصور کیا جانے لگا۔ حالانکہ ستیہ جیت رے نے حقیقت پسندی کے واضح نظریہ کو بغیر کسی تھوپے ہوئے رومانی تصور کے ساتھ فلموں میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی، عموماً اُس سماج کو فلموں میں بھی بہت زیادہ ترجیح نہیں دی جاتی تھی کیونکہ تفریح کے لیے فلمیں دیکھنے والوں کا مسئلہ کچھ اور ہوا کرتا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو احوال ہماری زندگیوں پر حاوی ہیں ہم انھیں سینما گھروں میں بھی جا کر کیوں دیکھیں؟ ستیہ جیت رے نے سنیما کو ایک آرگن کے طور پر استعمال کیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہم اپنے اندرون کو پہچانیں اور اپنی حقیقتوں کے پیش نظر زندگی کو نئی فکر عطا کرتے ہوئے ایک پر اعتماد ماحول میں اپنے حق کی لڑائی لڑیں۔ ایسا نہیں کہ سینما کے شائقین کی زندگی کے اندرون کو فلم کا موضوع حقیقی طور پر نہیں بنایا جاسکتا تھا ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل ترین اور

دادا صاحب پھالکے

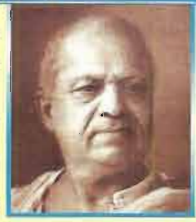

ہندوستانی فلموں کے بابا آدم کہے جانے والے دادا صاحب پھالکے کی پیدائش 30 اپریل 1870 میں ناسک کے گینکیشور میں ہوئی۔ ان کا اصل نام ڈھنڈی راج گووند پھالکے تھا۔ ان کے والد شاستری پھالکے ممبئی میں سنسکرت کے استاد تھے۔ نام دادا صاحب تھا۔ والد کو جب یہ اندازہ ہوا کہ ان کا بیٹا آرٹ میں دلچسپی رکھتا ہے تو انہیں جے جے اسکول آف آرٹس میں داخل کروا دیا۔ اپنا کیریئر انھوں نے گودھرا گجرات میں فوٹو گرافر کے طور پر شروع کیا، لیکن پہلی بیوی کے انتقال اور گودھرا میں بندروں کا طاعون پھیلنے کے بعد انھوں نے یہ کام چھوڑ دیا اور ممبئی آ گئے۔ دادا صاحب پھالکے پہلے تھے جنھوں نے ہندوستانی ساز و سامان اور عملے کی مدد سے پہلی فیچر فلم 'راجا ہریش چندر' کے نام سے 1912 میں بنائی۔ اس کی پہلی نمائش 3 مئی 1913 کو ممبئی کے کارونیشن سنیما میں ہوئی۔ اس فلم کی بے پناہ کامیابی کے بعد انھوں نے بھسما سر موہنی 1914، ستیہ وان ساوتری 1917، شری کرشن جنم 1918، کالیا مردن 1919، سیتو بندھن، گنگا اوترن سمیت انھوں نے 19 سال کے عرصے میں انھوں نے 95 فلمیں اور 26 مختصر فلمیں بنائیں۔ یہ سب خاموش فلمیں تھیں اور آخری فلم انھوں نے 1937 میں پیش کی۔ ہند نے اپنے اعلیٰ ترین فلم ایوارڈ کا نام ان کے نام پر رکھا ہے۔ دادا صاحب پھالکے کی وفات 16 فروری 1944 کو ہوئی۔

سہراب مودی

پارسی تھیٹر کو ہندوستانی سنیما میں منتقل کرنے، اردو کے یادگار ڈراموں کو فلموں میں جگہ دینے، اور ہندوستانی سنیما کے لیے تاریخ پر مبنی بعض سب سے اچھی فلمیں بنانے والے سہراب میروان جی مودی 2 نومبر 1897 کو ریاست اتر پردیش کے قصبہ رامپور کے پارسی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہے اور میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی تھیٹر میں دلچسپی کی وجہ سے جلد ہی بمبئی آ گئے، اور معاون میکنک پروجیکشن کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بولتی فلموں کی شروعات کے بعد جب تھیٹر رو بہ زوال ہوا تو انھوں نے فلموں میں طبع آزمائی کی اور خون کا خون اور صید ہوس جیسی فلمیں بنائیں جو شیکسپیئر کے ڈراموں پر مبنی تھیں۔ سہراب مودی فلموں میں پر فکشن کے قائل تھے۔ سماجی فلموں کے بعد انھوں نے تاریخی شخصیتوں پر فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ پکار، سکندر، پرتھوی ولبھ، مرزا غالب، جھانسی کی رانی اسی سلسلے کی فلمیں تھیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں سہراب مودی ایک فلم گرو دکشنا بنانے کے خواہش مند تھے لیکن 28 جنوری 1984 کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی یہ خواہش پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ سہراب مودی نے دوسرے پروڈیوسروں کی فلموں میں بھی کام کیا جن میں یہودی اور رضیہ سلطان خاص ہیں۔

بہت حد تک خشک معاملہ بھی تھا۔ کیونکہ غربت کو کلاسیکی رچاؤ اور پرکشش انداز میں پیش کرنا بھی کسی بڑے فنکار کا ہی شائبہ ہوسکتا ہے۔ چونکہ ستیہ جیت رے صرف فلمساز نہیں تھے بلکہ وہ ایک عمدہ فکشن نگار بھی تھے۔ اس لیے سماج پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ ہر کردار کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے فن سے واقف تھے۔ پاتھیر پنچالی (1955) غالباً ان کے افکار کی بلندیوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اگر وہ صرف یہی ایک کام کر دیتے تو بھی عالمی سطح پر ان کی شناخت زندہ وتابندہ رہتی۔ ان کی دانشوری پر تفصیلی گفتگو ہوسکتی ہے۔ کیونکہ جہاں وہ رویندر ناتھ ٹیگور، جین رینوائیر، وائی ٹوریو ڈیسائیکا اور جان فورڈ سے متاثر رہے وہیں انھوں نے شیام بینگل، مارٹین اسکارسیس، الکزنڈر پائینے، اسماعیل مرچنٹ، میرا نائر، اپرنا سین وغیرہ کو بے حد متاثر ہی نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے ان کے آئیڈیل بھی بنے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان گیر سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر آرٹ سینما کے فلم سازوں نے ستیہ جیت رے میں ہی اپنی فکری جائے اماں تلاش کی۔ ستیہ جیت رے 1950 سے 1992 تک فعال رہے اور انھوں نے مختلف موضوعات پر فلمیں بنائیں۔ رویندر ناتھ ٹیگور کی کہانیاں ہوں، پریم چند ہوں یا ایسے ہی دوسرے بڑے فکشن نگار ہوں۔ ان کی کہانیوں پر اپنے مخصوص انداز میں انھوں نے فلمیں بنائیں اور آج بھی ہم انھیں سنگ میل سمجھتے ہیں۔ شطرنج کے کھلاڑی (1977) کا ذکر یہاں اس لیے ناگزیر ہے کہ اس فلم میں سنجیو کمار، سعید جعفری، امجد خاں، شبانہ اعظمی، وکٹر بنرجی اور ریچرڈ ایٹنبرو کے توسط سے جس طرح فلم کو ایک کلاسیکی روپ دیا گیا ہے وہ اب بھی نئے فلم سازوں کے لیے مشعل راہ ہے کیونکہ ستیہ جیت رے عموماً اپنی تمام فلموں میں نہ صرف یہ کہ ہدایت کی سطح پر بلکہ فلم کے ہر شعبے میں اپنی تخلیقیت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ جہاں تک موسیقی کا معاملہ ہے وہ خود بھی بہترین میوزک ڈائریکٹر اور نغمہ نگار بھی تھے۔ اسی لیے انھیں عالمی سینما میں ایک مکمل ہدایت کار تصور کیا جاتا ہے۔ عموماً انھوں نے بنگلہ میں فلمیں بنائیں لیکن ان کی تمام مشہور فلمیں انگریزی اور دوسری زبانوں کے ناظرین کے لیے بھی موجود ہیں۔ پاتھیر پنچالی (1955) اپراجیتو (1956) پارس پتھر (1958) اپور سنسار (1959) جل ساگر (1958) دیوی (1960) تین کنیا (1961) ابھیجان (1962) مہانگر (1964) مہا پرش (1965) کاپرش (1965) نائک (1966) کنچن جنگھا (1962)

وی شانتا رام

ہندوستانی فلم انڈسٹری میں وی شانتا رام کا نام نہ صرف اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے پہلی بار فلموں میں فیڈ ان اور فیڈ آوٹ تکنیک، سلوموشن تکنیک اور اسٹیریو فونک ساؤنڈ تکنیک کا استعمال کیا بلکہ اس لیے بھی ان کا احترام کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ہر فلم میں ایک سماجی پیغام دیا اور فلم کے بیانیے کو آرٹ کے درجے پر پہنچایا۔ شانتارام راجہ رام وان کدرے 18 نومبر 1901 کو کولہاپور میں پیدا ہوئے۔ ان کی اہم فلموں میں، ڈاکٹر کوٹنیس کی امر کہانی، جہیز، جھنک جھنک پایل باجے، تین بتی چار راستے، دو آنکھیں بارہ ہاتھ، نورنگ، استری، سہرا، گیت گایا پتھروں نے، پنجرہ، جل بن مچھلی نرت بن بجلی شامل ہیں۔ ان کی وفات 30 اکتوبر 1990 کو ممبئی میں ہوئی۔ ان کا قائم کیا ہوا راج کمل اسٹوڈیو ممبئی کا سب سے بڑا اور مکمل فلم اسٹوڈیو ہے۔

محبوب خان

محبوب خان کا نام آتے ہی ذہن کے پردے پر فلم مدر انڈیا چلنے لگتی ہے۔ ان کی پیدائش 7 ستمبر 1909 میں بڑودا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی۔

ان کے والد رمضان خان سپاہی تھے۔ ابتدائی تعلیم سے محروم رہے لیکن کچھ کرنے کی للک ان کے دل میں تھی جس کے باعث 16 برس کی عمر میں گھر سے بھاگ کر ممبئی آگئے اور 19 برس کی عمر میں امپیریل کمپنی میں بطور معاون اداکار ماہانہ 30 روپے پر کام کرنے لگے۔ ان کی ہدایت کاری میں تیار ہونے والی اولین فلم ججمنٹ آف گاڈ ہے۔ اس کے بعد الہلال، ڈکن کوئین، منموہن، جاگیردار، وطن، جوانی روٹی، نئی روشنی، آواز اور عورت وغیرہ ہیں۔ عورت کو بعد میں انھوں سینما اسکوپ اور رنگین پرنٹ کے ساتھ مدر انڈیا کے نام سے بنایا جو عورت سے بھی بڑی ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ اس سے پہلے وہ آن بنا چکے تھے جو ہندوستان کی پہلی ٹیکنی کلر فلم تھی۔ سن آف انڈیا ان کی آخری فلم تھی۔ اسی دوران ہندوستان پر چین کے حملے کے خلاف انھوں بہت سے فلمی ستاروں کو لے کر ساحر لدھیانوی اور جاں نثار اختر کے لکھے ہوئے قومی یک جہتی کے دو ترانوں (وطن کی آبرو خطرے میں ہے، اور، آواز دو ہم ایک ہیں) پر ایک ایک ریل کی دو فلمیں بنائیں۔ ان ترانوں کی موسیقی خیام نے ترتیب دی تھی اور محمد رفیع نے انھیں گایا تھا۔ تمام فنکاروں نے کوئی معاوضہ لیے بغیر ان فلموں کے لیے کام کیا تھا۔ 27 مئی 1964 کو پنڈت جواہر لعل نہرو کے مرنے کی خبر سننے کے بعد محبوب خاں کو صدمے سے دل کا دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہوگیا۔

بمل رائے

دو بیگھہ زمین، دیوداس، مدھومتی اور آغا حشر کاشمیری کے اردو ڈرامے یہودی کی لڑکی پر فلم 'یہودی' بنا کر ہندوستانی سنیما کا معیار اور وقار بلند کرنے والے بمل رائے 12 جولائی 1909 کو بنگلہ دیش کے سواپور کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے، لیکن کم عمری میں ہی ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور گھر کی ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر آپڑیں۔ ممبئی آنے کے بعد بمل رائے کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ان کو اپنی فلم دیوداس میں معاون بنایا تھا۔ انھوں نے دو درجن سے زائد فلموں میں ہدایت کاری کے جوہر دکھائے تھے، ان میں سے نصف درجن فلموں کو تو فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ جن میں دو بیگھہ زمین، پرنیتا، براج بہو، مدھومتی، سجاتا، پرکھ اور بندنی شامل ہیں۔ بمل رائے کی فلم دو بیگھہ زمین، نے فلمی روایات کی تمام بندشوں کو توڑ کر حقیقت پسند سنیما کی داغ بیل ڈالی اور فلم نے اس دور میں کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دئے تھے۔ اس فلم کو فرانس میں ہونے والے کانز فلمی میلے میں بھی بین الاقوامی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ستیہ جیت رے، ریتوک گھٹک، مرنال سین، تپن سنہا وغیرہ نے بمل رائے کی صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ 7 جنوری 1966 کو 56 سال کی عمر میں وہ ممبئی میں انتقال کر گئے۔ 2007 میں بمل رائے کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری ہوا۔

کمال امروہی

فلموں میں کے آصف کی طرح پرفیکشنسٹ مانے جانے، اور گہرا ادبی ذوق وشعور رکھنے والے کمال امروہوی 17 جنوری

چڑیا خانہ (1967) گوپی گائن باگھا بائن (1969) ارنیا دن راتری (1970) اسنی سنکیت (1973) شما بدھا (1974) سونار قلعہ (1974) جنا رنیا، بالا (1976) شطرنج کے کھلاڑی (1977) جے بابا پھیلوناتھ (1978) ہیرک راجر دیشے پیلو (1980) سدگتی (1981) گھر بائیرے (1984) گنا شترو (1989) شاکھا پروشاکھا (1990) آگنتک (1991) وغیرہ کا اس ضمن میں ذکر ناگزیر ہے۔ ان میں سے لگ بھگ تمام فلموں کو دنیا کے کسی نہ کسی بڑے ایوارڈ سے نوازا گیا جن میں USA اکیڈمی ایوارڈ، برلن انٹرنیشنل فلم فیسٹیول ایوارڈ، نیشنل فلم ایوارڈ، سلورلوٹس ایوارڈ، گولڈن گیٹ ایوارڈ، ماسکو انٹر نیشنل ایوارڈ، فلم فیئر ایوارڈ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہاں میں یہ کہتا چلوں کہ جب تک فلم کا ہدایت کار اس کے تمام شعبے میں فنی سطح پر باشعور نہیں ہوتا تب تک وہ کامیاب ترین ہدایت کار نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ یہ ایک اجتماعی عمل ہے جس میں ہر شخص کی اپنی الگ اہمیت ہوا کرتی ہے۔ لیکن ہدایت کار چاہے بظاہر ہر جگہ موجود نہ بھی ہو لیکن اس کی فکری شبیہ پوری فلم پر ضرور حاوی ہوتی ہے۔ ستیہ جیت رے نے اس لیے تصویری دنیا میں حیات جاودانی حاصل کی کہ وہ اپنی ہر تخلیق پر پوری عرق ریزی کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ آگنتک، شطرنج کے کھلاڑی، نائک، مہا پرش، تین کنیا، دیوی، اپور سنسار وغیرہ کی طرح ٹیگور کے ناول پر مبنی ان کی فلم 'گھرے بائیرے' اس کی زندہ مثال ہے کہ یہ فلم 1983 میں شروع ہوئی اور اسی دوران ستیہ جیت رے عارضہ قلب کے شکار ہوئے پھر بھی پوری عرق ریزی کے ساتھ فلم کو مکمل کرنے کی کاوش کرتے رہے اور بالآخر 1984 میں یہ فلم تیار ہوئی اور عالمی سنیما میں زندہ شناخت قائم کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ستیہ جیت رے نے دنیا بھر

1918 کو امروہہ اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام سید امیر حیدر کمال نقوی تھا۔ کمال امروہی شاعر بھی تھے اور انھوں نے فلموں کی ہدایت کاری کے علاوہ مکالمے لکھے۔ کمال امروہی نے پہلے فلموں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ سہراب مودی کی فلم پکار اور بھروسہ فلم کی کہانیاں ان ہی کی لکھی ہوئی تھیں۔ پکار کے ڈائلاگ بھی ان ہی کے تحریر کردہ تھے۔ انھوں نے 1958 میں ممبئی میں کمالستان اسٹوڈیو کی بنیاد ڈالی۔ ان کی ہدایت میں بننے والی پہلی فلم محل اپنے دور کی سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ بعد میں ایک فلم دل اپنا اور پریت پرائی انھوں نے مشہور ہدایت کار کشور ساہو سے ڈائریکٹ کرائی۔ اسے بھی کامیابی ملی۔ لیکن پاکیزہ 1972 نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ انھوں نے دوسری شادی مشہور اداکارہ مینا کماری سے کی تھی مگر یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی۔ انھیں فلم مغل اعظم کے لیے بہترین مکالمہ نویس کے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ بعد میں انھوں نے فلم رضیہ سلطان بنائی، جو ہر لحاظ سے ایک بہترین فلم تھی لیکن فلم کے مکالموں کا انداز اور ڈکشن مختلف ہونے کی وجہ سے اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ 75 برس کی عمر میں 11 فروری 1993 میں ممبئی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

رشی کیش مکھرجی

ہندوستانی سنیما کو ہلکے پھلکے نیم مزاحیہ انداز میں سنجیدہ فلمیں دینے والے رشی کیش مکرجی کا کوئی جواب ہندوستانی سنیما کے پاس نہیں ہے۔ وہ 30 ستمبر 1922 کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ 'رشی دا' کے نام سے مشہور رشی کیش نے ممبئی میں اپنے فلمی کیریئر کا آغاز نامور ہدایت کار بمل رائے کے ساتھ بطور فلم ایڈیٹر کیا۔ فلم ایڈیٹنگ کا فن بھی انھوں نے بمل دا سے ہی سیکھا۔ دو بیگھہ زمین اور دیوداس کی ایڈیٹنگ رشی دا نے ہی کی تھی۔ انھوں نے چھیالیس سے زیادہ فلموں کی ہدایت کاری کی۔ ان میں مسافر، اناڑی، آنند، ابھیمان، اصلی نقلی، گڈی، خوبصورت، چپکے چپکے، بڈھا مل گیا اور گول مال بہت مقبول ہوئیں۔ سماجی مسائل کو انھوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ پردے پر پیش کیا۔ اس کے لیے ان کی فلم 'ستیہ کام' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ غیر معمولی فلمی خدمات کے سبب رشی دا کو انیس سو نناوے میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھیں 1999 میں پدم وبھوشن اور انیس سو ساٹھ میں فلم انورادھا کے لیے صدر جمہوریہ میڈل بھی دیا گیا۔ 27 اگست 2006 کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔

کے آصف

سب سے کم فلمیں بنا کر سب سے زیادہ نام کمانے والے ہدایت کاروں میں کے آصف کا نام سر فہرست ہے۔ بطور ہدایت کار انھوں نے صرف دو فلمیں، پھول اور مغل اعظم، ہندوستانی سنیما کو دیں جب کہ تیسری فلم محبت اور خدا ان کی بے وقت موت سے نامکمل رہ گئی اور اسی نامکمل حالت میں برسوں بعد ریلیز ہوئی، ایک فلم ہلچل کے وہ صرف پروڈیوسر تھے۔ کے آصف اتر پردیش کے اٹاوہ شہر میں 1924 میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر فضل کریم ان کے والد اور ایکٹر ڈائریکٹر پروڈیوسر نذیر احمد خان ان کے برادر نسبتی تھے۔ ان کا پورا نام کریم الدین آصف تھا مگر فلمی دنیا میں کے آصف کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے تیس برس کی مدت میں محض تین فلمیں ہی بنائیں۔ جن میں پھول 1945، ہلچل 1951 (ہدایت کار ایس کے اوجھا) اور فلمی تاریخ کی شاہکار فلم مغل اعظم 1960 میں جس نے کے آصف کو اہم مقام عطا کیا۔ کے آصف کی چوتھی فلم 9 مارچ 1971 میں ان کو دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال ہو جانے سے ادھوری رہ گئی۔

یش چوپڑا

رومانس کو مستقل اپنی فلموں کا موضوع بنائے رکھنے والے منفرد ہدایت کار یش چوپڑہ کے ذکر کے بغیر ہندوستانی فلموں کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ نامور ہدایت کار، فلمساز اور صحافی بی آر چوپڑہ کے چھوٹے بھائی یش راج چوپڑا 27 ستمبر 1932 میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ پہلے وہ اپنے بڑے بھائی کی فلم کمپنی میں ہی تھے، جس کے لیے انھوں نے دھول کا پھول، دھرم پتر، وقت اور آدمی اور انسان جیسی انوکھی فلمیں ڈائریکٹ

کے ہدایت کاروں کو متاثر کیا اور آج بھی وہ آئیڈیل بنے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں مارٹین اسکورسیسی نے کرشن گبرانی اور ارون بھنوت سے گفتگو کے دوران ستیہ جیت رے سے متعلق کہا ہے کہ:

''ستیہ جیت رے کی انسان دوستی کا طرزِ عمل وہ چیز ہے جس نے مجھے متاثر کیا۔ میں ان کی فلموں کی طرح فلمیں بنانا چاہتا تھا۔ ایسی فلمیں جو ثقافتی حدبندیوں اور قومی سرحدوں سے بالاتر ہوں اور ہر کسی تک پہنچ سکیں۔ میرا خیال ہے کہ امریکہ میں یہی چیز اب خطرناک ہوگئی ہے۔ امریکی اب غیر ملکی فلمیں نہیں دیکھتے۔ اور اس لیے میں انھیں بدلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے کچھ پرانی فلمیں پھر سے نمائش کے لیے پیش کرنے کی کوشش کی ہے میں نیلوکینو وسکونٹی کی فلم، روکو اینڈ ہز برادرس، دوبارہ نمائش میں لگوائی ہے اور یہی سبب ہے کہ میں نے ستیہ جیت رے کی فلموں کی بحالی میں اسمٰعیل مرچنٹ کی مدد کی۔ مرچنٹ نے امریکہ میں ستیہ جیت رے کی فلموں کی نمائش میں جو مدد کی ہے وہ بہت اہم ہے۔''

یہاں یہ فکر واضح ہوجاتی ہے کہ ستیہ جیت رے کا ویژن کتنا بلند تھا انھوں نے عالمی سینما کو مین اسٹریم میں لانے کی جو کوششیں کی تھیں وہ موجودہ عہد میں بھی عصری تقاضوں کو پورا کر رہی ہیں۔ امریکی سینما میں جو خطرناک رویے سامنے آئے ہیں ستیہ جیت رے نے انھیں پہلے ہی محسوس کرلیا تھا۔ لیکن کبھی انھوں نے ایسی طاقتوں کے سامنے سپر نہیں ڈالا بلکہ اپنے اعتماد کے ساتھ نئی راہ اختیار کی۔ آج حالات بدل چکے ہیں اسی لیے سینما کی تاریخ نئے سرے سے لکھی جارہی ہے۔ نئی نسل کے فلمساز عالمی بازار میں ہندوستانی سینما کو بہت ہی فخر کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اور انھیں نہ صرف یہ کہ خاطر خواہ کامیابی مل رہی ہے بلکہ وہ دوسرے شعبوں کو متاثر بھی کر رہے ہیں۔

آج اگر ستیہ رجیت رے کی فلمیں ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر عالمی سطح پر آئیڈیل بن رہی ہیں تو یہ ایک خوبصورت اور زندہ علامت ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی سینما اپنی تمام گہرائیوں اور گیرائیوں کے ساتھ پوری دنیا کے لیے مشعل راہ بن جائے۔ ہم یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:

آنے والی نسلیں تم کو بھول سکیں ناممکن ہے
نقش قدم کے مٹتے مٹتے راہ گزر بن جائیں گے

◘

(Dr.) Quasim Khursheed, Head
Languages), Mahendru Patna - 800006
(Bihar)

گیں۔ بعد میں وہ آزادانہ طور پر کام کرنے لگے۔ ان کی اہم فلموں میں دیوار، ترشول، سلسلہ، کبھی کبھی، چاندنی اور دل تو پاگل ہے، دل والے دلہنیا لے جائیں گے، لمحے، دھوم 2، نیویارک اور رب نے بنادی جوڑی، جیسی سپرہٹ فلمیں شامل ہیں جن میں سے کئی ان کی ہدایت کی بجائے ان کی سرپرستی میں بنیں۔ انھوں نے 1973 میں یش راج فلمز کے نام سے ایک پروڈکشن کمپنی قائم کی۔ اپنی فلموں میں ہمیشہ عورتوں کے کردار کو مرکزی حیثیت دینے والے یش چوپڑا کو دادا صاحب پھالکے سمیت کئی اہم اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ فرانس، سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ کی حکومت نے بھی یش چوپڑا کی فلمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی عزت افزائی کی ہے۔ 2009 میں کوریا میں ہونے والے فیسٹول میں انھیں بہترین فلمساز کے اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا۔ 21 اکتوبر 2012 میں ممبئی میں انتقال کرگئے۔ بطور ہدایت کار ان کی آخری فلم 'جب تک ہے جان' تھی جس کی ریلیز سے قبل ہی وہ چل بسے۔

شیام بینیگل

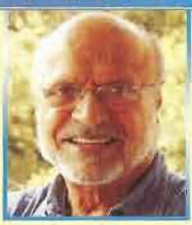

یوں تو نئے ہندوستانی سینما یا آرٹ فلموں کی شروعات کرنے والوں میں کئی نام لیے جاسکتے ہیں لیکن ستیہ جیت رے کے بعد اسے باضابطہ ایک شکل، نظریہ اور انداز دینے والے ہدایت کار و فلم ساز شیام بینیگل ہیں۔ وہ مالوہ سکندر آباد (آندھرا پردیش) میں 14 دسمبر 1934 کو پیدا ہوئے۔ اڑیسہ یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ اڑیسہ چلے گئے جہاں FTII میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ پھر اشتہارات کی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ فیچر فلم کی طرف آنے سے پہلے وہ اشتہاری فلمیں بناتے تھے۔ پہلی فیچر فلم 'انکور' انیس سو تہتر میں بنائی تھی اور اس میں انھوں نے شبانہ اعظمی کو متعارف کرایا۔ اس کے علاوہ بینیگل نے فلمی دنیا کو نصیر الدین شاہ، اوم پوری، سمیتا پاٹل اور کل بھوشن کھربندہ جیسے فنکار بھی دیے جن کا شمار ہندی سینما کے بہترین اداکاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے چار فلمیں ایسی دیں جنھوں نے بینیگل کو ڈھیر سارے ایوارڈ دلائے اور انھیں ممتاز فلمسازوں کی فہرست میں لاکر کھڑا کردیا۔ ان کی فلمیں انکور، منتھن، نشانت اور بھومیکا ہندوستانی سماج میں عورتوں کے مسائل، مزدوروں اور زمینداروں کے رشتوں اور سماج کے سلگتے مسائل پر مبنی تھیں۔ اردو ادب سے انھوں نے خوب استفادہ کیا۔ غلام عباس کے شہرہ آفاق افسانے 'آنندی' پر انھوں نے منڈی اور جیلانی بانو کی کہانی 'نرسیاں کی باوڑی' پر، ویل ڈن ابّا کے نام سے فلمیں بنائیں جنھیں بے حد پسند کیا گیا۔ بینیگل نے ٹی وی سیریل یاترا، اور بھارت ایک کھوج کے علاوہ چند یادگار دستاویزی فلمیں بھی بنائی ہیں جن میں 'چائلڈ آف دی سٹریٹ' اور 'ستیہ جیت رے' شامل ہیں۔ 2007 میں ہندوستان کی حکومت نے انہیں فلمی دنیا کے لیے مختص سب سے بڑے ایوارڈ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا۔

گلزار

فلم اور ادب کی کثیر الجہات شخصیت گلزار کو نئے سینما کے خدو خال سنوارنے والی اہم ترین شخصیتوں میں گنا جاتا ہے۔ اپنے پہلے فلمی گیت 'میرا گورا انگ لئی لے، موہے شیام رنگ دئی دے' سے انھوں فلمی نغمہ نگاری کا سفر شروع کیا، 'میرے اپنے' سے وہ ایک بڑے ہدایت کار کے طور پر سامنے آئے، اور 'آنند' جیسی فلموں سے انھوں نے مکالمہ نگاری اور فلم اسکرپٹ کے شعبوں میں اپنے فن کا لوہا منوایا۔

گلزار کی پیدائش مغربی پنجاب کے جھیلم ضلع کے دینا پور گاؤں میں 18 اگست 1936 میں ہوئی۔ ان کا اصل نام سمپورن سنگھ کالرا ہے۔ ان کی اہم فلمیں میرے اپنے، آندھی، کوشش، اچانک، خوشبو، موسم، ماچس، ٹی وی سیریل مرزا غالب اور کردار ہیں۔ گلزار کو تین بار قومی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1972 میں فلم کوشش کے لیے بہترین اسکرین پلے ایوارڈ، 1975 میں موسم فلم کے لیے بہترین ہدایت کار، 1987 میں اجازت فلم کے لیے بہترین نغمہ نگار، 2009 میں سلم ڈاگ ملینئر کے گیت 'جے ہو' کے لیے آسکر ایوارڈ دیا گیا۔ ہندوستانی سینما میں ان کی اہم خدمات کے لیے انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ 2002 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں اور 2012 میں انھیں اندرا گاندھی قومی یک جہتی ایوارڈ بھی دیا گیا۔

اس مضمون کے ساتھ دیے گئے مختلف شخصیتوں کے سوانحی کوائف 'اردو دنیا' کے ادارتی شعبے کی ٹیم نے مختلف ذرائع سے ملنے والے حوالوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ ادارہ

ایندھن کی قیمتوں میں 50% کی کٹوتی

صرف کارپولرس کے لئے!

اپنی ایندھن کی قیمتوں میں 50% کٹوتی کے لئے ، آپ کو صرف ایک کارپول سے وابستہ ہونا ھے۔

اکیلے سفر کرنے کی بجائے، اپنے دفتر یا علاقے کے کم از کم کسی ایک کار مالک کو لفٹ دیں۔ اگر سارا شہر کارپولنگ شروع کردے، تو ٹرافک جام 50% کم ہو جائیں گا اور ہندوستان کو ہر سال ایندھن کی درآمدات پر 5000 کروڑ روپئے کی بچت ہوگی۔

یہ ہمارے محدود ایندھن کے وسائل کو بھی باقی رکھنے اور ایندھن کے بل کو بڑھنے سے روکنے کا بہترین طریقہ ہے۔

اگر آپ کے پاس ایندھن کو بچانے کا کوئی انوکھا طریقہ ہے، تو ہم سے www.pcra.org پر رابطہ قائم کریں اور ہم ساری دنیا کو آپ کی کہانی بتائیں گے۔ ہر عمل معنی رکھتا ہے۔

SAVE FUEL
YAANI SAVE MONEY

PCRA
PETROLEUM CONSERVATION RESEARCH ASSOCIATION.
Ministry of Petroleum & Natural Gas, Govt. of India.

davp 33104/13/0002/1213

Tel. 011-26198809

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

جامعہ ملیہ اسلامیہ

ٹیگور ٹرانسلیشن ورکشاپ

نئی دھلی: شاعری کے ترجمے میں آہنگ اور شعریت کا ہونا ضروری ہے۔ کسی بھی زبان سے شاعری کا ترجمہ بے حد مشکل ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خالد محمود نے جامعہ ملیہ میں منعقدہ پانچ روزہ ٹیگور ٹرانسلیشن ورکشاپ کے اختتامی جلسے میں کیا۔ صدارت پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر سلیمان خورشید، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر محمد ظفرالدین نے کی اور نظامت کی ذمے داری ٹیگور پروجیکٹ کے کوآرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے ادا کی۔ ورکشاپ میں ملک

کے مختلف حصوں سے متعدد نامور مترجمین، اسکالرز اور اساتذہ نے شرکت کی۔ جن میں پروفیسر عبدالصمد (پٹنہ) پروفیسر م ن سعید (بنگلور) پروفیسر ظفرالدین (حیدرآباد) شمیم طارق (ممبئی) پروفیسر آفاق احمد، عارف عزیز، اقبال مسعود، رشید انجم (بھوپال) محمد ابوذر ہاشمی، پروفیسر سلیمان خورشید (کلکتہ) ڈاکٹر مشتاق احمد (دربھنگہ) ڈاکٹر راشد عزیز (سری نگر) ڈاکٹر شریف احمد قریشی، ڈاکٹر جاوید نسیمی (رام پور) پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر گووند پرساد، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر ارجمند آرا، مظفر علی، فرحت احساس، مرزا عبدالباقی بیگ، عبدالرشید (دہلی)، ڈاکٹر نشی محمد یونس، ڈاکٹر عبدالنصیب، محمود الحسن (دہلی) کے علاوہ شعبے کے اساتذہ پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہناز انجم، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر خالد جاوید، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر سرورالہدیٰ، ڈاکٹر خالد مبشر بھی شریک ہوئے۔ ورکشاپ میں شعبے کے ریسرچ اسکالرز مطیع اللہ خاں، محمد یوسف وانی، محمد قمر، حافظ محمد جہانگیر اکرم، شاہ نواز فیاض، ساجد ذکی فہمی، ثاقب عمران، سلمان فیصل، نوشاد منظر، محمد علام الدین اور عارف اقبال بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ترجمے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ جس موضوع پر آپ کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں اس سے واقفیت اور شوق و ذوق بھی ہو۔ کتاب شائع ہونے سے قبل یہ بھی ضروری ہے کہ بنگلہ زبان کے عالموں کی نظر اس کے متن پر پڑ جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بنگالی اور انگریزی متن کا بنیادی حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے تمام شرکا کے انہماک، لگن اور محنت کی تعریف کی اور کہا کہ یہ بیحد خوش گوار تجربہ رہا ہے۔ اس موقعے پر ٹیگور پروجیکٹ کے کوآرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ مارچ 2013 میں ٹیگور پروجیکٹ کا آئندہ ورکشاپ انشاء اللہ کولکاتا میں منعقد کیا جائے گا جس میں ٹیگور کے خطوط، انٹرویوز، ڈرامے اور بچوں کے ادب کا ترجمہ کیا جائے گا۔

پریس ریلیز، شہزاد انجم، پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 21 دسمبر 2012

ابن صفی کے فن و شخصیت پر سیمینار

نئی دھلی: آرٹ اور ادب میں عوامی روایت شامل نہ ہو تو اظہار کے نئے پیرائے وجود میں نہیں آسکیں گے۔ کوئی بھی زبان صرف کلاسیکی ادب کے ذریعے قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس میں عوامی ادب نہ شامل ہوں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایمریٹس شمیم حنفی نے سہ روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے کلیدی خطبہ میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ابن صفی کی شخصیت اور فن پر سیمینار منعقد کرنا ایک جرأت مندانہ اقدام ہے۔ اس طرح ابن صفی کے تخلیقی ادب کا احیا ہو رہا ہے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر نجیب جنگ نے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا ابن صفی کی تحریروں سے میں نے اردو زبان سیکھی اور ابن صفی کی تحریریں ہمارے لیے زادِ سفر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جتن پرساد افتتاحی اجلاس میں بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ کے بارے میں بچپن سے سنتا چلا آ رہا ہوں اور آج یہاں کی تہذیب و ثقافت اور تعلیمی ماحول کو دیکھ کر بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ سیمینار کے دوسرے دن دو سیشن ہوئے، پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر مظفر حنفی، اے رحمٰن اور سی آئی ٹی جامعہ کے ڈائرکٹر پروفیسر زاہد حسین خان نے کی جب کہ نظامت جامعہ کے استاد ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔ دوسری نشست کی صدارت جامعہ کے رجسٹرار پروفیسر ایس ایم ساجد، پروفیسر شہناز انجم اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی۔ سیمینار کے تیسرے اور آخری دن دو مرحلے میں سیمینار ہوا اور اس کے بعد

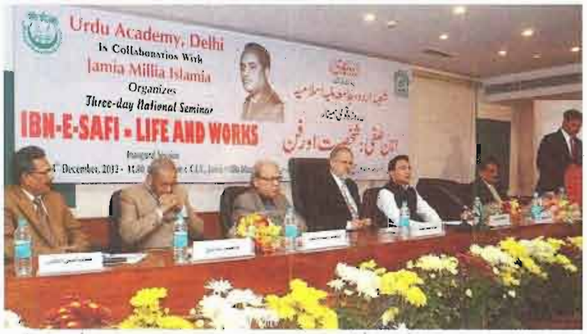

اختتامی تقریب منعقد ہوئی۔ پہلی نشست کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر ایم اے ابراہیمی نے کی جب کہ نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر احمد محفوظ نے ادا کی۔ چوتھے اور آخری اجلاس میں پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر صادق، پروفیسر محمد شاہد حسین اور پروفیسر شہزاد انجم نے صدارت کی۔ اختتامی اجلاس کے مہمان خصوصی سابق وائس چیئرمین آئی سی سی سید شاہد مہدی نے ابن صفی کو ہمہ جہت صلاحیت کا حامل بتایا۔ کنوینر سیمینار کمیٹی پروفیسر عبدالحق نے ابن صفی کی خدمات کو سراہتے ہوئے مذہبی مواد کو بھی ادب میں شامل کرنے کی رائے پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15،16،17 دسمبر 2012

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

غالب کی فارسی شاعری پر لیکچر

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) کے سینٹر آف انڈین لینگویجز کے زیر اہتمام تیسرے فیض میموریل لیکچر بعنوان 'غالب کی فارسی شاعری' کا انعقاد کیا گیا۔ خصوصی لکچر کے لیے ہند نژاد، ڈاکٹر تقی عابدی مدعو تھے۔ اجلاس کے کنوینر پروفیسر معین الدین جینابڑے نے خطیب اجلاس اور صدر اجلاس پروفیسر اسلم اصلاحی کا تعارف کرایا۔ پروفیسر مظہر مہدی نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ ڈاکٹر عابدی کے بقول غالب ایک نابغۂ روزگار شاعر تھے۔ انھیں بلا تکلف دنیا کے عظیم شعرا کی جماعت میں رکھا جاسکتا ہے۔ غالب کی اردو شاعری کی طرح ان کی فارسی شاعری بھی عظیم ہے۔ غالب کی فارسی شاعری فقط تفکر کی نہیں، جذبے کی بھی شاعری ہے۔ ان کی فارسی شاعری میں بھی جذبات و احساسات کے تقریباً وہ تمام مضامین پائے جاتے ہیں جن مضامین سے ان کی اردو شاعری مملو ہے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں غالب کی غزلیات کے علاوہ ان کی مثنویوں اور نعت و حمد کا بھی جائزہ لیا۔ پروفیسر اسلم اصلاحی نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ غالب کے کلام کا مکمل طور پر جائزہ لیا جانا چاہیے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 دسمبر 2012

لکھنؤ یونیورسٹی

دوارکا پرشاد افق کے فن پر سیمینار

لکھنؤ: نیوکلیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں ملک الشعرا دوارکا پرشاد 'افق' کی حیات و خدمات پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مشہور شاعر و سابق صدر شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے عالی جناب عزت مآب بی ایل جوشی گورنر اتر پردیش شامل ہوئے۔ پروگرام میں مہمان اعزازی کے طور پر جی بی پٹنا یک، وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر سدھا کر ادیب ڈائرکٹر ہندی سنستھان اتر پردیش، سینئر صحافی و افسانہ نگار عابد سہیل، پروفیسر شارب رودولوی، سابق صدر شعبۂ اردو جواہر لال نہرو یونورسٹی، ڈاکٹر گوپال چترویدی سابق کارگزار صدر بھاشا سنستھان اتر پردیش، پروگرام کی نظامت

بنارس ہندو یونیورسٹی

اقبال: شخصیت اور کارنامے

وارانسی: بنارس ہندو یونیورسٹی کے کالج برائے خواتین میں 'اقبال شخصیت اور کارنامے' کے عنوان پر دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح بی ایچ یو کے رجسٹرار جی ایس یادو نے کیا۔ کلیدی خطبہ کماؤں یونیورسٹی نینی تال سے آئے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر ذاکر حسین نے دیا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے رجسٹرار نے کہا کہ اقبال ایک عظیم شاعر تھے اور ان پر سیمینار کرنے سے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ مہمان خصوصی نے اپنے خطاب میں ڈاکٹر اقبال پر سیر حاصل گفتگو کی۔ افتتاحی سیشن کے بعد چائے کا وقفہ ہوا اور اس کے بعد الٰہ آباد سے آئے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اپنے مقالے میں انھوں نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا تصور اقبال نے پیش کیا تھا۔ انھوں نے اقبال کی الہ آباد آمد پر تفصیلی روشنی ڈالی اور اقبال کے خطبہ الہ آباد کے بارے میں بتایا کہ اس خطبہ

میں تصور پاکستان کا کوئی عنصر نہیں ملتا۔ سیمینار کا تیسرا سیشن جمعہ کی نماز کے بعد منعقد کیا گیا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر نسیم احمد اور پروفیسر شابینہ رضوی نے جب کہ نظامت ڈاکٹر شبنم خاتون نے کی۔ تیسرے سیشن میں اسلم جمشید پوری نے 'اقبال اور تصوف' کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ میں انھوں نے اقبال کے مختلف نظریات پیش کیے اور خاص طور سے تصوف اور خودی کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ اس سیشن میں دوسرا مقالہ ڈاکٹر خلیل احمد نے اقبال کے ادب اطفال کے تعلق سے پیش کیا اور خاص طور پر اقبال کی ہمالیہ اور ترانہ ہندی جیسی نظموں پر سیر حاصل بحث کی۔ انھوں نے اقبال کے حوالے سے سائنس کے میدان میں لوگوں سے آگے بڑھنے کی باتیں کہیں۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ گوتم بدھ یونیورسٹی گریٹر نوئیڈا نے 'اقبال ایک مفکر' کے عنوان کے تحت پڑھا اس میں انھوں نے اقبال کے مارکسی نظریات کی نشان دہی کی۔ سلطان پور سے آئی ہوئی ڈاکٹر زیبا محمود نے اقبال کی شاعری کو بحر بیکراں سے مثال دی اور اقبال پر تنقید کرنے والوں کا تذکرہ کیا۔ اس سیشن کے آخر میں ڈاکٹر ریشما خاتون نے اقبال کی شاعری میں عورت کا تصور کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کے آخر میں پروفیسر نسیم احمد اور پروفیسر شابینہ رضوی نے صدارتی خطبہ دیا اور مقالوں پر اپنی رائے دی۔ دوسرے دن کے پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی۔ اس سیشن میں پہلا مقالہ ڈاکٹر صائمہ بانو نے 'علامہ اقبال کی شاعری اور ہندی' کے موضوع پر پیش کیا۔ دوسرا مقالہ وسنت کالج برائے خواتین کی پروفیسر نفیس بانو نے 'اقبال کے فکر و فن اور مشرقی سوز و ساز' کے عنوان پر پڑھا۔ پہلے سیشن کے صدارتی خطبہ میں پروفیسر زماں آزردہ نے کہا کہ پروفیسر اقبال نے ابتدائی دور کی شاعری میں ہندوستان سے متاثر ہوکر نیشنلزم پر شاعری کی۔ لیکن جیسے جیسے ان کی فکر اور سوچ میں وسعت آتی گئی وہ سارے جہاں کی بات کرتے گئے۔ علامہ نے نئی نسل اور قدیم نسل کے تعلق سے شاعری کی ہے۔ پروفیسر زماں آزردہ نے اقبال پر سیر حاصل گفتگو کی۔ دوسرے سیشن کی صدارت شعبۂ فارسی بی ایچ یو کی سابق صدر پروفیسر شمیم اختر نے کی۔ اس سیشن میں پہلا مقالہ شعبۂ فارسی کے موجودہ صدر ڈاکٹر حسن عباس نے پیش کیا۔ ڈاکٹر حسن عباس نے اپنے مقالہ میں اقبال اور افغانستان کے سفر کے تعلق سے باتیں کیں۔ افغانستان کے سفر کے دوران اقبال نے جو کچھ کیا تھا۔ انھوں نے اس کو یاد کیا اور بتایا کہ اقبال نے سفر افغانستان کے دوران جمال الدین افغانی کی امامت میں نماز پڑھی تھی۔ اس سیشن میں دوسرا مقالہ شعبۂ فارسی ہی کے استاد ڈاکٹر محمد عقیل کا تھا۔ دوسرے دن کا دوسرا سیشن شعبۂ فارسی کے نام تھا۔ اس سیشن میں اساتذہ کے بعد ریسرچ اسکالروں نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' وارانسی، 10,11 نومبر 2012

ڈاکٹر عباس رضا نیر کوآرڈی نیٹر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے کی۔ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے گورنر اتر پردیش بی ایل جوشی نے کہا مجھے بہت خوشی محسوس ہورہی ہے کہ میں آج ملک کے ایک نامور ادیب و شاعر افق کے سیمینار میں شریک ہوا ہوں جنھوں نے اپنی زندگی اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ دوارکا پرشاد افق صاحب نے اردو ادب پر ایک لمبی مدت تک حکومت کی اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اردو زبان و ادب میں منظوم صحافت کی ابتدا آپ ہی کی مرہونِ منت ہے۔ آپ نے رامائن کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جی بی پٹنا یک نے کہا کہ دوارکا پرشاد افق کی شاعری جدید و قدیم دور کی اردو شاعری کو جوڑنے والی ایک اہم کڑی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ اردو زبان ایک رابطے کی زبان ہے جس کو پوری طرح صحیح ثابت کرتے ہوئے افق صاحب نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ سینئر صحافی عابد سہیل نے کہا کہ افق صاحب نے ایسے وقت میں اردو کا اخبار نکالا جب اردو اخبارات نکالنا بہت دشوار گزار کام تھا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق'، دہلی، 14 دسمبر 2012

ممبئی یونیورسٹی

اردو ریسرچ اسکالرز کا جلسہ

کالینا: شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کی اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کے خصوصی پروگرام میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے معروف صحافی، ادیب اور طنز و مزاح نگار اسد رضا نے کہا کہ شعر و ادب کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ طلبا اپنے اندر ناقدانہ بصیرت پیدا کریں۔ انھوں نے کہا کہ شعبے کی جانب سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تحقیق کے لیے طنز و مزاح سے متعلق موضوعات پر جو کام ہو رہا ہے وہ مزید خوش آئند ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر صاحب علی نے شعبے کی جانب سے ماس میڈیا اور کمپیوٹر ڈپلومہ جیسے روزگار مرکوز کورسس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کورسس میں کامیاب ہونے والے بیشتر طلبا ممبئی کے علاوہ دیگر شہروں میں برسرِ روزگار ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

پریس ریلیز، صاحب علی صاحب، 21 دسمبر 2012

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

اردو یوتھ فیسٹول

میرٹھ: میرٹھ کی سی سی ایس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جاری سہ روزہ بین الاقوامی اردو یوتھ فیسٹیول میں منٹو سیمینار کے دوسرے روز پہلے اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف اسکرپٹ رائٹر ریوتی سرن شرما نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ منٹو کو سمجھنے کے لیے منٹو کا عرق ریزی سے مطالعہ ضروری ہے اور ان کی کتاب 'منٹو نامہ' کی قرأت ہمیں منٹو کی نفسیات سے متعارف کراتی ہے۔ سیمینار میں پہلے اجلاس کی صدارت معروف کہانی کار انور نزہت (کناڈا)، ابرار الحق (کراچی)، پروفیسر شبنم حمید (الہ آباد)، پروفیسر وائی (وملا)، ڈاکٹر قمر الزماں (دیوبند) نے مشترکہ طور پر کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ایم اے حق نے کہا کہ منٹو ایک کامیاب افسانہ نگار تھے۔ اپنے صدارتی خطاب میں اشتیاق سعید نے کہا کہ سیاہ حاشیے کیا ہیں منی افسانے، افسانچے یا ایک سطری کہانیاں ہیں۔ ڈاکٹر انور نزہت نے کہا کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں سماج کی حقیقت صاف جھلکتی ہے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نصرت جہاں کولکاتا نے کی۔

دوسرے اجلاس کی مسند صدارت پرناشر نقوی پنجاب، پروفیسر ظفر الدین حیدر آباد، اقبال مسعود بھوپال ڈاکٹر ضیا زیدی نوئیڈا اور ایاز احمد ایڈووکیٹ رونق افروز رہے۔ نظامت ڈاکٹر شکیل اختر نے کی۔ اس اجلاس میں سالک جمیل برار، عظیم راہی اورنگ آباد، ڈاکٹر اشتیاق سعید ممبئی، بشیر مالیرکوٹلہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر شمع افروز زیدی دہلی، حاجی اقبال خلیل رانچی، معین الدین عثمانی اورنگ آباد، طالب زیدی میرٹھ اور آفاق احمد خان نے کی۔ نظامت خورشید حیات چھتیس گڑھ نے کی۔ اجلاس میں ڈاکٹر زین رامش ہزاری باغ، ڈاکٹر صالحہ رشید الہ آباد، ڈاکٹر زیبا محمود سلطان پور، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر نسیم صدیقی اور تسلیم جہاں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سہ روزہ بین الاقوامی اردو یوتھ فیسٹیول میں شام افسانہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت انور نزہت، بشیر مالیرکوٹلہ، اختر آزاد جمشید پور، اشتیاق سعید ممبئی، رونق جمال اور مسعود اختر نے کی۔ شام افسانہ میں ڈاکٹر نشاں زیدی، محمد ذاکر دہلی نے اپنے افسانے پیش کیے، جب کہ خورشید حیات نے منٹو کا افسانہ پڑھ کر سنایا۔

سیمینار کے تیسرے اور آخری روز کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر طارق چھتاری، عظیم راہی، ڈاکٹر پردیپ جین، ڈاکٹر صالحہ رشید اور ڈاکٹر قمر الہدیٰ زیدی نے مشترکہ طور پر کی۔ سیمینار میں ڈاکٹر احمد صغیر، ڈاکٹر ایم اے حق، معین الدین عثمانی، نوشاد مومن، خورشید حیات، عامر نظیر ڈار، راشد انور راشد، محمد رضی الرحمٰن، مشرف عالم ذوقی، نصرت جہاں، ڈاکٹر علاؤ الدین، محترم نور الحسنین اور محترمہ رحمت یونس نے مقالے پیش کیے۔ علاوہ ازیں عظیم راہی، ڈاکٹر صالحہ رشید، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی اور ڈاکٹر پردیپ جین نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ سہ روزہ بین الاقوامی اردو یوتھ فیسٹول کے تیسرے روز دوسرے اور اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر جے کے پنڈیر (پرو وائس چانسلر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی) نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر محمد لقمان (وائس چانسلر مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی، رام پور) نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 17،18 دسمبر 2012

بڑودہ یونیورسٹی

ایکسٹرا، مورل لکچرز کا انعقاد

بڑودہ: بڑودہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی، عربی و اردو کے زیرِ اہتمام یکم جنوری 2013 کو پدم شری ایوارڈ یافتہ پروفیسر ایس وائی مہتا، سابق وائس چانسلر، سوراشٹر یونیورسٹی، راجکوٹ، کے زیرِ صدارت شری اربندو سیمینار ہال میں دو ایکسٹرا مورل لکچرز کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر چندر شیکھر نے گجرات اور انڈو ایران تعلقات و عربی سفرنامے اور

گجرات کے موضوعات پر لیکچر دیے۔ مذکورہ لیکچرز کی تقریب کا آغاز مہمانِ شرف پروفیسر رتن ویاس، ڈین آف آرٹس، ایم ایس، یونیورسٹی آف بڑودہ، کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر وجیہ الدین نے انجام دیے اور ڈاکٹر انور ظہیر، نے شکریے کی رسم انجام دی۔

بذریعہ ڈاک، پروفیسر مقصود احمد، صدر شعبۂ فارسی، عربی و اردو بڑودہ یونیورسٹی، بڑودہ، 2 جنوری 2013

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

مانو کے لکھنؤ کیمپس میں خصوصی لیکچر

لکھنؤ: آج کے ادب اور افسانے میں زندگی کا جو سرو کار نظر آتا ہے وہ ترقی پسند ادبی تحریک کی دین ہے۔ اب تحریکوں کا زمانہ ختم ہوا اور فکر کا زمانہ روشن ہوا ہے۔ یہ ترقی پسند ادب کی دین ہے جس نے فکری کشادگی کے ساتھ غور وفکر کے اسباب پیدا کیے۔ ان خیالات کا اظہار مشہور ادیب اور صحافی جناب عابد سہیل نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس کے زیر اہتمام یوم تاسیس کے موقع پر کیمپس میں ایک خصوصی لیکچر کے دوران کیا۔

جناب عابد سہیل نے مزید کہا کہ دنیا میں تحریکوں کا نہیں بلکہ فکر کا عروج ہوتا ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ ترقی پسند ادبی تحریک نیم ادبی اور نیم سماجی تحریک تھی جس نے اردو ادب کو ایک نئی سمت دی اور اس کے ادیبوں نے بعض اہم اصناف کا اردو میں تجربہ بھی کیا۔ جس کے نہایت خوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالقدوس نے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں اور کیمپس کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر محمد ظفر الدین کا خصوصی شکریہ ادا کیا جن کی رہنمائی اور توجہ سے کیمپس کی علمی سرگرمیوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

پریس ریلیز، عمیر منظر، مانو لکھنؤ کیمپس، 9 جنوری 2013

اردو یونیورسٹی کے کولکاتا سینٹر کا جلسہ

کولکاتا: کینیڈا میں مقیم کولکاتا نژاد ڈراما نگار، مترجم، شاعر و سفرنامہ نگار جاوید دانش مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل سینٹر کولکاتا تشریف لائے اور ریجنل ڈائریکٹر ڈاکٹر امام اعظم کے ساتھ ملک و بیرونِ ملک اردو کے ادبی ولسانی معاملات کے حوالے سے گفت وشنید ہوئی۔ وہاں وہ ایک تھیٹر ادارے 'رنگ منچ' کے روحِ رواں بھی ہیں اور اس کے تحت ڈرامے اسٹیج کرتے رہتے ہیں۔ نیز مہجری ادب پر کینیڈا میں مقیم دیگر اردو ادبا وشعرا کے ساتھ خاصا کام کر رہے ہیں۔ مانو کے کولکاتا ریجنل سینٹر سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ اس ملاقات میں سیّد محفوظ عالم (مدیر 'آج کا سکندر' کلکتہ) کے علاوہ ریجنل سینٹر کے عملے کے اراکین راحیل شاداب اور شاہد اقبال بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ 27 دسمبر 2012

مدراس یونیورسٹی

عالمی اردو سیمینار

چنئی: "مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہورہی ہے کہ یہاں کثیر تعداد میں اردو داں طبقہ موجود ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ چنئی میں ایک تمل اردو ہری ٹیج میلہ منعقد کیا جائے جس کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پورا خرچ برداشت کرنے کو تیار ہے۔ پوری دنیا میں ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو بے حد عظیم اور عجیب وغریب ہے۔" ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے مدراس یونی ورسٹی

میں منعقدہ 23,24 دسمبر کے دو روزہ عالمی اردو سیمینار بعنوان 'منٹو- شخصیت اور فن' کے افتتاحی اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف تہذیبیں آپس میں ایک مالے کی طرح جڑی ہوئی ہیں اور اس تہذیب کو بچانا آج وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، حکومت ہند نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کئی اسکیمیں رائج کی ہیں، آپ ان سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ کونسل کی ویب سائٹ پر تمام جانکاریاں ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر سید سجاد حسین کو اس سیمینار کے انعقاد پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ایسے وقت میں جب کہ کسی کو بھی آپس میں مل بیٹھنے کی فرصت نہیں ہے۔ اس قسم کے سیمینار منعقد کرنا گویا ایک خوشگوار فضا قائم کرنا ہے۔ ڈاکٹر ٹی ایس سری دھر IAS ایڈیشنل چیف سکریٹری، حکومت تمل ناڈو نے اس سیمینار کا افتتاح کیا اور شرکا سے خطاب کیا۔ ان کے ہاتھوں ریاست اور بیرون ریاست کی پانچ اہم شخصیات کو ان کی اعلیٰ تعلیمی خدمات کے لیے ایوارڈز پیش کیے گئے۔ یو محمد خلیل اللہ، چیئرمین مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا کو 'ڈاکٹر ذاکر حسین ایوارڈ'، سی قیصر احمد، جنرل سکریٹری وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کو 'مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ'، پٹیل محمد یوسف، ڈائرکٹر وانی ٹیک کو 'علامہ اقبال ایوارڈ' مختار بدری کو 'فیض احمد فیض ایوارڈ' اور تقی عابدی کو 'مرزا غالب ایوارڈ' پیش کیے گئے۔ آخر میں صدر مجلس اے محمد اشرف، سکریٹری و کرسپانڈنٹ، دی نیو کالج، چنئی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ایڈیشنل چیف سکریٹری، گورنمنٹ آف تمل ناڈو سے استدعا کی کہ وہ اسکولوں میں اردو زبان کو لازمی درجہ دلانے کے لیے جب بھی وزیر اعلیٰ سے ملاقات ہو یاد دہانی کرائیں۔ اس دو روزہ عالمی اردو سیمینار کے اختتامی اجلاس کے دوران عالی جناب شری اپوروا ورما IAS، پرنسپل سکریٹری برائے اعلیٰ تعلیم، حکومت تمل ناڈو کے ہاتھوں مندوبین سیمینار کو ان کی شرکت پر سرٹیفکیٹس پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر حیات افتخار کے کلمات تشکر کے ساتھ اختتامی اجلاس تکمیل کو پہنچا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر امان اللہ، چنئی 27 دسمبر 2012

عالمی اردو نامہ

جهانگیر وارثی

امریکه کی واشنگٹن یونیورسٹی میں 2012 کے جیمس میکلائڈ فیکلٹی ایوارڈ یافته اِسکالر اور ماهر لسانیات ڈاکٹرمحمد جهانگیر وارثی علی گڑه مسلم یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ اور مغربی بنگال اُردو اکیڈمی سے ایوارڈ یافته کئی کتابوں کے مصنف بهی هیں۔ اُنهیں 2005میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سے 'اَن سنگ هیرو' اور 2011 میں اُترپردیش کا هندی اُردو ساهتیه ایوارڈ بهی دیا جاچکا هے۔2010میں امریکا کی جنوب ایشیائی لنگویج ریسرچ سینٹر کی جانب سے اُنهیں زبانوں کی تدریس میں بهتری لانے کے لیے 25000 ڈالر کی گرانٹ سے بهی سرفراز کیا گیا۔ امریکا میں اُردو کے تعلق سے ان کے ذریعه بنایا گیا ویب سائیٹ http://urdu.wustl.ed دیکھ سکتے هیں۔

بطور ماهر لسانیات انهوں نے اردو زبان، ثقافت اور تشخص کا تحفظ کیا هے۔ عبدالحی نے اُن سے خصوصی گفتگو کی، جس کے اِقتباسات درج ذیل هیں:

سوال: دربھنگہ کوشیشوراستھان سے علی گڑھ اور واشنگٹن یونیورسٹی تک اپنے تعلیمی اورادبی سفر پر روشنی ڈالیں۔

جواب: میری پیدائش دربھنگہ ضلع کے ایک چھوٹے سے لیکن تاریخی گاؤں بڑا میں ہوئی۔ ہائی اسکول تک کی میری تعلیم میرے گاؤں سے پانچ چھ کیلومیٹر کی دوری پر واقع نندکشور ہائی اسکول ستی گھاٹ سے ہوئی۔ ہائی اسکول کے بعد کی ساری تعلیم میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مکمل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میں نے لسانیات، انگریزی اور جغرافیہ کے ساتھ بی اے فرسٹ ڈویزن سے پاس کرنے کے بعد لسانیات ہی میں یونیورسٹی میڈل کے ساتھ ایم اے کیا اور پھر وہیں سے میں نے 1998 میں لسانیات میں اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی۔ پی ایچ ڈی کے دوران ہی میں نے روڑکی یونیورسٹی سے NLP میں ٹیچر ٹریننگ مکمل کیا اور پھر کچھ دنوں تک C-DAC, Pune میں Linguist کی حیثیت سے مشین ٹرانسلیشن پروجیکٹ پر کام کیا۔ امریکہ جانے سے پہلے لگ بھگ دو سال تک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی میں کام کیا۔ میرے تدریسی سفر کا آغاز 2001 میں یونیورسٹی آف مشیگن، امریکہ سے ہوا، جہاں میں نے دوسال تک پڑھایا۔ پھر 2003 میں میرا تقرر بحیثیت لکچرر یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلی میں ہو گیا اور لگ بھگ ڈھائی سال تک میں نے وہاں پڑھایا۔ لیکن 2006 میں میرا تقرر واشنگٹن یونیورسٹی، سینٹ لوئی ہوگیا جہاں اب بھی میں تدریسی کام انجام دے رہا ہوں۔

سوال: آپ کو حکومت ہند اور امریکی حکومت سے ڈھیر سارے انعامات اور ایوارڈس مل چکے ہیں اور آج آپ ایک بڑے ماہر لسانیات کے طور پر جانے جاتے ہیں؟ اپنی کامیابی کا سہرا کسے دینا چاہیں گے؟

جواب: دیکھیے، سب سے پہلے تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کوئی بہت بڑا ماہر لسانیات نہیں ہوں، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لسانیات کا ایک طالب علم ہوں۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں پڑھانے کے دوران مجھے 2005 تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں میں نمایاں کارکردگی کے لیے unsung hero کے خطاب سے نوازا گیا۔ پھر اس سال واشنگٹن یونیورسٹی کے آرٹس اور سائنس کونسل نے تعلیمی شعبہ میں میری تحقیق اور تجربہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس سال یعنی 2012 کا جیمس میکلائیڈ فیکلٹی ایوارڈ (James McLeod Faculty Award) دینے کا فیصلہ کیا۔ دراصل یہ ایوارڈ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو طلبا کو جدید اور معیاری تدریس سے ان کے زندگی میں نمایاں تبدیلی لانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

سوال: آپ نے مشین ٹرانسلیشن کے شعبے میں بھی کام کیا ہے اردو میں مشین ٹرانسلیشن کی افادیت واہمیت پر روشنی ڈالیں؟

جواب: میں نے C-DAC, Pune میں Linguist کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ وہی ادارہ ہے جس نے ہندوستان کے لیے سب سے پہلے سوپر کمپیوٹر بنایا تھا۔ یہ ایک بہت ہی فعال ادارہ ہے جہاں مختلف کاموں کے علاوہ زبانوں کے اوپر تکنیکی اعتبار سے کافی اہم کام ہو رہا ہے، جس میں اردو بھی شامل ہے۔ مشین ٹرانسلیشن ایک ایسا شعبہ ہے جہاں روزگار کے بے انتہا مواقع ہیں۔ اگر آپ اردو کے قواعد سے اچھی طرح واقف ہیں تو مشین ٹرانسلیشن کے شعبے میں آپ کو

بہ آسانی کام مل سکتا ہے۔ کسی بھی سافٹ ویر انجینئر کو ایک ایسے زبان داں کی ضرورت ہوتی ہے جس کو قواعد کے اعتبار سے اپنی زبان پر عبور حاصل ہو۔ دراصل سافٹ ویر انجینئر کو پرامنگ کرنے کے لیے زبان کے قواعد کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک Linguist ہی آسانی کے ساتھ سافٹ ویر انجینئر کو فراہم کر سکتا ہے۔ یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ امریکہ اور یوروپ جیسے ممالک میں بھی بہ آسانی نوکری مل سکتی ہے۔ جولائی 2004 کی امریکہ کے ایک سرکاری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ دہشت پسندی مخالف اور کاونٹر انٹیلی جنس سے تعلق رکھنے والے شعبوں میں زبانوں کے مترجمین کی زبردست کمی ہے۔ اگرچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں، لیکن اس ایجنسی کو ان زبانوں میں کافی مہارت رکھنے والے لوگ تلاش کرنے میں دشواری آ رہی ہے اور ترجمہ طلب مواد کا انبار لگتا جا رہا ہے۔ ان رپورٹوں کے مطابق 11 ستمبر 2001 کو 9 فیصد اردو مترجم کی ضرورت تھی جو یکم اپریل 2004 میں بڑھ کر صرف ایف بی آئی کے لیے 29 فی صد ہو گئی۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر اور اردو زبان سے متعلق ایک کتاب بھی تحریر کی ہے اس کے بارے میں بتائیں؟

جواب: جی ہاں، میں نے ایک نہیں بلکہ دو کتابیں ترتیب دی تھیں۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو، میں نے امریکہ آنے سے پہلے لگ بھگ دو سال تک اردو کونسل میں بھی کام کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کونسل پورے ملک میں کمپیوٹر سینٹر قائم کر رہی تھی، جس کا مقصد تھا اقلیتی کمیونٹی کے مالی اعتبار سے کمزور طلبہ یا پھر مدرسے سے تعلیم حاصل کر چکے طلبہ کے لیے ایک ایسا کورس ترتیب دینا، جس سے طلبا کو ایک اوسط درجے کی نوکری مل جائے اور اپنی زندگی اچھی طرح بسر کر سکے اور جو طلبا آگے اپنی پڑھائی جاری رکھنا چاہتے ہوں وہ اس کورس کو کرنے کے بعد کسی اور کورس میں داخلہ لے کر اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتے ہیں۔ اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے Urdu Computer Application in اور Software Multilingual DTP کتاب ترتیب دی تھی، تاکہ وہ طلبا جو اردو میڈیم یا پھر مدرسے سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہوں ان کو کمپیوٹر سیکھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس وقت کمپیوٹر کی کتابیں یا تو نہیں یا پھر بہت ہی کم دستیاب تھیں اس لیے اس زمانے میں میری ترتیب دی ہوئی کتابیں کافی مقبول ہوئیں اور طلبا کو عمومی طور پر کافی فائدہ پہنچا۔

سوال: امریکہ میں اردو کی تعلیم ماضی، حال اور مستقبل؟

جواب: امریکہ میں دھیرے دھیرے ہی صحیح لیکن اردو اپنی شناخت اور مقبولیت قائم کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہی ہے اور اس مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ چونکہ امریکہ تنوع اور رنگارنگی کی سرزمین ہے، ہر روز سیکڑوں تارکین وطن امریکہ آتے رہتے ہیں، اور ان تارکین وطن کو بہتر طور پر سمجھنے اور ایک دوسرے کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت سے آشنا ہونے کے لیے غیر ملکی زبانوں میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ امریکی یونیورسٹیوں میں کم پڑھائی جانے والی زبانوں کی تدریس میں گزشتہ 45 برسوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ 1959 میں حکام نے سوویت یونین کے اسپتنک چھوڑنے کے بعد امریکی کانگریس میں ایک باضابطہ قانون بنا کر پہلی بار وفاقی فنڈ سے غیر ملکی زبان پڑھنے والوں کو فیلوشپ دینے کا فیصلہ کیا گیا اور 6 زبانیں پڑھنے والے 171 طلبا کو فیلوشپ دی گئی۔ امریکی کمشنر آف ایجوکیشن نے اس وقت جن 6 زبانوں کو اہم قرار دیا تھا ان میں ہندی اردو کے علاوہ روسی، عربی، چینی، جاپانی اور پرتگالی شامل تھی۔ اردو چونکہ مشرق وسطی اور جنوبی ایشیائی خطے میں بہت بڑے پیمانے پر بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس لیے 9/11 کے حملے کے بعد ان خطوں کی طرف توجہ بہت بڑھ گئی اور اس طرح ان خطوں کے زبانوں کے جاننے کے رجحان میں کافی اضافہ ہونے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ امریکی یونیورسٹیوں میں ہندی اردو پراگرام کا باضابطہ طور پر آغاز کیا گیا۔ جن امریکی یونیورسٹیوں میں ہندی اردو پروگرام شروع کیا گیا ان میں یونیورسٹی آف کیلی فورنیہ، روٹگرس یونیورسٹی، انڈینا یونیورسٹی، لویولا یونیورسٹی، یونیورسٹی آف شکاگو، پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اینڈ ریجنل اسٹڈیز، اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیو یارک، اسٹونی بروک یونیورسٹی، کولمبیا یونیورسٹی وغیرہ شامل ہیں۔ ان پروگراموں کے تحت ایسے بین موضوعاتی نصاب پیش کیے جاتے ہیں جن میں توجہ جنوب ایشیا اور ہندی اردو کی تدریس پر رکھی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سی یونیورسٹیوں میں ساؤتھ ایشیا اسٹڈیز کے لیے کمیٹیاں بنائی گئی ہیں جو تعلیمی کانفرنس، سیمینار، گول میز مذاکرات اور جنوب ایشیا کے بہت سارے معاملات پر لکچر کا اہتمام کرتی ہے۔ ان اداروں میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ دونوں طرح کے پروگرام چلائے جاتے ہیں، جن کے تحت بی اے اور ایم اے کی ڈگری دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ چھوٹے چھوٹے پروگرام بھی چلائے جاتے ہیں۔

سوال: امریکہ میں کس طرح کی ادبی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں؟ اردو بولنے والے معاشرے کے مسائل پر روشنی ڈالیں؟

جواب: امریکہ میں اردو کے حوالے سے اگر ہم بات کریں تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ پچھلے کچھ سالوں میں مشاعروں اور ادبی نشستوں کی روایت تیزی سے آگے بڑھی ہے۔ اب لگ بھگ یہاں کی تمام ریاستوں میں ادبی نشستیں اور مشاعرے باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہو رہے ہیں اور لوگ اس میں بڑے احترام اور عقیدت کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ امریکہ میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے وہیں دوسری جانب اردو بولنے والے معاشرے کے چند مسائل بھی ہیں جن میں سب سے اہم ہے اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں کمی۔ اس لیے جنوب ایشیائی تارکین وطن کی نئی نسل کو اردو زبان اور ثقافت سے روشناس کرانے کے لیے زیادہ تر مقامات پر سنڈے اسکول چلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی الومنائی ایسوسی ایشن ہر سال سارے امریکہ میں مشاعرے منعقد کرتی ہیں، جہاں مقامی شعرا کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے شعرا کو مدعو کیا جاتا ہے اور یہ تقریب لگ بھگ پورے امریکہ میں ایک مہینہ تک چلتی ہے۔

سوال: اردو کے رسم الخط کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

جواب: میرے خیال میں اُردو کا رسم الخط اس کا اپنا خاص منفرد رسم الخط ہے اور دنیا کے حسین ترین رسم الخطوں میں سے ایک ہے۔ اس کے پیچھے ایک طویل تاریخی عمل ہے۔ ہم اسے صدیوں سے اسی شکل میں استعمال کرتے اور قبول کرتے چلے آئے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ ہمارا رسم الخط، ہماری تہذیب، ہماری زبان، ہماری شائستگی، ہمارا تلفظ اور ہمارے ادبی و ثقافتی سرمایے کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اس ضمن میں دوسری زبانوں کے حوالے دینا میں ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اُردو کے حروف تہجی تمام اس کے اپنے ہیں۔ ان کی اپنی الگ ہی تاریخ ہے ویسے تو ان کی تعداد 58 ہے مگر اردو میں استعمال ہونے والے اصوات (آوازیں) کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ جتنی آوازیں اُردو میں ہیں شاید دنیا کی دوسری زبان میں نہیں ہیں۔

سوال: اردو زبان و ادب کی ترویج میں جدید ذرائع ابلاغ اور انٹرنیٹ، موبائل، ٹیبلٹ کس قدر موثر ثابت

ہورہے ہیں؟

جواب: یقیناً اردو زبان کو ٹکنالوجی سے کافی فائدہ پہنچا ہے۔ اردو زبان نے ٹکنالوجی کی مدد سے کافی تیزی سے عالمی سطح پر مقبولیت حاصل کی ہے اور اس مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آج ویب پر بھی اردو زبان بہت نمایاں طور پر موجود ہے۔ ویب سائٹ پر شاعری اور ادب کی دیگر اصناف آسانی کے ساتھ اردو رسم الخط میں پڑھی جاسکتی ہے۔ لیکن جہاں ایک طرف اردو کو ٹکنالوجی سے فائدہ پہنچا ہے وہیں دوسری جانب ٹکنالوجی کی ہی وجہ سے اردو بول چال کی زبان میں نمایاں تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔ نئے نئے الفاظ جو آئے دن نئے gazette اور ان کے استعمال میں ایجاد ہو رہے ہیں ہمارے روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو چکے ہیں۔ اگر کمپیوٹر کو ہی لیا جائے تو 'لاک کر دیتے ہیں'، 'براؤز کر دیتے ہیں'، 'فائل میں سیو ہے'، 'ڈلیٹ ہو گیا' وغیرہ وغیرہ روز استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ صرف بولنے میں ہی نہیں لکھنے میں بھی جیسے ای میل اور موبائل فون کے ذریعے text message میں لفظوں کو چھوٹا کر کے جس طرح سے لکھا جا رہا ہے اس سے یقیناً زبان کی شکل تبدیل ہو رہی ہے۔ اس طرح کا استعمال لگ بھگ ساری زبانوں کے تخلیقی ادب میں ہو رہا ہے۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ہمیں اس بات کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ اگر مستقبل کے ادب کی زبان اگر بدلی ہوئی نظر آئے تو حیرانی کی کوئی بات نہیں۔

سوال: ہندوستانی سنیما کے سو سال پورے ہونے جا رہے ہیں؟ سنیما میں گزشتہ سو برسوں میں اردو زبان و ادب کے کردار پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: پہلی بولتی فلم عالم آرا سے لے کر آج تک اردو نے اس میں رنگ اور مٹھاس بھرنے کا کام کیا ہے۔ ہندوستانی سنیما میں اردو کی مٹھاس سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں شروع سے لے کر آج تک لوگ لطف اندوز ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ہندوستانی سنیما کی سب سے خاص بات میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک طرف جہاں ہندوستانی فلموں نے عوام کو انٹرٹینمنٹ کا ذریعہ فراہم کیا وہیں دوسری جانب نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں ہندوستانی فلموں نے ہندوستانیوں کو اپنی تہذیب اور ثقافت سے جوڑے رکھا، ساتھ ہی ہندوستانی سنیما اور اردو زبان کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

سوال: اردو دنیا کے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: میں یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اردو میں بھی روزگار کے بہت سے مواقع ہیں، جو لوگ اردو پڑھ رہے ہیں اور اردو میں ہی اپنا کیریئر بنانا چاہتے ہیں انھیں احساس کمتری میں پڑنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ اگر اردو کو آپ لسانی اعتبار سے جانتے ہیں تو آپ کے لیے اور بھی کئی مواقع ہیں۔ مثال کے طور پر، آج کل باہر کے ملکوں میں اردو کا دائرہ بڑھ رہا ہے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اچھے استاد کی بہت ضرورت ہے اور اس کے لیے آپ کو زبان پر مہارت ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ سافٹ ویر انڈسٹری میں آپ کو نوکری مل سکتی ہے۔ ٹرانسلیشن کے شعبے میں آپ کے لیے مواقع موجود ہیں۔ اردو صحافت میں آپ اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔ اس لیے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ کیریئر کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر زبان پر مہارت حاصل کریں، انشاء اللہ آپ کو کامیابی ضرور ملے گی۔

قاہرہ

افرو ایشیائی انجمن کی کانفرنس

قاہرہ: مصر کے تاریخی شہر قاہرہ میں افرو ایشیائی انجمن کی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں بیس ممالک سے مختلف زبانوں کے ادیبوں نے شرکت کر کے ادبی اور سماجی موضوعات پر اظہار خیال کیا اور عالمی تناظر میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ایک مثبت سمت دینے کے عہد کو دہراتے ہوئے انسانی بقا اور عالمی امن کے لیے راہیں ہموار کرنے کی قرارداد پر دستخط کیے۔ افرو ایشیائی ادیبوں کی یہ انجمن 1958 میں قائم کی گئی تھی۔ عملی طور پر اس انجمن کی تشکیل میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بنیاد گزاروں خصوصاً سجاد ظہیر کا بہت نمایاں رول رہا ہے۔ نومبر 2006 اور 2011 میں اسی سلسلے میں علی جاوید نے مصر کا دورہ کیا تھا اور مصر کے ادیبوں کی اس پیش کش کو منظوری دی گئی کہ آئندہ یعنی چھٹی کانفرنس قاہرہ میں منعقد کی جائے اور اسی فیصلے کے تحت 8, 9, 10 دسمبر 2012 کو افریقہ اور ایشیا سے بیس ممالک کے ادیبوں اور دانشوروں کی نمائندگی میں ایک کامیاب کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس میں ہندوستان سے ادیبوں اور دانشوروں کے ایک چھ رکنی وفد نے بھی شرکت کی جن میں شمیم فیضی، علی جاوید، کھگندر ٹھاکر، سکھ دیو سنگھ، گرنام کنور اور جمیل منظر شامل ہیں۔ اس کانفرنس میں اتفاق رائے سے علی جاوید کو انجمن کا صدر اور محمد سلماوی کو سکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

پریس ریلیز، احمد امتیاز، دہلی یونیورسٹی، 17 دسمبر 2012

میانمار

رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر وزیر خارجہ کی حاضری

ینگون: وزیر خارجہ سلمان خورشید جب آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے مقبرے پر پہنچے تو بہادر شاہ ظفر کے لکھے ہوئے اس شعر کا حوالہ دیا ''کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے، دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں۔'' سلمان خورشید بہادر شاہ ظفر کے شعر کو دہرایا۔ اس مغل بادشاہ کا انتقال 7 نومبر 1862 کو رنگون (اب ینگون) میں ہوا تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی میں انگریزی حکومت سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد انگریزی حکومت نے انھیں ینگون جلاوطن کر دیا۔ سلمان خورشید نے 'سنس آف بابر' نامی ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے جس میں مغل بادشاہ اور بہادر شاہ ظفر کے بارے میں بہت کچھ ہے۔ سلمان خورشید نے ظفر کے مقبرے کی دیکھ بھال کرنے والوں کو اپنے لکھے اس ڈرامے کی کاپی بھی پیش کی۔ سلمان خورشید نے لکھا کہ اس مقام کا دورہ کرنے پر روحانی اور سیاسی طور پر میں ایک کاملیت اور ترغیب محسوس کرتا ہوں۔ اس موقعے پر سلمان خورشید اور ان کی بیوی لوئیس سلمان خورشید نے مزار پر چادر پوشی کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'جنگ' کراچی، 8 دسمبر 2012

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

معیاری ادب کی تخلیق اور خریداری کونسل کی ذمے داری ہی نہیں بلکہ وقت کی اہم ضرورت: پروفیسر وسیم بریلوی

نئی دهلی: نئے سال میں نئے عزائم کے ساتھ رواں مالی سال 13-2012 کی خریداری برائے کتب ورسائل کی میٹنگ کا انعقاد فروغ اردو بھون میں کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کی۔ انھوں نے اپنے افتتاحی کلمات میں میٹنگ میں آئے شرکا اور ماہرین کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اس سرد موسم میں آکر شرکا نے اپنی سنجیدگی اور دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ رواں مالی سال 13-2012 کی تھوک خریداری برائے کتب و جرائد اسکیم کے تحت کونسل نے تقریباً 70 لاکھ روپے کی خریداری کو منظوری دی۔ گزشتہ سال 2012 میں ہوئی اسی میٹنگ میں پروفیسر وہاب اشرفی (مرحوم) نے اپنی علالت کے باوجود بھی شرکت کی اور یہ ان کی زندگی کی آخری میٹنگ تھی۔ میٹنگ میں موجود ممبران اور کونسل کے عملہ نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔

پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ ''معیاری ادب کی خریداری کونسل کی ذمے داری ہی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کی ذہنی نشو ونما کے لیے ایک اہم ضرورت بھی ہے۔'' ان کی تائید کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ ''کونسل کی یہ پوری کوشش رہی ہے کہ ادب کی خریداری کے وقت، تعلیمی معیار، زبان لب ولہجہ اور موجودہ تعلیمی ضرورت کو مدنظر رکھا جائے کیونکہ ادب کی افادیت سماجی قدروں کے تعین کے لیے ایک مربوط وسیلہ ہے۔ کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ دوطرفہ ترسیل کے مقصد کو بخوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔ ایک جانب اگر ادب سماجی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے تو دوسری جانب ادب سماج کے معیار کو طے بھی کرتا ہے۔ آج کی میٹنگ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں بنیادی اور اصولی طور پر یہ واضح کیا گیا کہ قومی اردو کونسل کیونکہ حکومت کی نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کر رہی ہے اس لیے اصول وضوابط کے مطابق ہی رسائل و جرائد خریدے جائیں گے۔ خاص کر رسائل کے لیے RNI.No. ہونا لازمی شرط ہے۔ دوسری اہم بات کہ اصل تخلیق کار کو ہی مالی تعاون دیا جائے گا، ترتیب وتدوین کو دوسرے زمرے میں رکھا جائے گا۔ تیسری بات کہ اگر کسی سمینار کو پہلے سے ہی کسی دوسری سرکاری ادارے سے گرانٹ مل چکی ہے تو پھر اس سیمینار کے مقالے پر مشتمل کتاب کو گرانٹ نہیں دی جائے گی۔ اس اہم مجلس میں موجود ماہرین نے مختلف موضوعات اور زمرے کی کتابوں پر غور وفکر کیا۔ اس میں تقریباً 15 موضوعات مثلاً تخلیقی ادب، لسانیات، ادبی تنقید، خود نوشت، اینتھولوجی، ببلوگرافی، بچوں کا ادب، ڈکشنریاں، تاریخ و تمدن، صحافت، مصوری، سائنس اور سوشل سائنس اور عربی و فارسی ادب کی تقریباً 216 کتابیں اور اردو عربی، فارسی کے کل 47 رسائل و جرائد پر غور کیا گیا۔ یہ اہم فیصلہ اردو عربی، فارسی اور کونسل کی ممبران کی موجودگی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ میٹنگ میں شریک ہونے والے شرکا کے اسم گرامی یہ ہیں:

پروفیسر آزرمی دخت صفوی (ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف پرشین ریسرچ، علی گڑھ)، پروفیسر فضیل احمد قادری (میگھالیہ)، جناب فیروز بخت احمد، ڈاکٹر پی کے حسین مداور (پرنسپل روضۃ العلوم عربی، کیرالہ)، جناب اصغر ویلوری (چینئی)، پروفیسر صغیر افراہیم (شعبہ اردو، علی گڑھ) کے علاوہ محترمہ مسرت جہاں، محترمہ فرح ادیبہ اور اقبال حسین نے بھی شرکت کی۔

مالی سال 13-2012 کی خریداری برائے کتب ورسائل کی میٹنگ کا ایک منظر

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 جنوری 2013

قومی اردو کونسل کی مالی تعاون اسکیم (گرانٹ ان ایڈ) کے تحت 66 لاکھ کی منظوری

اہم مالی تعاون اسکیموں میں شفافیت کونسل کی اولین ترجیح: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دہلی: فروغ اردو بھون میں کونسل کی گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی سال 2013 کی پہلی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت سیمینار، کانفرنس، ورکشاپ اور مشاعروں کے انعقاد کے لیے متعلقہ کمیٹی کی سفارشات اور غور وفکر کے بعد ہی مالی تعاون فراہم کیا جاتا ہے۔ رواں مالی سال (2012-13) میں گرانٹ ان ایڈ کمیٹی نے سیمناروں، کانفرنس اور مشاعروں کو 66 لاکھ کی معاونت کو منظوری دی۔ اس اہم فیصلے کے تحت منظور ہونے والے 72 سیمناروں کو تقریباً 43 لاکھ، 83 اردو مسودات کو تقریباً 22 لاکھ روپے اور عربی و فارسی مسودات کو ایک لاکھ روپے کی منظوری ملی۔

میٹنگ کی صدارت قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب وسیم بریلوی نے کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ کونسل حکومت ہند کی ایک نوڈل ایجنسی کے طور پر اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔ اس لیے کونسل کی مالی تعاون کی اسکیموں میں شفافیت کو ہمیشہ سے اہمیت دی جاتی رہی ہے اور ہم اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ قومی اور ریاستی سطح تک کی وہ تمام سرگرمیاں جو اردو کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہیں، کونسل سے مالی تعاون کی حقدار ہیں۔ خواجہ اکرام الدین نے مزید کہا کہ جن اداروں کا تعلق براہِ راست اردو سے نہیں ہے اور وہ اردو کی ترویج وترقی کے لیے کام کر رہے ہیں، انھیں مزید مستحکم بنانے کے لیے حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ کونسل کے گرانٹ ان ایڈ سیکشن نے تقریباً ڈھائی کروڑ روپے کے عالمی، قومی اور ریاستی سطح کی تقریباً ڈیڑھ سو تجاویز، متعلقہ کمیٹی کے سامنے پیش کیں۔ جن پر غور وخوض کے بعد تقریباً 66 لاکھ روپے کی مالی معاونت کو منظوری ملی۔ اس کمیٹی میں آئے ایگزیکیٹیو اور فائننس کمیٹی کے ممبر جناب علیم الدین اسعدی نے کہا کہ فارسی میں کچھ اور نئے موضوعات کو شامل کیا جانا چاہیے۔ ایک سوال کے جواب میں ڈائرکٹر نے کہا کہ اردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلے میں کونسل کو وقتاً فوقتاً کئی اہم تجاویز موصول ہوتی رہتی ہیں، لیکن اردو کونسل اپنے اصول وضوابط کے دائرے میں رہ کر ہی کام کرتی ہے۔ انھوں نے ریشمی رومال کی تحریک کو ایک اہم تحریک بتاتے ہوئے اس سے متعلق تحریروں کو ایک جامع کتابی شکل دینے پر بھی زور دیا۔ ریاستی سطح پر ہونے والی اردو کی سرگرمیوں کو اہمیت دیتے ہوئے شمال مشرقی ریاستوں کے سمیناروں کو منظوری دی گئی اس کے علاوہ آندھرا پردیش، بہار، دہلی، جموں وکشمیر، کرناٹک، کیرلہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، منی پور، اڑیسہ، تمل ناڈو اور اتر پردیش کے کل 104 پروپوزل شامل کیے گئے۔

میٹنگ میں کمیٹی کے ممبران جناب فرید احمد، حافظ مطلوب کریم، شیخ علیم الدین اسعدی، محمد عبید اللہ شریف (بنگلور)، پروفیسر اے قادر جعفری (الہ آباد)، ڈاکٹر سید اختر حسین (جے این یو)، کے علاوہ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، محترمہ مسرت جہاں، جناب مجیب احمد اور جناب محمد اقبال نے بھی شرکت کی۔

فروغ اردو بھون میں قومی اردو کونسل کی گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی سال 2013 کی پہلی میٹنگ

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 جنوری 2013

فارسی زبان کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل اور ایران کلچرل ہاؤس کے درمیان اشتراک

نئی دہلی: اردو اور فارسی زبانوں کے گہرے لسانی، ادبی اور تہذیبی رشتوں کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نئی دہلی میں واقع ایران کلچرل ہاؤس کے درمیان فروغ اردو بھون میں ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ کونسل ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے ایران کلچرل ہاؤس

کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی فولادی کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے انھیں کونسل کے اغراض ومقاصد اور ملکی سطح پر جاری کونسل کی سرگرمیوں نیز اس کی تمام تر اسکیموں سے واقف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت نے فارسی اور عربی زبانوں کو بھی فروغ دینے کی اضافی ذمے داری کونسل کو سونپی ہے تا کہ اردو زبان سے گہرے لسانی وتہذیبی رشتے رکھنے والی فارسی جیسی قدیم زبان کو بھی فروغ دیا جاسکے۔ دونوں اداروں کے ذمے داران کے درمیان فارسی زبان کے فروغ کے لیے جن مختلف پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور وخوض کیا گیا وہ حسب ذیل ہیں:

1. قومی اردو کونسل مستقبل قریب میں اردو، عربی ڈپلومہ کے طرز پر ایک سالہ فارسی سرٹیفکٹ کورس کا آغاز کرے گی جس کے نصابی متون کو آخری شکل دینے کے لیے ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا جائے گا جس میں ہندوستانی دانشوروں کے ساتھ ساتھ ایرانی دانشوروں کو بھی مدعو کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں یہ بھی طے کیا گیا کہ ہاؤس کے تعاون سے اس کا سی ڈی ورژن بھی تیار کیا جائے جو مستقبل قریب میں لانچ ہوگا۔

2. قومی اردو کونسل ایران کلچرل ہاؤس کے اشتراک سے فن خطاطی سے متعلق ایک ورکشاپ کا انعقاد کرے گی جس میں کونسل کے ذریعہ چلائے جارہے کیلی گرافی کے مراکز پر تقرر شدہ اساتذہ کو مدعو کیا جائے گا۔ یہ اساتذہ اپنی خطاطی کے نمونوں کو نمائش میں پیش کریں گے تا کہ ان کی تربیت ایران کے معروف ومشہور خطاطوں سے کرائی جائے جس کا انتظام ایران کلچرل ہاؤس کرے گا۔ میٹنگ میں کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر نسیم احمد، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 جنوری 2013

قومی اردو کونسل کی موبائل وین کا دورۂ جنوبی ہند

چنئی: یونیورسٹی آف مدراس کے صدر شعبۂ عربی فارسی و اردو سید سجاد حسین کے چیمبر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ اردو کے فروغ اور اردو داں طبقہ میں کتابوں کے مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ایک موبائل لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کررہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ شمالی ہند کا دورہ ختم کرنے کے بعد جنوبی ہند کا دورہ بھی کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت اردو کی ترقی کے لیے بہت کچھ کررہی ہے اور اس کی بہت ساری اسکیمیں ہیں جن سے اردو داں طبقہ فیض یاب ہوسکتا ہے۔ کونسل مختلف علوم وفنون پر موجود کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کراتی ہے۔ اس کے علاوہ ہسٹری اور انسائیکلوپیڈیا کے لیے الگ سے پینل موجود ہے جہاں اس تعلق سے کام ہوتا ہے۔ لٹریری پینل بھی موجود ہے، اردو کے فروغ کے لیے سیمینار اور ورک شاپ منعقد کیے جاتے ہیں اور جو ادارے ایسے پروگرام منعقد کرتے ہیں انھیں مالی تعاون بھی دیا جاتا ہے۔ مشاعروں، سیمیناروں اور کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون بھی دیا جاتا ہے۔ اردو میں کمپیوٹر ڈپلوما کورسس چلائے جارہے ہیں۔ پورے ہندوستان میں اس وقت کونسل کی جانب سے 2500 مراکز قائم ہیں اور ان مراکز کو مفت کتابیں، کورس میٹریل اور اساتذہ کی تنخواہ کونسل کی طرف سے دی جاتی ہے۔

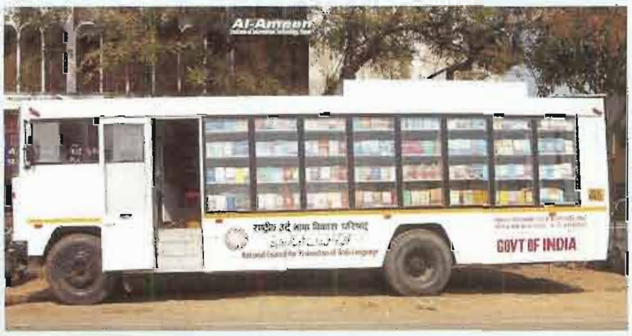

انھوں نے مدارس یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو، عربی و فارسی سے کہا کہ وہ ریاست کے مختلف تعلیمی، ادبی و سماجی اداروں کے منتظمین کا ایک اجلاس طلب کریں جس میں وہ عہدہ داروں کے ساتھ بات چیت کریں گے اور انھیں مختلف سرکاری اسکیموں کے تعلق سے جانکاری دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ کونسل میں نمائندگی بڑھے۔ گرانٹ ان ایڈ کے لیے انھوں نے محترمہ مسرت جہاں سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ کونسل کی ویب سائٹ میں ساری تفصیلات موجود ہیں۔ بہرحال قومی کونسل مرکزی حکومت کے تحت اردو زبان وادب کے فروغ میں بھرپور کوشش کررہا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 26 دسمبر 2012

مدرحلیمہ سنٹرل اسکول میں جلسہ تقسیم اسناد

وارانسی: مدرحلیمہ سنٹرل اسکول زیرگولر میں 'قومی پس منظر میں اردو کا مقام' کے موضوع پر لکچر کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت اسکول کے سرپرست اور بنارس کے معروف شاعر سلیمان آصف نے کی۔ مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر رفیع اللہ مہمان خصوصی تھے۔ وسنتا کالج کی ڈاکٹر نفیس بانو اور مدرحلیمہ اسکول کے ڈائرکٹر نعمان حسن خاں نے اردو کے مقام پر گفتگو کی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل نئی دہلی کی جانب سے چلائے جارہے اردو کورس میں 2011 میں پاس ہونے والے طلبا کو سرٹیفکیٹ تقسیم کیے گئے۔ اس میں سب سے زیادہ نمبر پانے والے طلبا کو اعزاز سے نوازا گیا۔ خواتین میں سب سے نمبر پانے والی طالبہ عصمت جہاں کو 'ردائے اردو' اور لڑکوں میں سب سے زیادہ نمبر پانے والے طالب علم امت پرجاپتی کو 'دستار اردو' سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' وارانسی، 10 دسمبر 2012

جلسہ تقسیم اسناد

موتی هاری: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے منظور شدہ تعلیمی مرکز برائے ایک سالہ ڈپلومہ کورس ان اردو لینگویج اور سرٹیفکیٹ کورس ان فنکشنل عربک کے کامیاب طلبہ کے درمیان اسناد کی تقسیم گزشتہ روز عمل میں آئی۔ موتیہاری کے سوشل قریشہ ہائی اسکول میں منعقد ایک پروگرام میں طلبہ وطالبات کو سرٹیفکیٹ تقسیم کیے گئے۔ چیئرمین خورشید عالم نے کہا کہ اردو زبان کی ترویج واشاعت میں کونسل کا اہم کردار ہے۔ یہ سینٹر علاقہ میں زبان وادب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کرے گا۔ انھوں نے

اسٹڈی سینٹر کے قیام میں کونسل کے ذمے داران کے تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر اسکول کے پرنسپل اشتیاق احمد، ڈاکٹر نور عالم، آفتاب عالم ندوی وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 8 دسمبر 2012

یومِ تعلیم

بیدر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اسٹڈی سنٹر نئوڑ (بی) تعلقہ بھالکی ضلع بیدر میں ماہانہ سیمینار (24 نومبر 2012 کو عمل میں آیا۔ سیمینار کا آغاز قرأت کلام پاک سے ہوا۔ سیمینار کی صدارت محمد باسط خاں، صوفی، نعت گو شاعر ضلع بیدر نے کی۔ مہمانِ خصوصی محمد اکرام خاں انجینئر بیدر رہے۔ مقالہ نگار آفرین بیگم ضلع بیدر نے مقالہ پیش کیا جس کا عنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات' تھا۔ صدرِ سیمینار نے 'مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق' کہا کہ یہ وہ شخصیت ہے، جس نے تعلیم کے مراکز کو عام کیا۔ اس طرح سے اردو ادب کو ایک مقام ومرتبہ حاصل ہوا۔ مہمان خصوصی نے کہا کہ 'مولانا ابوالکلام آزاد' نے ایک روشن ضمیر دماغ کا استعمال کرتے ہوئے مقام ومرتبہ حاصل کیا ہے۔

پریس نوٹ، پرنسپل دارالعلوم محمدیہ، بیدر، 2 دسمبر 2012

مدرسہ مقابل علوم میں جلسہ تقسیم اسناد

دربھنگہ: ضلع دربھنگہ کے کوشیشور استھان کی برنا پنچایت کے مدرسہ مقابل علوم میں جلسہ برائے تقسیم اسناد منعقد ہوا، مہمان خصوصی کے طور پر بلاک کے سی ای او منوج ورما نے شرکت کی اور طلبا وطالبات کے درمیان تقسیم اسناد کا فریضہ انجام دیا، اس موقعے پر منوج ورما نے کہا کہ تعلیمی عنوان پر منعقد کسی بھی پروگرام میں شرکت کرنا حسین لمحہ ہوتا ہے، انھوں نے مدرسہ انتظامیہ کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ مدرسہ اور این سی پی یو ایل کی جانب سے قائم تعلیمی سینٹر ایک انتہائی موزوں جگہ پر ہے کیونکہ یہ علاقہ کئی اعتبار سے پسماندہ ہے، انھوں نے کہا کہ این سی پی یو ایل کی مکمل خدمات سے میں واقف نہیں ہوں، مگر یہاں کے ذمے داروں نے جو بتایا ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ یہ ادارہ طلبا کو علم وہنر کے ساتھ ٹکنالوجی سے بھی جوڑنے میں اہم کردار ادا کررہا ہے۔ ڈاکٹر خورشید وارثی نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ این سی پی یو ایل اردو اور عربی کے ساتھ ساتھ دیگر امور پر بھی توجہ دے رہا ہے، جو کہ ملک وملت کے لیے خوش آئند ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 4 جنوری 2013

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

ابومحمد سحر فن و شخصیت سیمینار

بھوپال: ایسوسی ایشن آف انڈین مسلمس بھوپال کے زیراہتمام اردو زبان وادب کی عہد ساز شخصیت پروفیسر ابومحمد سحر کی ادبی ولسانی خدمات پر دو روزہ سیمینار بتاریخ 22 و 23 دسمبر 2012 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے ملا رموزی سنسکرتی بھون میں منعقد ہوا جس میں ملک کے مشاہیر علم وادب نے شرکت فرماکر پروفیسر ابومحمد سحر کی لسانی اور فکری ترجیحات پر سیر حاصل گفتگو کی اور اپنے پُرمغز مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر پروفیسر سحر کی بیگم مونس سحر اور اہل خانہ بھی موجود تھے۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں گورنر اتراکھنڈ عزت مآب عزیز قریشی کے علاوہ قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مولانا آزاد اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع بطور خاص شریک ہوئے۔ اس موقعے پر سیمینار میں کلیدی خطبہ پروفیسر مختار شمیم نے پیش کیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے ادا کیے۔ دو روزہ سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر خالد محمود اور وکرم یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر اظہر راہی نے فرمائی۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر حیدر عباس رضوی اور پروفیسر شاہدہ پروین نے پروفیسر ابومحمد سحر کے فن قصیدہ نگاری پر کیے گئے مباحث کی روشنی میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر حنیف نقوی جن کا اسی دن اپنے وطن سہسوان میں انتقال ہوگیا تھا اور انھوں نے اپنی بیماری کے باوجود 'ابومحمد سحر بحیثیت غالب شناس' اپنا مضمون بذریعہ E-mail بھیجا تھا۔ اسے پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے پڑھ کر سنایا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر حیدر عباس رضوی اور پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے فرمائی۔ جبکہ تیسرے اجلاس کی صدارتی نشست پر پروفیسر یعقوب یاور اور جناب سکندر احمد رونق افروز تھے۔ چوتھا اجلاس پروفیسر آفاق حسین صدیقی اور ڈاکٹر ارشاد نیازی کی سرپرستی میں منعقد ہوا۔ آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر آفاق احمد اور پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے فرمائی۔ سیمینار میں پروفیسر حنیف نقوی کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی قرارداد پیش ہوئی جسے پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر مختار شمیم نے کہا کہ "اردو کے معتبر محقق ونقاد اور ماہر غالبیات پروفیسر حنیف نقوی کا سانحہ ارتحال ادبی دنیا کے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔"

پریس ریلیز، ضیا فاروقی، بھوپال، 27 دسمبر 2012

جمیل مظہری توسیعی خطبہ

دربھنگہ: علامہ اقبال کی شاعری کا محور ومرکز حرکت وعمل اور تسخیرِ کائنات کی جدوجہد ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ابوالکلام قاسمی شمالی بہار کے تاریخی وتعلیمی ادارہ ملت کالج، دربھنگہ میں 'علامہ جمیل مظہری توسیعی خطبہ' سیریز کے تحت 'علامہ اقبال کے افکار ونظریات' کے موضوع پر اپنا عالمانہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال نے اپنے

فکر وفلسفے کے ذریعہ یہ پیغام دیا کہ انسان اپنی حرکت وعمل کے ذریعہ اپنی تقدیر بدل سکتا ہے اور اپنے اندر کی صلاحیتوں کو بروئے عمل لاکر کامیابی کی منازل طے کرسکتا ہے اور جب انسان اپنی صلاحیت کو پہچان لے گا تو وہ تسخیرِ کائنات میں بھی کامیاب ہوسکتا ہے۔ صدرِ جلسہ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے کہا کہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا دانشورانہ خطبہ اقبال فہمی میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کی شاعری اور فکر ونظر کے ان گوشوں کو روشن کیا ہے جو اب تک تاریک تھے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مشتاق احمد نے تمام شرکا کا استقبال کیا اور مہمانِ خصوصی پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا مختصر تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر احمد نے کہا کہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی عہدِ حاضر کے ایک نظریہ ساز نقاد ہیں اور ان کی دودرجن تصانیف وتالیفات ذخیرۂ زبان وادب میں بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر احمد نے کہا کہ گزشتہ 4 برسوں سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے علامہ جمیل مظہری توسیعی خطبے کا انعقاد ہورہا ہے اور اس سال ان تمام خطبے کو پروگرام کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر افتخار احمد کتابی صورت دینے جارہے ہیں تاکہ آنے والے دنوں میں اس علمی دستاویز سے ادبی حلقہ استفادہ کرسکے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 جنوری 2012

احتشام حسین کی ادبی خدمات

چکلیہ: معروف نقاد پروفیسر احتشام حسین کی ادبی خدمات پر چکلیہ اسمبلی حلقہ کے تحت جنتاہاٹ میں جنتاہاٹ نیوز ایجنسی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقدہ ادبی سیمینار کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ قرب وجوار کے سبھی مکتبہ فکر کے علم دوست حضرات سیمینار میں شریک ہوئے۔ مقالہ نگاروں میں قابل ذکر ڈاکٹر عمر غزالی، ایسوسی ایٹ پروفیسر ہگلی محسن کالج، ڈاکٹر شہزاد شمس، ڈاکٹر ہارون رشید، رشی کمار شرما، امتیاز سرمد اور عبدالواحد مخلص تھے، مقالہ نگاروں نے احتشام حسین کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر مقالہ پڑھا جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔ مدعوئین میں اختر الایمان رکن اسمبلی کوچادھامن،

عالمی اردو مرثیہ کانفرنس

نئی دھلی: کوئی بھی زبان اپنی تہذیب، ثقافت اور سماج سے الگ تھلگ نہیں ہوتی۔ اس سے تاریخ، کلچر اور انفرادی واجتماعی شخصیت منسلک رہتی ہے۔ اردو شاعری میں مرثیہ ایک ایسی اہم ترین صنف سخن ہے جسے ثقافتی معراج کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریہ ہند عزت مآب محمد حامد انصاری نے ایوان غالب میں 'عالمی اردو مرثیہ کانفرنس' کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ اس سہ روزہ مرثیہ عالمی کانفرنس کا انعقاد انجمن ترقی اردو ہند کی دہلی شاخ کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے کیا گیا تھا۔ کانفرنس کی افتتاحی تقریب کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق گورنر وسابق مرکزی وزیر سید سبط رضی نے شرکت کی۔ کانفرنس کے مہمان ذی وقار آئی سی سی آر کے سابق وائس چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی تھے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات ادا کیے اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر وشاعر شاہد ماہلی نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقع پر سید سبط رضی نے کہا کہ دور حاضر میں مرثیہ کو سمجھنے کے لیے اس دل کی ضرورت ہے جو جبر کے خلاف آواز اٹھائے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کا کلچر اردو ہے، اور اردو کی مشہور صنف سخن مرثیہ انسانی دردمندی کا لازوال خزانہ ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرثیہ حقوق انسانی کے

تحفظ کی دستاویز ہے۔ عدم تشدد کا پیغام بھی مرثیوں میں ہی ملتا ہے۔ سید شاہد مہدی نے کہا کہ مرثیہ میں ہندستانیت اور سنسکرت کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ کنویز ڈاکٹر رضا حیدر نے تمام مہمانان کا تعارف پیش کیا اور عالمی مرثیہ کانفرنس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی اور نظامت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ عالمی اردو مرثیے کے اس کانفرنس میں اقبال مرزا (لندن)، ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) کے علاوہ آذرمی دخت، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر علی جاوید کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کے 40 سے زاید ادیبوں نے اپنے مقالات پیش کیے اور مرثیے کے مختلف جہتوں پر گفتگو کی۔ اختتامی اجلاس میں ڈاکٹر شاہد ماہلی نے تمام مندوبین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، غالب انسٹی ٹیوٹ، 8 جنوری 2013

علی عمران رمض، مقامی ایم ایل اے غلام شاہد، ڈائرکٹر سی پی ایس شبیر احسن ہیڈ ماسٹر لودھن ہائی اسکول، ایوب پیام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اختر الایمان نے اس موقعے پر کہا کہ وہ قومیں مٹ جاتی ہیں جو اپنی زبان وتہذیب سے بے خبر ہوجاتی ہیں۔ اردو نہ صرف ہماری زبان بلکہ ہماری تہذیب وثقافت بھی ہے لہٰذا اس کے تحفظ کے لیے مضبوط اور منظم لڑائی لڑنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر انظار عالم سابق پرنسپل مارواری کالج کے ہاتھوں سیمینار متذکرہ کا اختتام ہوا۔ ڈاکٹر خورشید عالم کنویز نے سیمینار میں شرکت کے لیے آئے شرکا کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انداز ہند' کولکاتہ، 8 جنوری 2013

منٹو: فن اور شخصیت

کولکاتا: اردو ادب کے عہد ساز ادیب سعادت حسن منٹو کے فن اور شخصیت پر آر این ایل فورس' کولکاتا کے زیرِ اہتمام قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان' نئی دہلی کے تعاون سے ایک روزہ قومی سیمینار کا اہتمام 7 جنوری 2013 کو اکادمی آف فائن آرٹس کے کانفرنس ہال میں کیا گیا۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب جمیل منظر، محمد امین الدین صدیقی اور ڈاکٹر امام اعظم تشریف فرما تھے۔ کینیڈا سے تشریف لائے معروف ڈراما نگار وڈراما ہدایت کار جاوید دانش نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے منٹو کے فن کا مختصر احاطہ کیا۔ پہلا اجلاس پروفیسر شمیم انور کی صدارت میں ہوا جس میں کل چار مقالہ نگاروں احمد معراج، شاہد اقبال، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، شبانہ خاتون ثمن نے سعادت حسن منٹو کے فن سے بحث کی۔ جب کہ صدرِ اجلاس پروفیسر شمیم انور نے تمام مقالوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ دوسرا اجلاس پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی' کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر حسین احمد زاہدی، ڈاکٹر نصرت جہاں، ڈاکٹر عاصم شہواز شبلی، محمد کاظم اور ڈاکٹر امام اعظم نے 'منٹو کے افسانوں کی سماجی معنویت' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ صدرِ اجلاس پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے سیمینار اور سعادت حسن منٹو کے فن اور شخصیت نیز اجلاس میں پڑھے گئے مقالوں کا مفصل جائزہ لیا۔

پریس ریلیز، امام اعظم دربھنگہ، 7 جنوری 2013

مشترکہ تہذیب اور اردو پر سیمینار

بھوبنیشور: مدنی ویمنس ایسوسی ایشن (بھوبنیشور) کے زیراہتمام 13 دسمبر 2012 کو ریڈکراس بھون میں 'مشترکہ تہذیب اور اردو' پر صوبائی سطح کا سیمینار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح اڈیشا کے جواں سال وزیر توانائی سری ارون کمار ساہو نے کیا اس موقعے پر اردو کے معتبر شاعر ونقاد جناب خاور نقیب کی وزیر توانائی نے اعزازی شال اور گل دستے سے پذیرائی کی۔ اس ایک روزہ سیمینار کی نظامت اردو کی خوش گلو شاعرہ محترمہ ریحانہ خانم نے کی۔ الحاج سید عطا محی الدین کے زیر صدارت سیمینار کے دو اجلاس میں پروفیسر کرامت علی کرامت، سعید رحمانی، خاور نقیب، ڈاکٹر اختر حسین شافی، سعید احسن، سید عطا محی الدین، سید نور الٰہی ناطق، مولوی مطیع اللہ نازش وغیرہ نے مذکورہ عنوان پر مقالات پیش کیے۔ جناب خاور نقیب نے اردو کے دانش ور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کے کئی اقتباس کی روشنی میں اردو کی مشترکہ تہذیب کے گنگا جمنی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ یہ سیمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد کیا گیا تھا۔

بذریعہ ڈاک، مدنی ویمنس ویلفیئر ایسوسی ایشن، (اڈیشا)، 13 دسمبر 2012

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

اردو کو دوسری قومی زبان بنانے کا درجہ مطالبہ

نئی دھلی: راجیہ سبھا میں مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان میں پیدا ہونے والی اردو زبان کو ملک کے سرکاری کام کاج میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس کی ترقی کے لیے مرکزی کمیشن قائم کیا جائے، الگ سے بجٹ مختص کیا جائے، اردو اخبارات کی حوصلہ افزائی کے لیے زیادہ سے زیادہ سرکاری اشتہارات دیے جائیں اور مرکزی سطح پر اسکولوں میں اردو زبان کی تعلیم دیے جانے کا اہتمام کیا جائے۔ راجیہ سبھا میں کیے گئے اس مطالبہ کا سماجوادی پارٹی کے ساتھ بی جے پی، بی ایس پی، کانگریس، ترنمول کانگریس سمیت زیادہ تر پارٹیوں کے اراکین نے خیر مقدم کیا۔ سماجوادی پارٹی کے رکن پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) چودھری منور سلیم نے پارلیمنٹ کے جاری سرمائی اجلاس میں ضابطہ 180 کے تحت خصوصیت کے ساتھ اردو کے حق میں آواز بلند کی۔ انھوں نے اردو زبان کی درد بھری کہانی اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''میں آج ایک ایسی زبان سے متعلق معاملہ کو ایوان میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس زبان کی پیدائش اسی سرزمین میں ہوئی، یہیں جوان ہوئی اور اب یہیں سسک سسک کر بھارت ماتا کے سپوتوں سے کہہ رہی ہے کہ میں اردو ہوں، میں نے ہی انقلاب زندہ باد کا نعرہ دے کر آزادی کے متوالوں میں جنون پیدا کیا تھا، میں نے ہی کہا تھا سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، میں نے ہی لکھا تھا کہ غازیوں میں بو رہے گی جب تک ایمان کی، تخت لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی۔ میں ہی وہ اردو ہوں جس نے اپنی تحریروں سے مولانا آزاد کے اخبار الہلال اور جواہر لعل نہرو کے قومی آواز کے ذریعے ملک کی آزادی کی اہمیت ملک کے عوام کو سمجھائی تھی۔ میں آپ کی وہ عوامی زبان اور بھائی چارے کی علامت ہوں جس نے کہا تھا کہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا اور یہ بھی کہا تھا کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔'' چودھری منور سلیم نے کہا کہ ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو کسی مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ برج نارائن چکبست،

اردو اپنی بقا و تحفظ کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے: وسیم بریلوی

نئی دھلی: اردو ایک زندہ جاوید زبان ہے جو اپنے ادبی سرمایہ کے باعث اپنی بقا اور اپنے مستحکم مستقبل کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے باوجود بھی اردو آج دنیا بھر میں نہ صرف مشہور و مقبول ہے بلکہ دنیا کی ایک تہائی آبادی اسے اپنے اظہار خیال کی زبان کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین وسیم بریلوی نے پرانی دہلی میں فروغ 'اردو اور ہماری ذمے داریاں' کے عنوان سے منعقد ایک مذاکرے کے دوران کیا۔ مذاکرے کا اہتمام مائنارٹیز ویلفیئر فاؤنڈیشن آف انڈیا کے چیئرمین فرید احمد نے کیا۔ مذاکرے کا آغاز کرتے ہوئے فرید احمد نے کہا کہ عالمی سطح پر اردو کے فروغ اور بقا کے لیے جو کوششیں چل رہی ہیں ان میں ہندوستان کے اردو دانشور حضرات، شعرا کرام اور ادبا گرامی کی کوششیں قابل ذکر ہیں۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ قومی اردو کونسل نے اردو کو گھر گھر پہنچانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور نہ صرف

ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہے۔ نامور اسلامی اسکالر اور دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ انھوں نے اپنی ذاتی حیثیت میں ہمیشہ اردو کے ایک ادنی سپاہی کی حیثیت سے اردو کے فروغ کے لیے اپنی اعلی خدمات انجام دی ہیں۔ اس موقع پر دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر حسین خاں نے اپنے خصوصی خطبے میں کہا کہ یہ کہنا سراسر زیادتی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر طبقہ نہ صرف اردو سمجھتا ہے بلکہ اردو بولنا پسند کرتا ہے، ہندوستانی فلمیں، گانے، سیریل اور مختلف چینلس جن کی زبان صرف اور صرف اردو ہے مقبولیت کی بلندیوں کو صرف اسی لیے چھو رہے ہیں کہ ان کی زبان اردو ہے۔ سابق میونسپل کونسلر محمود ضیا نے کہا کہ وہ فروغ اردو کی ہر تحریک میں حصہ لینا نہ صرف اپنا فرض سمجھتے ہیں بلکہ اپنی مادری زبان کے لیے کچھ کرنا ان کے لیے فخر کی بات ہوگی۔ اتر پردیش کے سابق وزیر ڈاکٹر معراج نے بھی اس موقعے پر اردو کے فروغ میں اپنے تمام تر تعاون کا یقین دلایا۔ مذاکرے کی صدارت معروف صنعت کار اور نامور سماجی رہنما حاجی قیام الدین نے کی، انھوں نے مذاکرہ کے اختتام پر اپنے صدارتی خطبے میں شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس طرح کے اجتماعات اردو کے فروغ میں فال نیک ثابت ہوں گے۔ مذاکرہ میں جن اہم شخصیات نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی ہیں سید حاجی نثار حسین، عمر دین، شکیل پراچہ، منصور ضیا، محمد ناصر، مرزا عالم بیگ، نعیم احمد، محمد نعیم، سکندر مرزا چنگیزی، محمد الیاس قابل ذکر ہیں۔ پریس ریلیز، وسیع الرحمٰن عثمانی 16 جنوری 2013

42 اسکولوں کے طلبا و اساتذہ کو ایوارڈ

دھلی: اقلیتی طبقات خصوصاً مسلم اقلیت کی ہمہ گیر ترقی کے بغیر ہندوستان کی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہمیں ہندوستان کو متحد رکھنا ہے اور اسے بین الاقوامی سطح پر منفرد مقام دلانا ہے تو ہمارا مسلم طبقہ کے مسائل کو نظر انداز کرنا نامناسب ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے ہندی بھون نزد آئی ٹی او میں منعقد ایک پروقار جلسہ تقسیم ایوارڈز و اسناد میں کپل سبل مرکزی وزیر برائے مواصلات نے کیا تقسیم ایوارڈ کی یہ تقریب بہترین پرنسپل حضرات، ہونہار اساتذہ اور لائق طلبا کے لیے ان کے اچھے تعلیمی نتائج لانے پر منعقد کی گئی تھی اس موقعے پر سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس جناب اے ایم احمدی نے کہا کہ محنت اور حصول تعلیم ہی کامیابی کی ضمانت ہے

اور اس کے بغیر دنیا میں کوئی شخص اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنی تعارفی تقریر میں این سی پی یو ایل اور نیشنل لٹریسی مشن حکومت ہند کے رکن اور تقسیم ایوارڈ کے کنوینر فرید احمد نے مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں احساس ہے کہ ہم تعلیمی کمی اور کمزوری کے باعث دوسری اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ تعلیمی پسماندگی ہمیں مزید پیچھے لے جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کے فروغ کے لیے ہر سال ہونہار طلبا کے لیے تقسیم انعامات کی تقریب منعقد کرنے کا مقصد یہی ہے کہ طلبا کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھ سکیں۔ تقسیم ایوارڈ کے کو کنوینر مشتاق بیگ نے کہا کہ حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے اس سال طلبا و طالبات کے لیے 84 ٹرافیاں، اعلیٰ تعلیمی کارکردگی رکھنے والے 42 اسکولوں کو ٹرافیاں اور بہترین 239 اساتذہ کو اسناد پیش کی جا رہی ہیں۔ اس موقعے پر دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر حسین خان نے کہا کہ وہ حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کے تعلیمی کاموں سے پوری طرح واقف ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ سوسائٹی دہلی اقلیتی کمیشن کے ساتھ مل کر مسلم طبقات کے لیے فلاحی کام انجام دے۔ پولس کے وسطی ضلع کے ایڈیشنل کمشنر دویش شریواستو نے اپنی تقریر میں کہا دہلی پولس نو جوانوں کے تعلیمی اور سماجی حالات کو سدھارنے کے لیے ایک یوا پروگرام چلا رہی ہے۔ تقریب کے اختتام پر دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل و سابق میونسپل کونسلر جناب محمود ضیا نے تمام معززین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے پرانے شہر کو ایک مثالی شہر بنائیں گے۔ اس موقعہ پر اہم شخصیات میں حاجی قیام الدین، حاجی سید نثار حسین، جمیل الرحمٰن، شفیع دہلوی، عمر دین وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

پریس ریلیز، فرید احمد، جنرل سکریٹری، حرمین ایجوکیشن سوسائٹی اور ممبر NCPUL، 24 دسمبر 2012

دیا شنکر نسیم، نریش کمار شاد، منشی پریم چند، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی زبان ہے۔ اسی لیے اس زبان کی ترقی کے لیے اور اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے میں حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اردو کو سرکاری کام کاج میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔''

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 دسمبر 2012

انجمن ترقی اردو کی مجالس عامہ و عاملہ کا اجلاس

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری اور ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کو انجمن ترقی اردو ہند کا صدر منتخب کیا گیا ہے جب کہ متھرا روڈ پر واقع دہلی پبلک اسکول کے پرنسپل محمد اقرار حسین، معروف شاعر کیدار ناتھ سنگھ اور مشہور ماہر لسانیات و جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فاصلاتی تعلیم کے شعبے کے استاد پروفیسر عبدالرشید کو انجمن کے نئے اراکین میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کا فیصلہ اردو گھر میں منعقد کیے گئے انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلسِ عامہ اور مجلس عاملہ کے ایک مشترکہ اجلاس میں اتفاق رائے سے کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 دسمبر 2012

ساجد رشید کی ہمہ جہت شخصیت پر سیمینار

ممبئی: 22 دسمبر 2012 کو 'نیا ورق' اور ادارہ 'سب رنگ' کے زیر اہتمام مشہور صحافی و ادیب ساجد رشید کی

شخصیت اور ورک پر دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ جلسے کی صدارت مشہور فلم کار، شاعر اور ادیب گلزار نے کی۔ استقبالیہ خاکہ نگار جاوید صدیقی کا تھا، مہمانان میں تیستا ستیلواد، نادرہ ظہیر ببر، اقبال مجید، ابوظفر حسان ندوی، پروفیسر شمس الحق عثمانی تھے جنھوں نے ساجد رشید کے تعلق سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ مشہور شاعر گلزار نے اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ساجد رشید کی آواز، دوسری کئی آوازوں کو جنم دیتی ہے، ساجد رشید ایک شخص نہیں، ایک تحریک کا نام ہے۔'' جاوید صدیقی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ ہم بڑے عجیب دور سے گزر رہے ہیں۔ کرپشن ہمارا کلچر بن چکا ہے۔ سیاست جس کا تعلق عوامی بہبود سے ہوتا ہے وہ چوری اور لوٹ کھسوٹ سے منسوب ہو چکی ہے۔ انتہاپسندی کو عقیدتوں اور مذہبوں کی قطار میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ایسے ماحول کے خلاف جرأتمندانہ اظہار کو عوامی آواز بنانے والے شخص کا نام ساجد رشید تھا۔ تیستا ستیلواد نے اپنی تقریر میں کہا کہ ساجد رشید اپنے اصولوں پر جیتے تھے اس کے لیے انھوں نے اپنے دوستوں کو بھی برداشت کیا جو ان کے ساتھ تھے اور دشمنوں کو بھی جو باہر تھے۔ مشہور تھیٹر کی مشہور اداکارہ و ہدایت کار نادرہ ظہیر ببر نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج ہر شعبے میں کرپشن بڑھ چکا ہے۔ لوگ سہولت اور آرام تلاش کرتے ہیں۔ انھیں ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا، یہیں ساجد رشید یاد آتا ہے۔ مولانا ابوظفر حسان ندوی و مشہور ادیب اقبال مجید نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

پریس ریلیز، شاداب رشید، 22 دسمبر 2012

اردو کوئی مسلم زبان نہیں ہے: وسیم بریلوی

بھوپال: معروف شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کا کہنا ہے کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دینا سراسر غلط ہے۔ یہ زبان ہندوستان میں ہی پلی بڑھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس زبان کو معاشی طور پر تو نقصان ہوا لیکن ثقافتی شعبے میں اس کا فروغ ہوا، اردو شاعری میں ایک شیرینی ہے جس کی وجہ سے شاعری میں حقیقی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے ہم کو نئی نسل

کے سامنے صرف مثبت باتیں ہی لانی چاہئیں۔ ہم سچ مچ آنے والی نسل کی بہتری چاہتے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کے مذہب، ثقافت اور سماجی وراثت کی عزت کرنی چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 دسمبر 2012

مدرسوں کے طلبا جدید عربی میں مہارت پیدا کریں: خواجہ اکرام الدین

دیوبند: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام نے کہا ہے کہ اسلام مذہب میں تعلیم میں کوئی تفریق نہیں ہے، بس انسانی سمجھ کا پھیر ہے۔ دراصل اپنے عہد کے تقاضوں سے عہد برآ ہونے پر ازروئے مذہب کوئی پابندی نہیں ہے، غلطی سے ہم نے تعلیم کو قدیم و جدید کے خانوں میں تقسیم کر کے خود کو عصری علوم سے دور کرلیا ہے۔ خواجہ محمد اکرام گزشتہ دنوں مقامی دینی ادارے میں منعقدہ تقسیم اسناد برائے عربی ڈپلومہ میں شرکت کے بعد انقلاب سے خصوصی گفتگو کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک وقت تھا کہ ابن رشد اور ہیثمی اور بعد میں امام غزالی، امام فخرالدین رازی اور امام الحدیث شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے اپنے عہد میں وقت کے تمام علوم کو سیکھا اور دنیا کی رہنمائی کی۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ مدارس کو چاہیے کہ وہ درسی علوم وفنون کے ساتھ جدید عربی زبان سے بھی ہم آہنگ ہوں جو فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ انھوں نے طلبا سے وسعت مطالعہ اور بلندی فکر کو یقینی بنانے پر بھی زور دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 دسمبر 2012

اردو فارسی ادب کے ارتقا میں اقبال کی خدمات

علی گڑھ: ایس اسلامیہ مدرسہ سمیتی علی گڑھ کے زیراہتمام منعقد قومی سیمینار بہ عنوان 'اردو و فارسی ادب کے ارتقا میں علامہ اقبال کی خدمات' میں پروفیسر سید محمد ہاشم نے قوم کو پیغام دیا کہ وہ اپنے اندر کی صلاحیت کو پہچانے، نئی جہت کھولیں اور قوم کی خدمات کا جذبہ پیدا کریں، یہی اقبال کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔ پروفیسر صغیر افراہیم بیگ نے کہا کہ علامہ اقبال بیسویں صدی کے بڑے شاعر تھے، ان کا پیغام تمام عالم انسانیت کے لیے ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ مہمانِ خصوصی ممبر اسمبلی حاجی ضمیر اللہ خاں نے کہا کہ اردو ہماری تہذیب کا اہم حصہ ہے۔ اردو کی ترقی میں مدارس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیمینار میں پروفیسر اسد علی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر رضا حیدر نے بھی مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر ظفر دارک نے ایس اسلامیہ مدرسہ سمیتی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد سیمینار میں آئے تمام مہمانوں اور مندوبین کا خیرمقدم کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 دسمبر 2012

انگلوعربک اسکول میں تقسیم کتب

نئی دہلی: دہلی کی معروف دانش گاہ اینگلوعربک اِسکول میں معروف کالم نویس اور اِدارہ کی ترقی کے لیے سرگرم جناب فیروز بخت احمد کی اہم پیش رفت پر ایک خصوصی تقریب کا اِہتمام کیا گیا جس کے مہمان خصوصی قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام الدین تھے۔ اس تقریب کے اِہتمام کا مقصد قوم کی طالبات کی تعلیمی میدان میں حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ انھوں نے اِدارہ کے ذریعہ شائع کردہ کہانیوں کی کتاب، ماجد کی عقل مندی و دیگر کہانیاں اور نیکی کا انعام و دیگر کہانیوں کی کتابوں کی ایک ایک کاپی اِسکول کی طالبات میں تقسیم کی۔ خواجہ اِکرام الدین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس قدیم مشرقی دانش گاہ میں آکر بڑی خوشی محسوس ہورہی ہے۔ اس اِدارہ نے ہندوستان کو ایسے ایسے جواں مرد اور مدبرین دیئے جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے نہ صرف ہندوستان کی آبیاری کی بلکہ ہندوستان کے اوپر منڈلانے والی گھنگھور گھٹاؤں کے سامنے سینہ سپر ہوگئے۔ لائق مبارک باد ہیں اِدارہ کے منتظمین کہ اُنھوں نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے عین نباضی کا ثبوت فراہم کیا ہے اور طالبات کے لیے اِدارہ کے دروازے وا کردیے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اِدارہ کے مہتمم جناب اطیب صدیقی صاحب نے کہا کہ اُردو کے معروف صحافی اور کالم نویس جناب فیروز بخت احمد نے نہایت خلوصِ دل سے کہانیوں کا اِنتخاب کیا ہے اور اُن کی ترتیب میں اِس بات کا خیال رکھا ہے کہ اُس کا افادی پہلو مجروح نہ ہونے پائے۔ پرنسپل جناب ابراراحمد صاحب نے کہا کہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں دراصل ایامِ رفتہ کے ماہنامہ کھلونا میں شائع شدہ کہانیوں کا ایک حسین ودلچسپ اِنتخاب ہے۔ ماہنامہ کھلونا اپنے دور کے مقبول ترین ماہناموں میں سے ایک تھا۔ جناب فیروز بخت احمد نے خواجہ اِکرام الدین صاحب کے تئیں اِظہارِ تشکر کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ صاحب مخلصین قوم میں سے ہیں۔ اُنھوں نے اُردو کو نہ صرف اپنی نگارشات کے ذریعہ بلکہ عملی میدان میں اُتر کر ایک وقار عطا کیا ہے۔

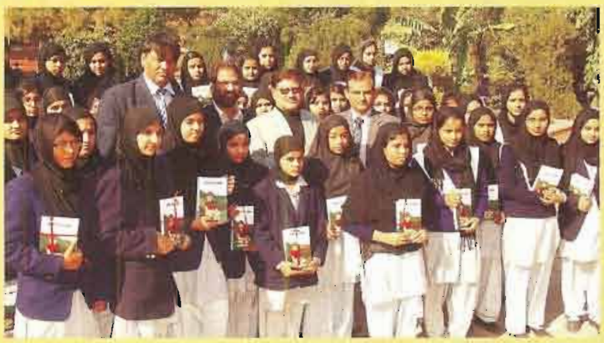

پریس ریلیز، فیروز بخت احمد، نئی دہلی، 18 دسمبر 2012

مرزا غالب کا یومِ پیدائش

نئی دہلی: مرزا اسداللہ خاں غالب کے یوم پیدائش پر پوری اردو دنیا میں سیمینار، مشاعرے، مباحثے منعقد کیے جاتے ہیں۔ دنیا بھر میں ناقدین اور محققین غالب ان کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں غالب کے مداحوں نے صرف تقریبات پر اپنی توانائی ضائع نہیں کی بلکہ اپنے تہذیبی ورثے کے تحفظ کے لیے جان توڑ کوششیں بھی کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عاشقانِ اردو غالب کی حویلی کے ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک حصے کو یادگار بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اوما شرما بھی ایسی ہی فن کارہ ہیں جنھیں غالب سے بھی محبت ہے اور ان کا تہذیبی سرمایہ بھی انھیں عزیز ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غالب کی شاعری میں اس قدر گہرائی اور وسعت ہے کہ ایک ایک شعر سے کئی کئی مفہوم نکلتے ہیں۔ شاہد ماہلی نے کہا کہ غالب کی حویلی ویران پڑی ہے۔ محض چند تصاویر اور شعروں کی تختیاں لگا دینا ہی کافی نہیں بلکہ یہاں ان کے شایانِ شان ایک بڑی یادگار بنانی چاہیے۔ پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ غالب کو یاد کرنے کے کئی طریقے ہیں ان میں ایک طریقہ شمع روشن کرنا اور کینڈل مارچ نکالنا بھی ہے۔ اردو تعلیم کو عام کیا جانا چاہیے اور اردو سیکھنے سکھانے کی کوششیں کرنی چاہئیں۔ پروفیسر صادق نے کہا کہ ابھی تک غالب پر سرکاری طور پر

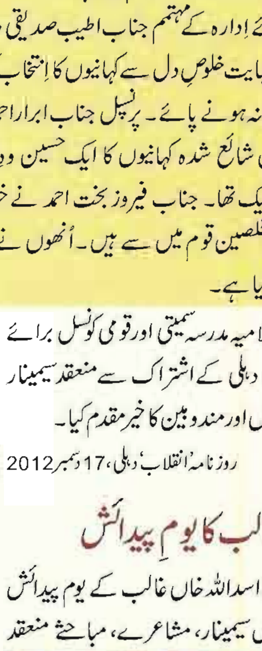

کیا گیا کام مایوس کن ہے۔ غالب کے شایان شان سرکاری طور پر ٹھوس اور بڑے اقدامات ہونے چاہئیں۔ پروفیسر توقیر احمد خاں نے کہا کہ غالب کو سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہیے اور ان کے کلام، شاعری و دیگر تصانیف کو معاشی ادب سے ملانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سماجی کارکن فیروز بخت احمد نے کہا کہ محض سالگرہ اور یوم وفات پر پروگراموں کا انعقاد کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں ان کے ذریعے پیش کردہ کلام کی معنویت اور افکار پر مسلسل تحقیق کرنے اور مثبت نتائج اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 دسمبر 2012

غالب کا 215 واں یوم ولادت

نئی دهلی: مرزا اسداللہ خاں کے 215 ویں یوم ولادت کے موقعے پر 27 دسمبر 2012 کو غالب اکادمی میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر عتیق اللہ نے 'پورے غالب کی تلاش اور آل احمد سرور' کے عنوان سے خصوصی لیکچر دیا۔ انھوں نے کہا کہ آل احمد سرور نے غالب کے تعلق سے آٹھ دس مضامین لکھے۔ غالب و اقبال ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ جب ان پر وہ لکھتے ہیں تو ان کا جوش عقیدت بھی شامل ہو جاتا ہے اور تنقید تجربے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ غالب کے تعلق سے انھوں نے جو مباحث اٹھائے وہ بڑے وقیع ہیں۔ ہماری تنقید نے انھیں اکثر اپنی بنیاد بنایا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر صادق نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ لیکچر کا عنوان غالب اور آل احمد سرور تو ہے لیکن سوچا جائے تو اس مختصر عنوان میں تین صدیوں کی سوچ اور تین مختلف نسلوں کے انداز نظر کی کارفرمائی ملے گی۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جا رہا ہے غالب کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ متین امروہی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ محققین اور ناقدین نے جو کچھ غالب کے بارے میں لکھا ہے اس کا محاسبہ کیا جائے جن کی پیدائش کے سو سال پورے ہو رہے ہیں۔ ان پر لیکچر کا اہتمام کیا جائے اس سلسلے کی کڑی کے تحت پروفیسر احتشام حسین، سعادت حسن منٹو اور اب آل احمد سرور پر اس لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 دسمبر 2012

مرزا غالب

نئی دهلی: مرزا اسداللہ خاں غالب کی حویلی کو اب ویران نہیں چھوڑا جائے گا اور اس کی مکمل بازیابی کے لیے سنجیدہ و ٹھوس کوششیں کی جائیں گی۔ غالب کی حویلی میں ہر دوسرے مہینے کوئی نہ کوئی ادبی و ثقافتی پروگرام منعقد کیا جائے گا۔ یہ اعلان انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (آئی سی سی آر) کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر سریش کمار گوئل نے غالب کے 215 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر نکالے گئے کینڈل مارچ اور تاریخی فصیل بند شہر کے بلیماران علاقے کی گلی قاسم جان میں واقع غالب کی حویلی میں منعقد کی گئی خصوصی ادبی محفل میں کیا۔ یہ پروگرام آئی سی سی آر اور غالب میموریل موومنٹ کے تعاون سے ساہتیہ کلا پریشد اینڈ بھارتیہ سنگیت سدن نے منعقد کیا تھا۔ معروف کتھک آرٹسٹ اوما شرما کی قیادت میں غالب کی حویلی تک کینڈل مارچ کا آغاز ہوا۔ اس موقعے پر پاکستان کے معروف فنکار استاد مظہر امراؤ بندو خان، ہندوستان کے معروف فنکار اقبال احمد خان، معروف فنکار رئیس احمد خان، سنگیت ناٹک اکادمی کی وائس چیئرپرسن شانتا سربجیت سنگھ، ڈی سی ایم کے چیئرمین اور شنکر شاد مشاعرے کے کنوینر ڈاکٹر ونے بھرت رام، کیلاش ناتھ، مقامی کونسلر عمران حسین، امریکہ کے لکی سنگھ، ڈاکٹر سنجے ڈھینگرہ، وجے کار سکسینہ، وچترا شرما، جسپال سنگھ، اکبر علی، بی ڈی نجمی صدیقی، علیم الدین اسعدی، سمیت سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ اس موقعے پر دہلی کے وزیر برائے توانائی و خوراک و رسد ہارون یوسف نے تمام مہمانان کا غالب کی حویلی میں خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ غالب کو ملک کی سرحدوں میں قید نہیں رکھا جا سکتا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 دسمبر 2012

دهلی:

اردو اساتذہ کا سائنسی دورہ اور ورکشاپ

نئی دهلی: قومی راجدھانی کے 3 مسلم اقلیتی اردو اسکولوں کے اساتذہ نے گجرات کے احمد آباد میں واقع وکرم سارا بھائی کمیونٹی سائنس سینٹر میں سائنس دانوں سے راکٹ بنانے کے گر سیکھے اور عراق کے اسکڈ میزائل کی طرز پر ایک ماڈل راکٹ تیار کر کے اس کا کامیاب تجربہ بھی کیا۔ اینگلو عربک سینئر سیکنڈری کو ایجوکیشن اسکول، اینگلو عربک ماڈل اسکول اور شفیق میموریل سینئر سیکنڈری کو ایجوکیشن اسکول کے سائنس اور ریاضی کے اساتذہ کے گروپ نے وکرم سارا بھائی کمیونٹی سائنس سینٹر میں 'جدید سائنس اور ریاضی' کے موضوع پر منعقد کی گئی ایک خصوصی ورکشاپ میں حصہ لیا۔ یہ تین روزہ ورکشاپ مسلم اقلیتی اسکولوں کے لیے خصوصی طور پر منعقد کی گئی تھی اور اس میں شرکت کے لیے دہلی ایجوکیشنل سوسائٹی و اسکول مینجمنٹ کو وکرم سارا بھائی کمیونٹی سائنس سینٹر کی طرف سے خاص طور سے اجازت دی گئی تھی۔ مذکورہ سائنس سینٹر میں اردو اقلیتی اسکولوں کے لیے منعقد کی گئی اس ورکشاپ کا مقصد اساتذہ کو ماڈرن سائنس کی رغبت دلانا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 جنوری 2012

جشن بہار خسرو

نئی دهلی: ہم حضرت امیر خسروؒ کے زر خرید غلام ہیں ہمیں چاہیے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں۔ ہم اگر صوفیائے کرام کی تعلیمات پر عمل کریں گے تو یقیناً اچھے انسان بن جائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار لوک سبھا کے سابق اسپیکر بلرام جاکھڑ نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 'جشن بہار خسرو' کے عنوان سے منعقدہ ایک پروگرام میں کیا۔ انھوں نے کہا ہم نے صوفیائے کرام کی تعلیمات کو فراموش کر دیا اور ایک دوسرے کا خون بہانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد محفل سماع میں غلام وارث نظامی نے حمد پیش کی اور غلام صابر نظامی نے طوطی ہند حضرت امیر خسرو کا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 دسمبر 2012

آندھرا پردیش

محمد علی جوہر کی یاد میں جلسہ

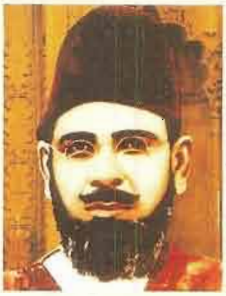

حیدر آباد: مولانا محمد علی جوہر بیباک نڈر اسلامی اقدار کے رجحان ساز صحافی تھے۔ آج ہندوستانی قوم کو محمد علی جوہر جیسے نڈر، بے باک قائد و صحافی کی ضرورت ہے جو قوم اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہے وہ زندہ نہیں رہتی، ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایس اے شکور سکریٹری، ڈائرکٹر آندھرا پردیش اردو اکادمی نے مولانا محمد علی جوہر کے 134 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہال باغ عامہ نامپلی میں منعقدہ بزم جوہر کے 50 ویں سالانہ سمپوزیم میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کہا کہ مولانا جوہر کی حیات و خدمات اور آزادی کے لیے دی گئی ان کی قربانیوں کو ہندوستان کی تمام مسلمہ زبانوں کی نصابی کتب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ سمپوزیم کے بعد سینئر شاعر مظفر مجاز کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 18 دسمبر 2012

فرزندان جامعہ عثمانیہ کا جلسہ

حیدرآباد: جامعہ کے قیام کا مقصد ہی زبان اردو کا فروغ تھا اور ساتھ ہی ساتھ مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم فراہم کر کے اہل اردو کو دیگر ترقی یافتہ زبان والوں کے مساوی کرنا تھا۔ 1908 میں نظام ہفتم میر عثمان علی خان نے اس کو قائم کیا اور 1922 سے یہاں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سیدہ جعفر سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے کیا۔ وہ باغ عامہ، نام پلی میں واقع مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کر رہی تھیں۔ ڈائرکٹر اردو اکادمی آندھرا پردیش پروفیسر ایس اے شکور نے اس افتتاحی اجلاس سے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ سے فارغ التحصیل اشخاص آج نہ صرف بیوروکریٹ میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں بلکہ ریاستی کابینہ کے کئی وزرا کو بھی عثمانین ہونے کا شرف حاصل ہے۔ روزنامہ، رہنمائے دکن، حیدرآباد، 26 دسمبر 2012

گھر گھر اردو مہم

حیدرآباد: اے پی اردو فورم و مظہر ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے یوم مولانا ابوالکلام آزاد 'گھر گھر اردو' کے ضمن میں جلسہ عام منعقد ہوا جس کی صدارت جناب محمد اسماعیل الرب انصاری صدر فورم نے کی۔ محمد عبدالوحید نے کہا کہ اردو زندہ جاوید زبان ہے اس کے پڑھنے والوں کا مستقبل تاریک نہیں بلکہ روشن ہوتا ہے۔ محمد اسماعیل الرب انصاری نے کہا کہ فورم عرصہ دراز سے مولانا آزاد کے پیغام کو عام کرنے کے لیے لگا ہوا ہے۔ تاکہ آپ کے ذریعے نئی نسل کو اردو لکھنا و پڑھنا سکھایا جائے۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 24 دسمبر 2012

اتر پردیش:

عربی اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ

علی گڑھ: رابطہ ادب اسلامی کی جانب سے شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی میں ایک بین اللسانی مذاکرہ بعنوان 'عربی اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ' منعقد ہوا۔ جن کی صدارت شعبہ عربی کے صدر شعبہ پروفیسر کفیل احمد قاسمی نے کی۔ پروفیسر سید احتشام احمد ندوی نے 'غالب اور متنبّی کا تقابلی مطالعہ' پیش کیا اور دونوں کے مماثل اشعار سے محفل کو لطف اندوز کیا۔ پروفیسر محمد راشد نے اردو زبان وادب سے عرب اساتذہ و ادبا کی والہانہ شیفتگی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے 'علامہ اقبال اور امیر الشعرا شوقی کی شاعری کے مشترکہ موضوعات' پر مقالہ پیش کیا، پروفیسر صلاح الدین عمری نے 'عالم عرب میں اقبالیات کی بازگشت' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر سید محمد ہاشم نے عرب ممالک میں اقبال شناسی کے فروع میں سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کاوشوں کو سراہا۔

پریس ریلیز، شفیق احمد ندوی، پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 15 دسمبر 2012

مرادآباد میں پروفیسر محمد حسن پر سیمینار

مرادآباد: بارہ والان واقع نہرو یوا منڈل کے دفتر پر منڈل کی جانب سے ایک روزہ سیمینار بعنوان ترقی پسند تحریک کا سپہ سالار محمد حسن منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر محمد حسن کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ انھیں اس دور کے نوجوانوں کے لیے مشعل راہ قرار دیا گیا۔ پروگرام کی صدارت حکیم تصدق حسن نے کی اور نظامت ناصر حسن اور ترنم پروین

نے مشترکہ طور پر انجام دی جب کہ سی ڈی او سید معصوم علی سرور نے سیمینار میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ان کے علاوہ کثیر تعداد میں ادبا و دیگر اہل ذوق حضرات بھی شامل رہے۔ سی ڈی او سید معصوم علی سرور نے سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر محمد حسن کا یہ ادبی کارنامہ نہ صرف ادبی حیثیت سے ہی اہمیت کا حامل ہے بلکہ اپنے بحر بیکراں میں معاشی اہمیتوں کے گوہر بھی سموئے ہوئے ہے۔ ان کے علاوہ مقالہ نگاروں میں شیخ نگیموی، سید محمد ہاشم وغیرہ کے مقالوں میں محمد حسن کی زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی اور اس موقعے پر شہر کی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 دسمبر 2012

مبارک پور میں یومِ حسن الاعظمی

مبارکپور: مبارکپور کو عالمی شہرت عطا کرنے میں محمد حسن الاعظمی کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے اردو زبان کی خدمت انجام دیتے ہوئے جامعہ ازہر مصر میں شعبۂ اردو کا قیام کیا۔ ان خیالات کا اظہار علامہ اقبال ایجوکیشنل سوسائٹی کے سرپرست ڈاکٹر شمیم احمد چیئرمین نگر پالیکا پریشد نے علامہ اقبال ایجوکیشنل سوسائٹی رجسٹرڈ نگر پالیکا پریشد مبارکپور کے زیر اہتمام نگر پالیکا ہال میں منعقدہ 'یوم حسن الاعظمی' کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے کہا کہ مبارکپور ایک ایسی سرزمین ہے جہاں پہ بہت سے علما، ادبا، شعرا، مصنف اور محقق پیدا ہوئے ہیں اور انھوں نے مبارک پور کو ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 دسمبر 2012

فیروز آباد میں جوہر ڈے

فیروز آباد: مولانا محمد علی جوہر کے ایک اشارے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آگیا تھا۔ ایسی بااثر شخصیت تھے مولانا محمد علی جوہر۔ ان خیالات کا اظہار مولانا فاروق علی قاسمی نے مولانا محمد علی انٹر کالج میں 'جوہر ڈے' کے انعقاد کے موقعے پر کیا۔ پروگرام کے صدر مولانا فاروق نے بتایا کہ دو سو طلبہ نے مولانا کی ایک آواز پر لبیک کہا اور اے ایم یو کو چھوڑ کر کھڑے کھڑے مولانا کی قائم کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ حالانکہ اس کو بعد میں دہلی میں شفٹ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام نے بتایا کہ مولانا بہت ہی بلند پایہ کے صحافی تھے۔ انھوں نے ہمدرد سے لے کر 'کامریڈ' تک صحافت کے میدان میں انگریزوں سے اپنا لوہا منوالیا۔ فصاحت میر خاں نے اس موقعے پر بتایا کہ بیماری کے باوجود گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جاتے وقت صحافیوں نے جب ان سے پوچھا کہ آپ کیوں جا رہے ہیں، تو مولانا نے کہا کہ 'مرنے' اللہ نے ان کے الفاظ کو کچھ ایسا پکڑا کہ گول میز کانفرنس کے فوراً بعد مولانا کا انگلینڈ میں ہی انتقال ہوا۔ مولانا کو بیت المقدس، فلسطین میں دفن کیا گیا۔ اس موقعے پر شہر کے ادیب، شعرا و معزز شخصیات بھی موجود رہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 دسمبر 2012

اردو کو سرکاری درجہ دینے کا مطالبہ

علی گڑھ: اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ریجنل صدر کنور نسیم شاہد کی قیادت میں وزیر اعلیٰ کے نام ایک عرضداشت ضلع انتظامیہ کو سپرد کی گئی، جس میں اردو اساتذہ کے مسائل و اردو زبان کے فروغ کی تئیں توجہ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ میمورنڈم میں اترپردیش میں

اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اردو اساتذہ کی کمی اور طلبہ طالبات کے بڑھتے تناسب کے مطابق 50 ہزار اردو اساتذہ کی تقرری صوبہ بھر میں کی جائے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 جنوری 2012

ایک شام فیض کے نام

رام پور: رامپور رضا لائبریری میں آکاشوانی رامپور کی جانب سے فیض احمد فیض کی یاد میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا افتتاح سریندر راجیشوری نے کیا جس کی نظامت اشیم سکسینہ نے کی اس موقعے پر فیض کی غزلیں جمیل احمد سخاوت حسین نے اپنی سریلی آواز میں سامعین کی نذر کی پروگرام میں ڈاکٹر عزیز احمد، ڈاکٹر اروند ترپاٹھی، ڈاکٹر اوم بھارتی، طارق مہندی، ڈاکٹر وریندر ڈنگ والا، پروفیسر علی احمد فاطمی، فرحت رضوی، ہریش کمار شرما، ڈاکٹر شعیب رضا، پروفیسر حسن نظامی، پروفیسر محمد مزمل، پروفیسر عزیز الدین ہمدانی نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ آخر میں پروگرام انچارج سندیپ کور نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 31 دسمبر 2012

اڈیشہ:

عالمی یومِ اردو

راورکیلا: 9 نومبر عالمی یومِ اردو حسب سابق 'اڈیشہ فروغِ اردو کاؤنسل، راورکیلا' و 'آل اڈیشہ ٹیچرس ایسوسی ایشن سندر گڑھ یونٹ راورکیلا' کی جانب سے مشترکہ طور پر اردو اسکول، راورکیلا کے مولانا آزاد ہال میں اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقعے کے لیے 4 روز پیشتر

'اڈیشہ فروغ اردو کونسل، راورکیلا' کی جانب سے تحریری و تقریری مقابلے طالب علموں کے درمیان کرائے گئے تھے۔ مذکورہ مقابلے میں اوّل و دوم آنے والے بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے 9 نومبر عالمی یوم اردو کے موقعے پر مہمانِ خصوصی ضلع پبلک ویلفیئر آفیسر اے کے جینا کے دستِ مبارک سے تقسیم کیے گئے۔ بعد ازاں ضلع سطح کے اردو، ہندی کے شاعروں نے محفلِ مشاعرہ میں اپنی اپنی تخلیقات ترنم سے پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی جناب آر این مشرا (اے ڈی ایم راورکیلا) اور اعزازی مہمان جناب داؤد الرحمٰن (سکریٹری اڈیشہ اردو اکادمی شریکِ جشنِ اردو کے محفلِ مشاعرہ میں رہے۔

پریس ریلیز، عبدالرزاق، 31 دسمبر 2012

اردو اساتذہ، صحافیوں اور شعرا و ادبا کا بیمہ

ممبئی: اردو اساتذہ، صحافیوں، شعرا اور ادبا کا حکومت مہاراشٹر انشورنش کرے گی اور ان کی انشورنش کی رقم خود حکومت اپنی جیب سے ادا کرے گی یہ اعلان آج یہاں مہاراشٹر کے اقلیتی امور کے وزیر محمد عارف نسیم خان نے اساتذہ کی ملک گیر تنظیم آل انڈیا آئیڈیل ٹیچر ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقدہ ایک کانفرنس کے دوران کیا۔ ممبئی کے پاٹکر ہال میں منعقدہ اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو اساتذہ کرام، اردو صحافیوں اور اردو کی خدمت کرنے والے شعرا اور ادبا کو حکومت طبی سہولیات کے لیے کسی نامور انشورنش کمپنی سے ان کا انشورنش کرے گی اور اس کے پریمیئر کی رقم اردو اکادمی سے دی جائے گی۔ اقلیتی بہبود وزیر نے مسلمانوں میں تعلیم کے میدان میں ترقی کیے جانے کو خوش آئند قرار دیا اور کہا کہ سرکاری اطلاعات کے مطابق مسلمانوں میں شرح تعلیم میں دس فی صد سے زائد اضافہ ہوا ہے۔ ریاست کی کابینی وزیر ورشا گایکواڑ نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ اساتذہ کرام جو ملک وملت کی خدمت انجام دیتے ہیں ان کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔ اس موقعے پر اساتذہ کے ویب سائٹ کا اجرا بھی کیا گیا۔

روزنامہ خبر جدید دہلی، 24 دسمبر 2012

بہار:

انجمن ترقی اردو بہار کا میمورنڈم

پٹنہ: عبدالقیوم انصاری سکریٹری، انجمن ترقی اردو بہار و کوآرڈینیٹر، قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات، نئی دہلی نے ایک پریس بیان جاری کر بتایا کہ صوبہ بہار میں مدارس، مدارس کے اساتذہ اور اردو زبان کے چند مسائل کے حل کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو بہار کے وفد نے سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار کی قیادت میں مرکزی وزیر تعلیم شری پلم راجو سے ملاقات کر ایک میورنڈم پیش کیا۔ میمورنڈم میں مدارس کے اساتذہ کو چھٹی شرح تنخواہ کے مساوی مشاہرہ ادا کرنے، کیندریہ ودیالیوں اور نوودے ودیالیوں میں اردو اساتذہ کی بحالی، مدارس میں سائنس کے استاد کی تنخواہ ادا کرنے، بہار کے منظور شدہ مدارس کی عمارت کی تعمیر کے لیے فنڈ کی فراہمی کرانے جیسے مطالبات شامل ہیں۔ وزیر موصوف نے مثبت کارروائی کی یقین دہانی کرائی۔

پریس ریلیز عبدالقیوم انصاری سکریٹری، انجمن ترقی اردو بہار، 30 دسمبر 2012

شاد عظیم آبادی کا یومِ پیدائش

پٹنہ: شاد عظیم آبادی اسٹڈی سرکل اور نوشتی نکیتن کے زیر اہتمام اردو کے مشہور و معروف شاعر شاد عظیم آبادی کے 168 ویں یوم پیدائش تقریب کی صدارت کرتے ہوئے سینئر صحافی گیان وردھن مشر نے پٹنہ سٹی کی اردو لائبریری کا نام شاد عظیم آبادی کے نام پر کیے جانے کی تجویز پیش کی۔ شاد کے پرپوتا نثار احمد نے شاد عظیم آبادی کی شاعری اور ان کی ادبی خدمات پر تفصیلی گفتگو کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی بہار ہندی ساہتیہ سمیلن کے چیئرمین ڈاکٹر انیل سلبھ، مہمان اعزازی اقلیتی کمیشن کے نائب صدر سردار چرن سنگھ بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر انل سلبھ نے اپنے خطاب میں کہا کہ شاد عظیم آبادی نے اپنی شاعری میں سہل زبان استعمال کر کے ہم عصر شاعروں میں منفرد مقام حاصل کیا۔ اس موقعے پر اردو شاعری میں گراں قدر خدمات کے لیے معروف شاعر حسن نواب حسن کو اور ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر مہندر پرساد یادو کو شاد عظیم آبادی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 جنوری 2013

راجستھان:

مخمور سعیدی: فن اور شخصیت

جودھپور: 'شہری معاشرت میں رہتے ہوئے دیہاتی محبت کا نام مخمور ہے۔ مخمور کی زندگی اور شاعری میں فرق نہیں ملتا۔ روایت کا انجذاب کرتے ہوئے انھوں نے اپنی الگ راہ ایجاد کی اور اردو شاعری کی مختلف اصناف کو اونچائیاں عطا کی۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے بزمِ اردو، جودھپور اور راجستھان اردو اکادمی، جے پور کے زیرِ اہتمام منعقد کل ہند سیمینار 'مخمور سعیدی: فن اور شخصیت' میں افتتاحی اجلاس کے کلیدی خطبہ میں بطور صدر کیا۔ اجلاس کے مہمان خصوصی سابق چیف جسٹس مگھراج کلا نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مخمور نے ادب کی نئی تاریخ تشکیل کی۔ مہمانِ امتیازی راجستھان اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی نے کہا کہ مخمور کی شخصیت خود ایک دبستان تھی اور ان کی شاعری آپ بیتی کا اظہار ہے اور ان کے یہاں رومانیت، ترقی پسندی اور جدیدیت کا امتزاج ملتا ہے۔ سابق ایم ایل اے جگل کابرا نے انھیں سادگی پسند اور اچھا انسان بتایا۔ نظامت شین میم حنیف نے کی۔ سیمینار کے چاروں اجلاس میں ملک کے ہر حصے سے آئے ہوئے ادیب اور اسکالروں نے اپنے اپنے مقالات پڑھے اور مباحثے میں حصہ لیا۔

اختتامیہ اجلاس کے صدر شین کاف نظام نے دوروزہ اجلاس کے مقالوں کے حوالے سے مخمور کی شخصیت وان کی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی جسٹس این این ماتھر نے مخمور کی شاعری میں زندگی کے پیچ وخم کا ذکر کیا۔ جسٹس مگھراج کلا نے مخمور کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی نے شین کاف نظام کے اصرار پر راجستھان اردو اکادمی کی جانب سے ابھرتے ہوئے شاعر کو 'مخمور سعیدی انعام' دیے جانے کے آغاز کا اعلان کیا۔ اس موقعے پر راجستھان اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی اور ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ کرشن کمار طور کا اعزاز دیا گیا۔ نظامت محمد افضل جودھپوری نے کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر نثار راہی، سکریٹری، بزم اردو، جودھپور، راجستھان، 25 دسمبر 2012

بھوپال میں اردو کارواں کا جلسہ

بھوپال: مدھیہ پردیش کے وزیراعلیٰ شیوراج سنگھ چوہان نے کہا کہ ان کی سرکار اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گی۔ اس موقعے پر انھوں نے یقین دلایا کہ ریاستی سرکار اپنا اردو کا رسالہ جو کئی سالوں سے بند ہے، دوبارہ شروع کرے گی۔ وہ یہاں اردو کارواں کے ذریعہ منعقدہ ایک پروگرام میں اظہار خیال کررہے تھے۔ اس موقعے

پر پریس کونسل آف انڈیا کے چیئرمین جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے اردو کی شاعری اور ثقافت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی شاعری دنیا کی عظیم ترین شاعری ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا میں اردو شاعری کا شمار صفحہ اول کی شاعری میں ہوتا ہے۔ اس موقعے پر ریاست کے گورنر رام نریش یادو نے کہا کہ اردو اور ہندی دو بہنوں کی طرح ہیں۔ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور اس کو یہیں فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے کہا کہ قطعاً غیر مناسب بات ہے کہ ہم اس خوبصورت زبان کو کسی ذات یا فرقہ سے وابستہ کردیں۔ اس موقعے پر اردو کے مشہور شاعر وسیم بریلوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ اردو کو کسی فرقہ سے جوڑنے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ ثقافتی بدعنوانی میں ملوث ہیں۔ اس موقعے پر آل انڈیا اردو ایڈیٹر کانفرنس کے صدر م افضل نے کہا کہ یہ زبان صرف اس وقت ہی فروغ پاسکتی ہے جب اس کو روزگار سے وابستہ کرلیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 دسمبر 2012

کرناٹک: ——————

اردو کے لیے یادداشت

بیدر: مسلم ہیومن رائٹس ایسوسی ایشن بیدر کی جانب سے یادداشت ڈپٹی کمشنر بیدر کو پیش کی گئی جس میں اپیل کی گئی ہے کہ وہ تمام گورنمنٹ سیکٹر میں اردو زبان کے استعمال کو یقینی بنائیں۔ ایسوسی ایشن کے صدر سید وحید لکھن، نائب صدر مرزا صفی اللہ بیگ اور شیخ انصار سکریٹری کی دستخطوں پر مشتمل اس یادداشت میں کہا گیا ہے کہ 1981 کے ایکٹ کے بموجب جہاں کہیں 15% اقلیتوں آبادی ہوگی وہاں اقلیتوں کی زبان یعنی اردو کا چلن دفاتر میں عام ہونا چاہیے۔ مائینا ریٹی لنگویج کمشنر کے سروے اور اس سرکلر کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم ہیومن رائٹس ایسوسی ایشن مطالبہ کرتی ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے اور تمام درخواستیں اردو زبان میں بھی وصول کی جائیں۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 18 دسمبر 2012

مغربی بنگال: ——————

ریاستی انجمن ترقی اردو کی تشکیل نو

کولکاتہ: 23 دسمبر 2012 کو اراکین انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی ایک میٹنگ ایران سوسائٹی، کولکاتہ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر قیصر شمیم نے کی۔ اس جلسے میں جناب عبدالقیوم انصاری، کوآرڈینیٹر، انجمن ترقی اردو ہند مشاہد کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ متفقہ طور پر انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے عہدہ داران اور ممبران کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس انتخاب میں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے صدر کی حیثیت سے پروفیسر قیصر شمیم، نائب صدر کے طور پر عبدالجلیل (آسنسول)، حفیظ الرحمٰن (کولکاتہ) ڈاکٹر سعیدالدین مسٹر زکریا اسٹریٹ (کولکاتہ) محمد اظہار عالم (کلٹی) جب کہ سکریٹری محمد صدیق (ہگلی) جوائنٹ سکریٹری کے طور پر ایم اے قاسم علیگ (ہاوڑہ) ماسٹر سراج الدین (کمرہٹی) محمد علی جان ایڈوکیٹ، (ٹیٹا گڑھ) ڈاکٹر نہال احمد، زکریا اسٹریٹ اور جناب اشفاق حسین خاں خازن کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔

پریس ریلیز، محمد صدیق، سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال، 23 دسمبر 2012

مہاراشٹر: ——————

عبدالستار دلوی کا سردار جعفری میموریل لیکچر

ممبئی: شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کی جانب سے منعقد کیے گئے علی سردار جعفری چوتھے یادگاری خطبہ میں اردو کے معروف اسکالر اور ماہر لسانیات پروفیسر عبدالستار دلوی نے 'سرسید، ممبئی اور علی گڑھ تحریک' کے عنوان سے پرمغز اور تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی وسماجی احیا کے لیے سرسید کی کوششوں کے حوالے سے پروفیسر دلوی نے کہا کہ سرسید کا ممبئی سے ذہنی رشتہ تھا اور 1869 میں برطانیہ جاتے وقت انھوں نے 3 دن یہاں قیام کرکے اس شہر کی سماجی اور معاشی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمودالرحمٰن نے اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر دلوی کے عالمانہ اور محققانہ خطبہ کی اہمیت کو واضح کرتے

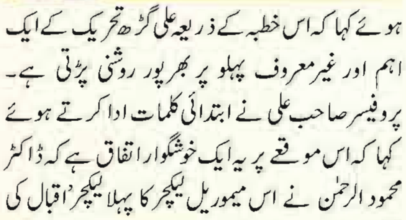

ہوئے کہا کہ اس خطبہ کے ذریعہ علی گڑھ تحریک کے ایک اہم اور غیر معروف پہلو پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر صاحب علی نے ابتدائی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس موقعے پر یہ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اس میموریل لیکچر کا پہلا لیکچر 'اقبال کی شاعرانہ بصیرت' کے موضوع پر دیا تھا اور آج کے خطبہ کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر موصوف نبھا رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم جنوری 2012

شہید اشفاق اللہ کی یاد میں تقریب

کولھاپور: ''مادروطن ہندوستان کی آزادی اور غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کی تحریک اور جدوجہد میں علما دین، سرفروش مجاہدین اور صاحب غیرت مسلمانوں کا قائدانہ اور سرفروشانہ کردار رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ایاز الشیخ، چیئر مین امام غزالی ریسرچ فاؤنڈیشن گلبرگہ نے کولھاپور مہاراشٹر شہید اشفاق اللہ خان کی یوم شہادت کے ضمن میں منعقدہ تقریب میں 'جنگ آزادی ہند میں مسلمانوں کا قائدانہ کردار' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا۔ کیشور روا بھوسلے ناٹیہ گرہ کے وسیع آڈیٹوریم میں منعقدہ اس تقریب کا انعقاد محکمہ تعلیم کولھاپور مہانگر پالیکا، کولھاپور ٹیچرس ایسوسی ایشن نے مشترکہ طور پر کیا تھا، اس تقریب کی مہمان خصوصی میئر کولھاپور محترمہ جے شری سوناونے تھیں۔ شہید اشفاق اللہ خان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جدوجہد آزادی میں رام پرشاد بسمل کے ساتھ مل کر جدوجہد کی۔ بالآخر وطن کے لیے پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیے گئے۔ مجاہدین آزادی کی یہ جدوجہد ہمیں اس بات کا درس دیتی ہے کہ مشترکہ جدوجہد کے اس روشن ورثہ کی نہ صرف حفاظت کریں بلکہ ہندوستانی معاشرہ کی ترقی کو صحیح سمت عطا کریں۔ پروفیسر امداد اللہ شیخ صاحب نے اپنے تعارفی خطاب میں کہا کہ آج ملک کی آزادی کی خاطر جدوجہد کرنے والوں اور جان کی بازی لگانے والوں کو یاد بھی کیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 دسمبر 2012

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایوارڈ

نئی دھلی: ترقی پسند تحریک سے ہندوستان میں کوئی انقلاب تو نہیں آیا مگر ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں اور مختلف میدانوں میں کام کرنے والے لوگ متحد ہوئے۔ ان خیالات کا اظہار عابد سہیل نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سالانہ جلسہ تقسیم غالب انعامات و بین الاقوامی سیمینار کے افتتاح کے موقعے پر ایوان غالب میں منعقد ایک پروقار تقریب میں کیا۔ اس موقعے پر پاکستان کے 'پنجاب آرٹ کونسل کے چیئر مین عطاء الحق قاسمی نے کہا کہ ترقی پسند تحریک سے قبل بھی ترقی پسندی تھی اور بعد میں بھی ترقی پسندی پائی جاتی ہے۔ تقی عابدی نے ترقی پسند تحریک کے دور کی شاعری و ادبی خدمات کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند تحریک نے پرانی سوچ بدلی، نئے خیالات و احساسات کیے اور نئی چیزوں کی تشریح کے علاوہ معیار حسن کو بدلا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن نے غالب کے کلام وان کے موضوعات کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد اور تاریخ بیان کی۔ انھوں

نے اس کی اہمیت و خدمات اور ادب پر اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس سال ترقی پسند تحریک کے قیام کے 75 سال پورے ہونے پر بین الاقوامی غالب سیمینار کا موضوع 'ہمارا کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تحریک' رکھا گیا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن نے سیمینار میں پڑھے جانے والے تقریباً 40 سے زائد مقالوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے اعلان بھی کیا۔ اس افتتاحی تقریب کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا حیدر نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ کارکرگی و ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات اور مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ بعدازاں غالب انسٹی ٹیویٹ کی شائع کردہ کتاب 'غالب کا تفکر'، پروفیسر وہاب قیصر کی تصنیف 'منظر بہ چشم غالب'، ڈاکٹر احسن الظفر کی بیدل و غالب'، پروفیسر علی احمد فاطمی کی 'غالب اور الہ آباد' تحسین فراقی (پاکستان) کی 'غالب فکر و آہنگ' اور حنیف نقوی کی تصنیف کردہ کتاب 'غالب اور جہان غالب' کا ڈاکٹر تقی عابدی اور عطاء الحق قاسمی کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ علاوہ ازیں اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ 'غالب نامہ' کے جولائی 2012 اور جنوری 2012 کے شمارے کا اجرا بھی کیا گیا۔ آخر میں جسٹس بدر دریز احمد اور ڈاکٹر پرویز احمد نے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر و معروف نقاد پروفیسر عتیق اللہ (دہلی) کو اردو تحقیق و تنقید کے لیے فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے 2012 سے سرفراز کیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر آذرمی دخت صفوی (علی گڑھ) کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے 2012 برائے فارسی تحقیق و تنقید سے نوازا گیا۔ بعدازاں اردو شاعری کے لیے کرشن کمار طور (دھرم شالہ)، اردو نثر کے لیے پروفیسر محمد ذاکر (دہلی) اور پروفیسر کلیم احمد عاجز (پٹنہ) کو مجموعی ادبی خدمات کے لیے غالب انعام 2012 سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ اردو ڈرامہ کے لیے پروفیسر نورالعین علی (ممبئی) کو 'ہم سب غالب' انعام 2012 عطا کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 دسمبر 2012

اعزاز و اکرام:

ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ

نئی دھلی: اردو کے ممتاز و معروف شاعر کرشن کمار طور کو ان کے شعری مجموعہ 'غرفۂ غیب' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2012 دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ساہتیہ اکادمی کے امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ ایوارڈ 18 فروری 2013 کو کمانی آڈیٹوریم، دہلی میں منعقد ہونے والی ساہتیہ اکادمی کی ایک پروقار تقریب میں پیش کیا جائے گا۔

ساہتیہ اکادمی کے کارگزار صدر وشوناتھ پرشاد تیواری کی صدارت میں کل ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں 19 ہندستانی زبانوں کے یُووا ایوارڈ 2012 کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں یُووا ایوارڈ کے لیے جواں سال قلم کار غضنفر اقبال کو ان کی کتاب 'معنیِ مضمون' کے لیے منتخب کیا گیا۔ ان کی عمر یکم جنوری 2012 کو 35 سال یا اس سے کم ہے۔ یہ ایوارڈ پچاس ہزار روپے اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔

24 ہندستانی زبانوں کے ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2012 کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں ترجمہ کے لیے ممتاز اسکالر اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی کو ان کے بہترین ترجمہ 'بابر کی اولاد' کے لیے منتخب کیا گیا جو سلمان خورشید کے انگریزی پلے Sons of Babur کا اردو ترجمہ ہے۔ ساہتیہ اکادمی ہر سال 24 زبانوں کے مترجمین کو ایوارڈ کے لیے منتخب کرتی ہے۔ یہ ایوارڈ پچاس ہزار روپے نقد اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔

پریس ریلیز، مشتاق صدف، پروگرام آفیسر، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 20 دسمبر 2012

گوپی چند نارنگ، پیرزادہ قاسم کو شانِ اردو ایوارڈ

نئی دھلی: اردو اور ہندی ہی دنیا میں صرف دو ایسی

زبانیں ہیں جو ایک دوسرے سے بے حد قریب ہیں اور ان زبانوں کو بغیر کسی ترجمے کے دوسری زبان جاننے والا آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فکّی آڈی ٹوریم میں کیا اور 'جشن ادب' اور 'سرودھروہر' کے زیر اہتمام پہلے انٹرنیشنل پوئٹری فیسٹیول میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پیرزادہ قاسم اور اشوک چکردھر کی یہاں موجودگی اردو اور ہندی کو آپس میں جوڑنے کی علامت ہے۔ اسی کے ساتھ یہ ہندوستان اور پاکستان کے رشتوں کو استوار کرنے کی بھی شروعات ہے۔ اردو اگرچہ کسی صوبے کی زبان نہیں ہے لیکن یہ باد نسیم کی طرح کسی سرحد کو خاطر میں نہیں لاتی ہے۔ اسی لیے کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں اردو بولی اور سمجھی نہ جاتی ہو، اردو سیکولر اقدار، رواداری اور دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ پروفیسر نارنگ کے ہاتھوں کشور ناہید، اشوک چکردھر اور پاپولر میرٹھی کو 'شان ادب ایوارڈ' عامر قدوائی (کویت)، عدیم تاجی، خوشبیر سنگھ شاد، قیصر خالد اور جاوید صبا (پاکستان) کو جشن ادب ایوارڈ اور جیندر کردم، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر وریضہ، آلوک شریواستو اور پون دیکشت کو پرواز ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پیرزادہ قاسم کو 'شان اردو' ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ گوپی چند نارنگ کو یہ ایوارڈ اسپیشل پولس کمشنر ڈاکٹر آدتیہ آریہ کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ فیسٹیول کا آغاز معروف گلوکارہ شیش موہن اجاریہ کی غزلوں سے ہوا۔ مہمان ذی وقار میں دہلی پردیش کانگریس کے صدر اور ممبر پارلیمنٹ جے پرکاش اگروال اور دہلی پولس کے اسپیشل کمشنر ڈاکٹر آدتیہ آریہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 دسمبر 2012

مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے ایوارڈ

نئی دہلی: لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک نہیں بلکہ مولانا حسرت موہانی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزوں سے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ مطالبہ انھوں نے 1921 میں کانگریس کے سورت میں ہوئے اجلاس کے دوران کیا تھا۔ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ انگریزوں سے مکمل آزادی ہمارا نصب العین ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا محمد علی جوہر کے یوم پیدائش کے موقعے پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے زیر اہتمام منعقد 24ویں مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ تقسیم کی تقریب میں بطور مہمان خصوصی اتراکھنڈ کے گورنر عزیز قریشی

نے اپنی تقریر میں کیا۔ تقریب کی صدارت قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے اور نظامت معصوم مرادآبادی نے کی۔ صدارتی تقریر میں بانی ایم سلیم مرحوم کو یاد کرتے ہوئے کہا انھوں نے جو شجر لگایا تھا آج وہ ثمر آور ہو چکا ہے۔ سیدہ سیدین حمید نے کہا کہ بی اماں نے اس زمانے میں جو کچھ کیا وہ خواتین اور وہ بھی مسلم خواتین کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ اس موقعے پر اتراکھنڈ کے گورنر عزیز قریشی کے ہاتھوں پلاننگ کمیشن آف انڈیا کی رکن ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کو سماجی خدمات کے لیے 'بی اماں' ایوارڈ، سابق سفیر اور ممبر پارلیمنٹ م افضل کو اردو صحافت کے لیے ایم سلیم میموریل ایوارڈ، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی کو شعری و ادبی خدمات کے لیے، ریکس ریمیڈیز کے مینیجنگ ڈائریکٹر ایم شعیب اکرم کو طبی و سماجی خدمات کے لیے، دہلی یونیورسٹی کی شعبۂ فارسی کی استاد ڈاکٹر ریحانہ خاتون کو تعلیمی خدمات، ونگ کمانڈر (ریٹائرڈ) عارف اللہ خان کو دفاعی خدمات اور معروف ڈاکٹر کاشف ذکائی کو طبی خدمات کے لیے مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ اس موقعے پر مختلف شعبوں سے جڑی اہم شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 دسمبر 2012

'جشن ادب' اور 'سردھروہر' کے ایوارڈ

نئی دہلی: عالم گیر شہرت یافتہ و برصغیر کے ممتاز شاعر و ادیب کیفی اعظمی (مرحوم) ایک شاعر و ادیب ہی

نہیں بلکہ سماج کے ایک بڑے معلم تھے۔ ان خیالات کا اظہار آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے کانفرنس ہال میں پاکستان کے معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے 'کیفی اعظمی ایوارڈ' حاصل کرتے ہوئے کیا۔ انھیں یہ ایوارڈ سماجی، شعری و ادبی تنظیم 'جشن ادب' و سماجی و ثقافتی تنظیم سورودھروہر کے زیر اہتمام منعقد کی گئی۔ ایک پروقار تقریب میں معروف شاعر جاوید اختر، معروف فلم اداکارہ شبانہ اعظمی نے دیا۔ پروگرام کی صدارت اے رحمٰن ایڈووکیٹ نے کی جب کہ دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر حسین خان نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ مہمان اعزازی کے طور پر فرحت شہزاد، پاکستان کرکٹ بورڈ کے سابق چیف سلیکٹر صلاح الدین نے شرکت کی۔ اس موقعے پر آئی آئی سی کے صدر سراج الدین قریشی بھی بطور خاص موجود تھے۔ جشن ادب کی اس پہلی شعری و ادبی محفل میں جاوید اختر، شبانہ اعظمی، اے رحمٰن ایڈووکیٹ، صلاح الدین، فرحت شہزاد اور ماہر نفسیات پروفیسر خالد کو جشن ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 دسمبر 2012

انجمن تعمیر اردو اور لٹریسی فرینڈز کے ایوارڈ

نئی دہلی: انجمن تعمیر اردو اور اردو ہندی لٹریسی فرینڈز کے باہمی تعاون سے نوئیڈا کے کیلاش اسپتال میں گلزار دہلوی کی جانب سے ایک ایوارڈ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ انعامات کی تقسیم جھارکھنڈ کے سابق گورنر سید سبط رضی کے ہاتھوں ہوئی۔ انعام یافتگان میں روزنامہ 'صحافت' کے محمد انجم، انیس احمد خان، وسیم راشد فوٹو گرافر سید فدا علی، فوٹو گرافر نریندر کار، فوٹو گرافر نعیم جاوید،

فوٹوگرافر محمد اکبر، اور آلوک سریواستو کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر علیم الدین اسعدی، ڈاکٹر اشوک مدھو، ایس پی گوڑ، محمد نسیم اختر بھی موجود تھے۔ تقسیم اسناد کی تقریب کے بعد پروفیسر للن پرساد کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں گلزار دہلوی، آلوک شریواستو، عادل رشید، قیصر عزیز، ساز جہانی، حسن ضیا، کرن بہار، مدن ورما نے کلام پیش کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 23 دسمبر 2012

رسم اجرا:

بے صدا فریاد

کامٹی: جواں سال شاعر اقبال اشہر قریشی مرحوم کے شعری مجموعے 'بے صدا فریاد' کا اجرا 19 نومبر کی شب، ایم ایم ربانی ہائی اسکول و جونیر کالج کے احاطے میں ڈاکٹر وید پرکاش مشر، پرووائس چانسلر دتا میگھے، ایم ایل اے، جناب چندر شیکھر باون کلے اور چودھری جناب عبدالحق کے ہاتھوں ہوا۔ سابق ایم ایل اے، یادو راؤ جی بھویر، سابق ایم ایل سی روز نامہ اردو سماچار کے مالک و مدیر ایس کیو زماں اور نائب صدر بلدیہ شاہجہاں شفاعت تقریب میں موجود تھے۔ صدر جلسہ عالی جناب ڈاکٹر وید پرکاش مشر نے شاعری کے وسیلے سے انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر اور ڈاکٹر ارشد جمال نے اقبال اشہر قریشی کی شخصیت اور ان کے شعری وفنی محاسن کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ مجموعے کے مرتب ڈاکٹر مدحت الاختر نے کہا کہ زندگی وفا کرتی تو اقبال اشہر قریشی کا شمار اردو کے مشہور شعرا میں ہوتا۔

ڈاک کے ذریعے، محمد توحید الحق انصاری، ناگپور، دسمبر 2012

'سواری بادل کی' اور 'نیم چندن اور کویل'

بیاول: مولانا آزاد شیکشنک و بہوادیشیہ سنستھا کے زیر اہتمام ایک تقریب جناب خورشید صدیقی کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ 'اردو سیوا' کے صدر اور معروف قلمکار جناب رحیم رضا کی تصنیف 'سواری بادل کی' نیز فیض پور تعلقہ بیاول کے معروف قلمکار جناب سلیم خان کی تصنیف 'نیم چندن اور کویل' کا اجرا مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے چیئرمین جناب خورشید صدیقی کے ہاتھوں کیا گیا۔ اس موقع پر روز نامہ انقلاب کے مدیر جناب شاہد لطیف، معروف شاعر قیوم اثر رئیس فیض پوری، یامین شیخ اور عبدالرؤف سابق پرنسپل ذاکر حسین کالج بحیثیت مہمان خصوصی شریک تھے۔

پریس ریلیز، عقیل احمد شیخ، 29 دسمبر 2012

تنقید اور متبادل تنقید

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے اکیڈمک اسٹاف کالج میں 'تنقید اور متبادل تنقید' پر انگریزی کتاب کا اجرا کیا۔ یہ کتاب پروفیسر اے آر قدوائی اور ڈاکر محمد عاصم صدیقی کی ادارت میں شائع ہوئی ہے جس میں انھوں نے شعبۂ انگریزی کے تین پروفیسر پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر مسعود الحسن اور پروفیسر زاہد زیدی، جو ان کے استاد رہ چکے ہیں، کی تنقیدوں کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی شعبہ کے بائیس اساتذہ کے مضامین بھی اس کتاب میں ہیں۔ وائس چانسلر جنرل شاہ نے رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تنقید کا حصہ ہے اور تنقید اور متبادل تنقید پر ان کے بھی چند تجربات ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت پر مدیران اور قلم کاروں کو سراہا۔ رسمِ اجرا کی تقریب کے اعزازی مہمان پروفیسر ایم شمیم جے راج پوری، سابق وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے کہا کہ کسی بھی یونیورسٹی کی پہچان اس کے تحقیقی کاموں سے ہوتی ہے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 دسمبر 2012

دھوپ کا سفر

امروھہ: اردو زبان کی بقا کے لیے جتنی ضروری اردو کتب کی اشاعت ہے اتنا ہی ضروری ان کتب کا مطالعہ اور نوجوان نسل سے ان کتب کو روشناس کرانا ہے۔ مذکورہ خیالات معروف افسانہ نگار شکیل احمد جاوید کی مرتب کردہ کتاب 'دھوپ کا سفر' کی رونمائی کے موقعے پر نشا پیلس امروہہ کے کانفرنس ہال میں پروفیسر سید محمد طارق حسن شہر امام امروہہ نے کیے، اس موقعے پر علم وادب سے وابستہ اہم شخصیات کتاب کے سلسلہ میں اپنے تاثرات پیش کیے۔ اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے اس کتاب کو سال 2011 کی بہترین سوانح عمری میں شامل کرلیا گیا تھا جس کے لیے شکیل جاوید کو 10 ہزار روپے کا اعزاز بھی حاصل ہو چکا تھا۔

روز نامہ 'جدید میل' دہلی، 16 دسمبر 2012

جھوٹ

حیدرآباد: اردو گھر مغل پورہ میں حسن عسکر (صحافی) کی 9ویں تصنیف 'جھوٹ' کی رسم رونمائی سید شاہ حبیب الدین قادری ایڈیٹر ماہنامہ آندھرا پردیش محکمۂ اطلاعات کے ہاتھوں انجام پائی۔ حسن عسکر کی ادبی اور صحافتی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے مقررین نے 'جھوٹ' عنوان سے تحریر کی جانے والی کتاب کو منفرد قرار دیا۔

روز نامہ 'منصف' حیدرآباد، 27 دسمبر 2012

'فکر امروز'

کولار: الامین کیمپس کولار میں الامین ایمپلائز ایسوسی ایشن کی جانب سے ضیاء اللہ شریف کے افسانوں کے مجموعہ 'فکر امروز' جس کی حال ہی میں کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے طباعت اور رسم رونمائی سرانجام دی گئی ہے' کا ضلع کولار میں اجرا اور تہنیتی جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں پروفیسر اختر سعیدہ خانم، رضوان اللہ خان، الحاج شاہدہ یاسمین، الحاج صابر انسا، سید رقیب الرحمٰن اور دیگر اراکین نے شرکت کی۔

روز نامہ 'سیاست' بنگلور 18 دسمبر 2012

فیض کی شاعری کا کنڑ ترجمہ

بنگلور: نامور کنڑ ادیب حسن نعیم سرکوڈ نے فیض احمد فیض کی شاعری کا جو کنڑا میں 'فیض نامہ' کے نام سے ترجمہ کیا تھا اس ترجمہ کو 'چنتنا پستک' ادارہ کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اس کی رسم اجرا شہر میں 16 دسمبر کو عمل میں آئی۔ انھوں نے اپنی ترجمہ شدہ فیض نامہ کے اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ فیض احمد فیض نے اپنی شاعری میں سیاسی بدعنوانیوں اور سیاست دانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے جو قلم اٹھایا اس کی نظیر مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی ادیب فقیر محمد کاٹپاڈی تھے۔ سابق آئی اے ایس افسر و اردو ادیب ڈاکٹر چرنجیوی سنگھ نے رسم اجرا اجلاس کی صدارت کی اور اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ کرناٹک کی حکومت نے

اردو کی ترقی کی جانب خصوصی توجہ دی ہے۔ اس موقعے پر اعظم شاہد نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 19 دسمبر 2012

طنز و مزاح کے تین ستون

پونے: 'اعظم کیمپس فاؤنڈیشن ڈے تقاریب' کے موقع پر حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے، بزم اردو کے زیر اہتمام جناب رفیق جعفر کی کتاب 'طنز و مزاح کے تین ستون' کی رسم رونمائی کا انعقاد 22 ستمبر 2012 کو ہائی ٹیک ہال، اعظم کیمپس میں عمل میں آیا۔ اس کتاب میں اردو طنز و مزاح کے تین اہم مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کی ادبی خدمات خراج تحسین و خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، مدیر شگوفہ، حیدر آباد اور مہمان اعزازی جناب اسد رضا، چیف آف بیوروز، راشٹریہ سہارا دہلی نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدر محترمہ عابدہ انعامدار، نائب صدر ایم سی ای سوسائٹی، اعظم کیمپس نے صدارت کی۔

پریس ریلیز، عظمیٰ تسنیم، صدر شعبۂ اردو، عابدہ انعامدار سینئر کالج، پونے، 28 دسمبر 2012

اردو

مہاراشٹر: بین الاقوامی ادبی جریدہ سہ ماہی 'اردو' نے اپنا ایک سالہ سفر طے کرتے ہوئے اس صدی کی واحد تاریخ 12-12-12 کو سالنامہ کی رسم اجرا 'اردو' کے دفتر 'ادبستان' میں تقریبِ رونمائی واقع ہوئی۔ رسم اجرا کی صدارت عالمی اردو ادب کے مستند نقاد جناب ڈاکٹر سید صفدر نے فرمائی۔ جناب ساجد محشر مہمانِ خصوصی رہے۔ سہ ماہی اردو کے گزشتہ تمام شمارے دنیا بھر میں مقبول ہوئے ہیں۔ مضامین کا تنوع، حسنِ انتخاب جیسی خصوصیات کے پیش نظر اردو دنیا نے اسے خوب سراہا ہے۔ 'اردو' کے مدیر وسیم فرحت کارنجوی علیگ نے اپنے تعارفی خطبے میں کہا کہ "ہم نے گزشتہ تمام شماروں میں معیار کو ملحوظ رکھا ہے۔"

پریس ریلیز، محمد کلیم ضیا، اسماعیل یوسف کالج، مہاراشٹر، 18 دسمبر 2012

فلک چاند سورج..

کولکاتا: بمقام آزاد نیشنل ڈے اینڈ نائٹ اسکول، ہرشی اسٹریٹ کلکتہ 9 ایک شام م ع اسرار کے نام' کے موقعے پر شعری مجموعہ 'فلک، چاند، سورج بہائیں گے آنسو' کی رسم رونمائی اور ساحر ایوارڈ فنکشن کے علاوہ مشاعرے کا انعقاد شاندار پیمانے پر جشن عیدملن کمیٹی اور ادبی منچ کے زیر اہتمام کیا گیا۔ صدر جلسہ کے فرائض جناب انجم عظیم آبادی اور صدر مشاعرہ کے فرائض جناب حلیم صابر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتا، 17 دسمبر 2012

خوشبوئے جناں

نئی دہلی: حسن آرٹ ٹرسٹ کے زیر اہتمام ذکر محسن انسانیت کا انعقاد دہلی کے انڈیا ہیبیٹ سینٹر کے گل مہر ہال میں ہوا جس میں یو اے ای کے معروف شاعر ڈاکٹر سید احمد برنی کی تازہ تصنیف 'خوشبوئے جناں' کی رونمائی کینیڈا سے تشریف لائے معروف ادیب ڈاکٹر تقی عابدی کے ہاتھوں عمل میں لائی گئی۔ سابق وزیر داخلہ سید سبط رضی کی صدارت میں منعقد اس تقریب میں پروفیسر مشیر الحسن سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، ممبر اسمبلی حسن احمد، ایرا انڈیا کے چیئرمین ناصر علی، سید تقی عابدی وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 دسمبر 2012

فکر عقبیٰ

حیدرآباد: حج کی سعادت حاصل کرنے والے خوش نصیبوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگیوں میں تبدیلی لائے اور خرافات و بداعمالیوں سے محفوظ رہنے کی طرف خاص توجہ دیں۔ بزرگ نعت گو شاعر محمد فخر الدین راحت حیدرآبادی کے نعتیہ مجموعہ 'فکر عقبیٰ' کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے حافظ پیر شبیر احمد ایم ایل سی نے اور دیگر مقررین الحاج محمد قمر الدین، الحاج پروفیسر مجید بیدار، الحاج نواب کاظم علی خان، سید شاہ حبیب لادین قادری، ایڈیٹر ماہنامہ 'آندھرا پردیش' نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ عارف الدین احمد نے خیر مقدمی و تعارفی تقریر کرتے ہوئے 'تنظیم تحفظ اردو' کا تعارف پیش کیا اور محفل میں موجود تمام حجاج کرام کا خیر مقدم کیا اور اس جلسے کی نظامت کی۔ اس جلسے کے مہمان خصوصی سید مسکین احمد تھے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 25 دسمبر 2012

وفیات:

پروفیسر حنیف نقوی

بدایوں: عصر حاضر کے معروف محقق اردو غالب شناس پروفیسر حنیف احمد نقوی نے 22 دسمبر کی شام کو اپنے وطن سہسوان، ضلع بدایوں میں 76 سال کی عمر میں سفر آخرت اختیار کیا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم وطن میں ہی حاصل کی۔ 1959 میں وکرم یونیورسٹی اجین سے بی اے میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن اور ایم اے اردو 1961 میں وہیں سے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے کامیابی حاصل کی۔ ایم اے (فارسی) بنارس ہندو یونیورسٹی میں ملازمت کے بعد 1973 میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا تھا۔ پروفیسر نقوی نے پروفیسر ابو محمد سحر کی زیر نگرانی 'اردو شعرا کے تذکروں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ' کے موضوع پر معرکۃ الآرا تحقیقی مقالہ لکھ کر اردو میں وکرم یونیورسٹی سے 1968 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے پس ماندگان میں شریک حیات کے علاوہ ایک بیٹا اور 5 بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر سید حسن عباس نے ان کے انتقال کو اردو تحقیق کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان بتاتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ پروفیسر حنیف نقوی کی وفات سے اردو تحقیق کا کوہِ گراں زمیں بوس ہوگیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 دسمبر 2012

پروفیسر محمد امین

نئی دہلی: جامعہ ہمدرد کے سابق وائس چانسلر اور معروف مورخ پروفیسر محمد امین کا گزشتہ روز انتقال ہوگیا۔ وہ 84 سال کے تھے۔ برین ہیمبریج کے سبب انھیں گنگا رام اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی تدفین قبرستان مہندیان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ پدم بھوشن پروفیسر محمد امین کی پیدائش الہ آباد کے مئو آئمہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم الہ آباد میں ہی حاصل کی۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کے مشہور سینٹ اسٹیفن کالج میں بطور لیکچرار سے منسلک ہوگئے اور 1949 سے 1993 تک تاریخ

پڑھائی۔ انھیں وزارت خارجہ کی جانب سے تاشقند میں کلچرل سفیر کے طور پر بھی بھیجا گیا تھا۔ ان کے بیٹے پروفیسر شاہد امین دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں جب کہ بیٹی غزالہ امین معروف ٹی وی نیوز ریڈر ہونے کے ساتھ ساتھ پروفیسر بھی ہیں۔ پروفیسر محمد امین کے انتقال پر بڑی تعداد میں لوگوں نے تعزیت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 دسمبر 2012

سالک لکھنوی

کولکاتا: ممتاز ترقی پسند اردو شاعر، محقق، ادیب اور روزنامہ آبشار کے مدیر سالک لکھنوی کا 4 جنوری کو بعد نماز جمعہ انتقال ہوگیا۔ وہ 100 برس سے زیادہ عمر کے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ ٹیپو سلطان کی مسجد میں نماز جنازہ کے بعد سولہ آنہ قبرستان میں بعد نماز عشا تدفین عمل میں آئی۔ سالک لکھنوی کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی کلکتہ، لکھنؤ اور دہلی سمیت تمام ادبی اور تہذیبی حلقوں میں غم کے بادل چھا گئے۔ مرحوم کوئی دس کتابوں کے خالق تھے۔ ان کی تنقیدی تخلیق 'پس شعر' کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ انھوں نے مغربی بنگال میں اردو نثر کی تاریخ بھی مرتب کی تھی۔ ان کی 100 ویں سالگرہ پر روزنامہ آبشار کی خصوصی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ اردو دنیا کے دسمبر 2012 کے شمارے میں ان کا انٹرویو بھی شائع ہوا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جنوری 2012

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

کراچی: انجمن ترقی پسند مصنّفین پاکستان کے صدر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا 9 جنوری 2013 کو بدھ کے روز کراچی میں انتقال ہوگیا۔ وہ 78 برس کے تھے اور کچھ عرصے سے علیل تھے۔ ڈاکٹر صدیقی کو گزشتہ مارچ 2012 میں انجمن ترقی پسند مصنّفین پاکستان کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ بزنس اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے ریکٹر اور قائد اعظم اکادمی کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ ہمدرد یونیورسٹی میں سوشل سائنس شعبہ کے ڈین کے عہدے پر بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر صدیقی 15 کتابوں کے مصنف تھے اور ڈان، انڈس ٹائم مارننگ نیوز، بزنس ریکارڈ حریت جیسے اخبار و جریدوں کے علاوہ اوراق، جام نور، افکار، فنون ادبی رسائل میں مسلسل لکھتے رہے اور 5 دہائیوں تک ڈان میں ان کا کالم جاری رہا۔ ادب میں تخلیق، تحقیق اور تنقید تینوں سمتوں میں ڈاکٹر محمد علی کی خدمات قابل قدر ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی 7 مارچ 1938 کو یوپی کے امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جنوری 2013

مبارک علی نسیم جھانسوی

ممبئی: اردو کے سینئر اور ممتاز عالم، صاحب فن شاعر 83 سالہ سید مبارک علی نسیم جھانسوی کا 8 جنوری کو صبح کلیان میں انتقال ہوگیا۔ سید مبارک علی نسیم جھانسوی بندیل کھنڈ (یوپی) کے ایک قصبے کونچ (ضلع جالون جو جھانسی سے قریب ہے) میں یکم اپریل 1930 کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ نواحِ ممبئی کے ایک مشہور ٹاؤن کلیان میں مدت سے مقیم تھے اور ریلوے کی ملازمت سے کئی برس قبل سبکدوش ہو چکے تھے اور پھر علمی و فنی کاموں میں منہمک رہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ 'منزل بہ منزل' گزشتہ برس منظر عام پر آیا تھا۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 9 جنوری 2012

خراجِ عقیدت:

پروفیسر حنیف نقوی

نئی دہلی: پروفیسر حنیف نقوی کی وفات پر اردو گھر میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی۔ انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے انتقال کو اردو تحقیق کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور کہا کہ مرحوم نے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر خلیق انجم اور تعزیتی نشست کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے حنیف نقوی جیسے معتبر نقاد کی موت اور تحقیق کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 دسمبر 2012

(2)

پٹنہ: محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، رشید حسن خاں اور ڈاکٹر نذیر احمد کے بعد اردو تحقیق کا سب سے بڑا مینار منہدم ہوگیا۔ حنیف نقوی ہمارے بیچ باقیات الصالحات کا درجہ رکھتے تھے۔ پروفیسر حنیف نقوی کی وفات کے سلسلے سے منعقد تعزیتی نشست میں کالج آف کامرس کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر صفدر امام قادری نے مذکورہ باتیں کہیں۔ فوری طور پر تعزیتی پروگرام دیتے ہوئے ممتاز شاعر اور رسالہ آمد کے مدیر خورشید اکبر نے حنیف نقوی کے سانحۂ ارتحال کو اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان بتایا۔ پروفیسر ظفر کمالی نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا کہ ہماری بستی اہلِ علم سے خالی ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ قاموسی علم رکھنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر واحد نظیر نے بتایا کہ اردو کے اساتذہ میں تقریباً وہ آخری محقق تھے جنھیں اردو کے ساتھ فارسی زبان پر بھی یکساں قدرت تھی۔ تمام شرکا نے ملک کی اردو اکادمیوں سے یہ گزارش کی کہ پروفیسر حنیف نقوی کی خدمات پر قومی یا بین الاقوامی سیمینار ہونا چاہیے اور ان کے متفرق مضامین کو جلد در جلد شائع کیا جانا چاہیے تاکہ نئی نسل ان کی علمی شخصیت سے واقف ہو سکے۔

پریس ریلیز، صفدر امام قادری، پٹنہ، 26 دسمبر 2012

(3)

وارانسی: اردو کے ممتاز محقق، ادیب اور سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر حنیف احمد نقوی کے گزشتہ دنوں اچانک انتقال پر سماجی و فلاحی تنظیم 'سلطان کلب' کی جانب سے ایک تعزیتی میٹنگ رسول پورہ واقع کلب کے دفتر میں بدھ کو منعقد ہوئی۔ میٹنگ میں مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ میٹنگ میں تمام شرکا نے پروفیسر حنیف نقوی کی ناگہانی موت کو اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ اردو اور فارسی کے عظیم شاعر اور عالم تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 دسمبر 2012

زہرہ جمال

بھوپال: زہرہ جمال نے اپنے قلم سے جہالت کے اندھیروں سے معاشرے کو روشنی دینے کی طرف جو قدم بڑھایا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار سلیم قریشی، چیئرمین، مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اردو کی معروف افسانہ نگار اور شاعرہ زہرہ جمال کے انتقال پر منعقد تعزیتی نشست میں کیا۔ اس موقعے پر جعفر بیگ، وائس چیئرمین، اردو اکادمی نے کہا کہ زہرہ جمال ایک پختہ اور باشعور افسانہ نگار تھیں۔ جنھوں نے اپنے قلم کے جوہر سے افسانوی ادب میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ اس موقعے پر محمد انیس انصاری نے کہا کہ زہرہ جمال نے افسانوی ادب میں بھوپال کی تہذیب و تمدن کو بروئے کار لاتے ہوئے گھر کی چہار دیواری کے اندر کے سلگتے مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کی اور نوجوان نسل کی بے راہ روی اور ترقی پسندانہ خیال کی مذمت کر ان کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی۔ آخر میں اکادمی کے اسٹاف نے دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 19 دسمبر 2012

□